مقالاتِ مفکرِ اسلام

﴿حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی﴾

(جلد دوم)

مرتب

محمد کاظم ندوی

ملنے کا پتہ

مکتبہ ایوب کاکوری۔ لکھنؤ

۲۲۷۱۰۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ستمبر ۲۰۰۱ء﴾

نام کتاب ———— مقالاتِ مفکر اسلام دوم

کمپیوٹر کمپوزنگ ———— مسرور احمد ندوی

طباعت ———— شاذیہ آفسیٹ لکھنؤ

قیمت ———— Rs

باہتمام

محمد عاصم ایوبی

ملنے کے دیگر پتے

☆ مکتبہ ندویہ دارلعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆ مکتبہ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ حرمین کچہری روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ

☆ دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

☆ دارالاشاعت اسلامیہ مولانا شوکت علی روڈ کلکتہ

☆ مکتبہ البدر کاکوری لکھنؤ

☆ مکتبہ نعیمیہ دیوبند ضلع سہارن پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ مضامین

مضامین	صفحات

گناہ رحمتِ حق کے لئے بہانہ تھا

عجب سُرور کے دن تھے عجب زمانا تھا ☆ لبوں پہ "اَنت حبیبی" کا جب ترانا تھا
وہ جس پہ گوش بَر آواز اک زمانا تھا ☆ ہمارا دَرد میں ڈوبا ہوا فسانا تھا
وہیں سے ہو کے فِدا سوئے خلد جانا تھا ☆ حمید تجھ کو مدینے سے پھر نہ آنا تھا
رہِ حبیبِ خدا، اور سر اٹھائے ہوئے ☆ قدم قدم پہ مجھے سجدہ کرتے جانا تھا
وہ وقت صبح، وہ ٹھنڈی ہوا، وہ عالمِ شوق ☆ میں سر بسجدہ تھا، اور قافلہ روانا تھا
وفورِ بے خودیِ شوق میں رہا نہ خیال ☆ کہ سجدہ گاہِ ادب کس کا آستانہ تھا
بہت بعید مرے نفس نے مجھے رکھا ☆ بہت قریب حرم کے مرا ٹھکانا تھا
یہ اضطرابِ حضوری سُن اے دلِ بیتاب ☆ بہت ادب سے تجھے حالِ دل سنانا تھا
گناہگاروں پہ بخشش سے کھل گیا یہ راز ☆ گناہ رحمتِ حق کے لئے بہانا تھا
درِ حبیبؐ پہ دل تھا کچھ اس طرح سے غنی ☆ کہ جیسے قبضے میں کونین کا خزانا تھا
یہ کیا کیا، جو گزرنا تھی، وہ گزر جاتی ☆ سرِ نیاز نہ اُس در سے پھر اٹھانا تھا
ذرا تو اور رُکے ہوتے قافلے والو! ☆ کسی غریب کے دل کو نہ یوں دکھانا تھا

حمیدؔ پیشِ نظر تھا مدینۂ محبوبؐ
نہ خواب کا تھا وہ عالم نہ وہ فسانا تھا

﴿نتیجہ فکر........زائرِ حرم حمیدؔ صدیقی﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

اس خدائے بزرگ وبالاتر کا شکر گزار ہوں جس نے اس عاجز بندہ پر اپنی رحمتوں ، برکتوں اور نعمتوں کے دہانے کھول رکھے ہیں اور صلوٰۃ وسلام نازل ہو اس مقدس رسول محمد عربی ﷺ پر جن پر تاریخ آدم نازاں ہے، اور جس کے بارے میں قرآن ناطق ہے، وما ارسلنٰك إلا رحمة للعالمين ،اور جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ صدیقہ عفیفہ طاہرہ کی شہادت موجود ہے،" کان خلقه القرآن" اور جس کے بارے میں متعدد اصحابؓ نبی کے تأثرات مختلف الفاظ میں موجود ہیں۔

☆ "مولانا **علیؒ میاں اکاڈمی**" ایک تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی ادارہ ہے، جس کے قیام کا مقصد ہی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی کے افکار وخیالات، خطبات ومقالات اور پیام وپیغام کو یکجا کر کے شائع کرنا ہے، تاکہ مفکر اسلام کا پیغام اور پیام عام ہو سکے، اور آپ کے افکار وخیالات، اور خطبات مقالات کی تشہیر ہو سکے۔

☆ "مولانا **علیؒ میاں اکاڈمی**" کے قیام وتاسیس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس ادارہ سے ہندو بیرونِ ہند کے مقتدر مصنفین، مؤلفین اور مترجمین کی کتابوں کی اشاعت ہو۔

☆ "مولانا علیؒ میا ں اکاڈمی" نے اپنے مقاصد کے پیشِ نظر اپنی مطبوعات کی اشاعت کا آغاز "**مقالاتِ مفکرِؒ اسلام**" جلد اول سے کیا تھا، اب اس وقت "**مقالات**" ہی کی جلد دوم احباب کی خدمت سامی میں اس توقع اور امید پر پیش کی جارہی ہے کہ احباب اس جلد (دوم) کو بھی وقعت کی نگاہوں سے دیکھیں گے، اور اس جلد کے متعلق بھی اپنی آراء سے ادارہ کے خدام کو مطلع فرماکر ممنون کریں گے۔

☆ "مولانا علیؒ میا ں اکاڈمی" کے بانی مولانا محمد کاظم صاحب ندوی زَادَهُمُ الله عَزاًوَشَرفاً اپنے سرپرستوں اور مربیوں کی نگرانی میں درس وتدریس کے انہماک کے ساتھ ساتھ اپنے امکان بھر تصنیف وتالیف اور نشرواشاعت کے کاموں میں تن، من، دھن کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، اللہ رب العزت ان کی اس سعی اور جدوجہد کو قبول فرماکر ان کو اس کا صلہ دارین میں عطا کرے۔

اخیر میں قارئین سے درخواست ہے کہ "مولانا علیؒ میاں اکاڈمی" کی مطبوعات کا خود بھی مطالعہ کریں، اور احباب کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔ تاکہ "الدال إلى الخير كفاعله" کے مصداق ہوں۔ اسی طرح اس ادارہ کی مطبوعات کا تعارف بھی کرائیں، یہ بھی دعوت وتبلیغ کا ایک اہم حصہ ہے، ان سب کاموں کے کرتے وقت "إن أجري إلاّ على الله" کا نکتہ ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہے۔ اور بس!

مورخہ

۳۱/ اگست ۲۰۰۱ء

والسلام

محمد عاصم ایوبی

منیجر

مولانا **علی میاں اکاڈمی۔ کاکوری لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف

اللہ رب العزت کے بارانِ فضل و کرم اور اس کے بے پایاں انعامات واحسانات نے اس ناچیز قلمکار کو "**مقالاتِ مفکرِ اسلام**" حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی جلد ناظرین، قارئین اور علم دوست احباب کی خدمت عالی میں پیش کرنے کی سعادت اور توفیق عطا کی۔۔۔ جس کے نتیجہ میں علم وادب کا یہ ادنیٰ خوشہ چیں "**مقالات مفکر اسلام**" کی جلد اول لیکر بزم احباب میں حاضر ہوا تھا، ورنہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح تیری مہربانی

"**مقالاتِ مفکرؒ اسلام**" جلد اول کی اشاعت پر احباب، علم دوست ساتھیوں نے پذیرائی کے جو خطوط ارسال کئے، ان سے مؤلف کی ہمت افزائی ہوئی۔ اور اسکو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ نیز مزید جلدوں کی اشاعت کے لئے احباب کے تقاضوں اور اصرار نے مولف کو کام کرنے کا جذبہ عطا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ناچیز مرتب نے "**مقالات**" کا دوسرا حصہ مرتب کر کے زیور طبع

سے آراستہ و پیراستہ کرایا۔ اور افادہ واستفادہ کی غرض سے احباب اور قدردانوں کی خدمت سامی میں پیش کیا ہے، تاکہ ایک طرف مرتب کے کئے ہوئے وعدوں کی تکمیل ہو سکے تو دوسری طرف احباب اور رفقاء کے تقاضوں اور ان کے حکموں کی تعمیل بھی۔

خدا کرے "**مقالات مفکرِ اسلام**" "جلد اول" کی طرح "جلد دوم" بھی اپنی معیاری طباعت اور حسن ترتیب کے پیش نظر قارئین کے لئے ایک بے بہا سوغات اور بے مثال تحفہ ثابت ہو۔ جہاں تک اس جلد کے مضامین ومقالات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ وہ تو ایسی دلکش، دلربا، جادوبیان، سحرانگیز اور پُر از مواد تحریریں ہیں، جو "اپنی مثال آپ" ہیں۔

امید کہ "**مقالات**" کی یہ دوسری جلد احباب کو پسند آئے گی۔ اگر ایسا ہی ہوا جس کی مرتب کو امید ہے تو یہ ناچیز مرتب یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا، کہ اسکی محنت اور تگ ودَو ضائع نہیں ہوئی، بلکہ سُگارت ہوگئی۔ اور "**حق بحقدار رسید**" کے مطابق ہی فیصلہ اور عمل ہوا۔

اخیر میں قارئین اور اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی مخصوص دعاؤں میں حضرت مفکرِ اسلام اور اس ناچیز مرتب کو یاد کرتے رہیں۔ اور بس!

طالب دعاء

محمد کاظم ندوی

خادم تدریس دار العلوم فاروقیہ، کاکوری لکھنؤ

مورخہ

۳۱ / ۸ / سنہ ۲۰۰۱ء

سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

بیسویں صدی کی دنیا کے نام

یہ مقالہ مجلس سیرتِ پشاور کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۴۴ء میں پڑھنے کے لئے اس کے سکریٹری حاجی عبد الرشید ارشد صاحب کی دعوت پر لکھا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

بیسویں صدی کی دنیا کے نام

جب ہمارے سامنے جاہلیت کا نام آتا ہے تو بے اختیار ہماری آنکھوں کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کا وہ تاریک زمانہ تصویر کی طرح پھر جاتا ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور جس میں آپ کی ہدایت اور تعلیم کا سب سے پہلا اور سب سے نمایاں معجزہ ظاہر ہوا، جاہلیت کا لفظ سنتے ہی دفعۃً عرب قوم اپنی ان تمام جاہلی خصوصیات واخلاق کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے جن کا مرقع ہمارے سیرت نگاروں نے پیش کیا ہے۔

لیکن جاہلیت اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ دور زمانۂ جاہلیت ہے جو وحی و نبوت کی رہنمائی سے محروم ہوا اور انبیاء علیہم السلام کی روشنی وہاں تک پہنچی ہی نہ ہو یا پہونچی ہو لیکن اسنے اپنی آنکھیں اسکی طرف سے بند کرلی ہوں، خواہ وہ چھٹی صدی عیسوی کی عالمگیر جاہلیت ہو یا یورپ کی تاریخ کی وہ تاریک متوسط صدیاں جو عموماً قرون مظلمہ (DARK-AGES) کے نام سے یاد کی جاتی ہے یا وہ بیسویں صدی کا روشن و تابناک عہد

تہذیب وترقی جس سے ہم گزر رہے ہیں۔

قرآن مجید ہم کو بتلاتا ہے کہ دنیا میں روشنی صرف ایک ہی ہے، اوراس کا سر چشمہ بھی ایک ہی ہے "الله نور السموات والارض" البتہ تاریکیاں بے شمار ہیں، انکا حدو حساب نہیں اگر خدا کی روشنی کا (جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتی ہے) اجالانہ ہو تو دنیا کی ظلمتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں، زندگی کی ہر منزل اور اسکے ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَّغْشَاهُ مَوجٌ مِن فَوقِهٖ مَوجٌ مِن فَوقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوقَ بَعْضٍ . إِذَاأَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوراً فَمَالَهٗ مِنْ نُورٍ. (سوره النور. ۴۰.) جیسے گہرے دریا میں اندھیری چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر پھر اس پر ایک اور لہر اسکے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو خود اپنا ہاتھ نہ دیکھنے پائے۔ اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اسکے واسطہ کہیں روشنی نہیں۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں نور اور ظلمت کا ایک ساتھ تذکرہ آیا ہے نور کو صیغہ واحد کے ساتھ اور ظلمت کو جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلمتیں متعدد ہوسکتی ہیں لیکن نور ایک ہی ہوگا۔ اسی قدرتی روشنی کی اگر چمک نہ ہو تو پھر کسی مصنوعی روشنی سے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اجالا نہیں کیا جاسکتا، پھر یہ روشن اور جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع اور تاریک قبر ہے جس میں روشنی کا کوئی منفذ نہیں اور جہاں ؎

شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

اَوَمَنْ كَانَ مَيتاً فَأَحْيَينَاهُ وَجَعلنالَهٗ نُوراًيَمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ

فِی الظُّلُمَاتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ (سورہ انعام ۱۲۳.) بھلاوہ جو مردہ تھا ہم نے اسکو زندہ کردیا اور ہم نے اسکو روشنی دی کہ اسکے سہارے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اسکے برابر ہو سکتا ہے جسکا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہوا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی اس سرزمین تک (جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ ڈوبتا ہے) نبوت کی روشنی بہت کم پہنچنے پائی، یہاں اس آسمانی روشنی کی خانہ پری ہمیشہ انسانی روشنی سے کرنے کی کوشش کی گئی، یونان اور روما کا عہد زریں انسانی علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے بلاشبہ تاریخ کا درخشاں عہد ہے، لیکن نبوت کی تعلیمات وہدایت کے لحاظ سے اتنا ہی بے نور ہے جتنا تاریک سے تاریک دور جہالت ہو سکتا ہے، یہاں خدا کی ذات وصفات کے بارے میں بلا کسی روشنی اور رہنمائی کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے "مالھم بہ من علم اِن ھم الا یخرصون" (انکو اسکا ذرا بھی علم نہیں وہ محض اٹکل اور قیاس سے کام لیتے ہیں) الٰہیات وفلسفہ کا وہ طلسم جو ان ملکوں کے حکماء وفلاسفہ نے ترتیب دیا ہے، اپنے خیال آرائی، اعجوبہ زائی کے لحاظ سے مشرق کا طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب سے کم نہیں، سقراط وافلاطون (نہ کہ ارسطو) کے اقوال اور رواقی فلاسفہ کی اخلاقی تعلیم میں انبیاء کی تعلیمات کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں ضرور اس طرح نظر آجاتی ہے، جیسے برسات کی اندھیری رات میں کرمک شب تاب (جگنو) کی چمک، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کی کچھ باتیں انکے کان میں کبھی پڑی تھیں، لیکن یہ روشنی اتنی تیز اور دیرپا نہیں کہ اسکے سہارے اپنا سفر طے کرلیں "کُلَّمَا اَضَاءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا"

(جب (بجلی) چمکتی ہے تو اسکی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں)۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا چراغ ہدایت مشرق میں دوصدی تک باد مخالف کے جھونکوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن مغرب میں قدردانوں کے دامن تلے بجھ کر رہ گیا، یعنی حضرت مسیح کی تعلیمات نے مغرب میں جاکر اپنی اصلیت کھودی، جہاں مسیحیت کو پہلی مرتبہ طاقت و حکومت حاصل ہوئی، شرک وبت پرستی کا دھارا مسیحیت کے بیچ دریا میں بہنے لگا، شاید دنیا کے کسی مذہب کے لئے کوئی نو مذہب اتنا نامبارک ثابت ہوا ہو جتنا مسیحیت کے لئے شہنشاہ قسطنطین اور سینٹ پال، مسیحیت کے اس الہامی چراغ کے گل ہو جانے کے بعد ارباب کلیسا نے مذہبی مجلسیں سجاکر اور ان میں کافوری شمعیں جلا جلاکر صدیوں خوش اعتقاد مسیحی دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی لائی ہوئی روشنی ان کے پاس موجود ہے لیکن یہ روشنی درحقیقت صدیوں پہلے تاریکیوں میں گم ہو چکی تھی۔

كَمَثَلِ الَّذِيْ اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ.

ترجمہ: اس کی طرح جس نے آگ روشن کی جب اس آگ سے اس کا گردو پیش روشن ہو گیا تو اللہ نے ان کی روشنی اٹھالی اور ان کو تاریکیوں میں اس طرح چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔

ان سب کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف واجب ہے کہ مسیحیت کی بدولت مغرب میں خدا کا اعتقاد اور آخرت کا خیال پایا جاتا تھا، حقیقت میں آسمانی

مذہب کتنا ہی بدل جائے خدا اور آخرت کا خیال رگ وریشہ میں اس طرح جاری و ساری ہوتا ہے کہ کبھی اس سے نکل نہیں سکتا، پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں عقلیت مگر دراصل مادہ پرستی اور حواس پرستی کی جو تحریک پیدا ہوئی اس نے مغرب کو کھلے طریقہ پر مادہ پرستی کے راستہ پر لگادیا، رفتہ رفتہ یورپ ایسا مادہ پرست ہو گیا کہ اس کی زندگی اور اس کے ذہنی نظام میں خدا اور آخرت کی گنجائش باقی نہیں رہی، سارے یورپ نے اپنی زبان سے خدا و آخرت کا انکار بالاعلان نہیں کیا، لیکن اس کی زندگی اس طرح کی ڈھل گئی کہ گویا نہ خدا ہے نہ آخرت، آج یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا مذہب مسیحیت نہیں بلکہ مادیت ہے، یورپ عرصۂ دراز تک بت پرست رہا ہے، اور عرصہ دراز سے مسیحیت کا مدعی ہے لیکن اس اخلاص اور جوش کے ساتھ اس نے اپنی ایسی گرویدگی اور شیفتگی کا اظہار کیا اور اس کی ایسی شدید پابندی کی جیسی مادیت کے اس مذہب کے ساتھ اس سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اس نئے مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں (کارخانے، صنعتی و تجارتی مراکز اور تفریح گاہیں) شب و روز معمور ہیں، اس مذہب کے پروہت (ملک التجار سرمایہ دار، صناع) بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بلکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے، اس کے بالمقابل عیسائیت مغرب میں سایہ بن کر رہ گئی ہے۔

مغرب میں اس خود فراموشی کے وہ سب نتائج ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، جو اس ذہنیت اور سیرت کا لازمی نتیجہ ہیں، ایک نتیجہ یہ ہے کہ مغربی انسان نے ایک خدا کا دامن چھوڑ کر دوسرے سیکڑوں خداؤں کا دامن پکڑ لیا ہے، ایک حقیقی آستانہ سے سر اٹھا کر جہاں سر جھکا کر وہ تمام آستانوں سے بے

نیاز ہو سکتا تھا ہر سنگ آستاں پر وہ اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے، ایک خدا کو چھوڑ دینے کی سزا خدا کی طرف سے ہمیشہ یہی ملی ہے، یہ "اربابٌ مِنْ دونِ الله" بڑی تعداد میں مغرب پر مسلط ہیں اور ساری مغربی دنیا ان کے پنجہ غضب میں گرفتار ہے، یہ کہیں سیاسی سردار ہیں، کہیں اقتصادی دیوتا، کہیں اپنے تراشے ہوئے معیار زندگی، کہیں خود تجویز کئے ہوئے فرائض ولوازم زندگی، جنھوں نے اپنے پرستاروں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے اور ان سے ایسی بندگی کرا رہے ہیں، جس کے سامنے خدا کی بندگی کی ہزار بار قدر آنی چاہیئے، ایسی مشقت لے رہے ہیں جو بے زبان جانوروں اور بے جان مشینوں سے نہیں لی جاتی، ایسی قربانیاں کرا رہے ہیں، جو آج تک کسی دیوتا کے نام پر نہیں کی گئیں، ان "ارباب من دون الله" کے مقاصد و خواہشات میں سخت تصادم و کشمکش ہے، ان کے متضاد مقاصد کی خاطر سارا عالم زیر و زبر ہو رہا ہے، ان بتانِ نو میں خاکِ وطن کا بھی ایک بڑا بت ہے جو ہمیشہ خون کی نذر اور انسانی جانوں کی بھینٹ چاہتا رہتا ہے، انھیں میں ایک بت پیٹ ہے جس کی بندگی میں بیسویں صدی کا انسان رات دن لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے راضی نہیں، کچھ مدت ہوئی سر آلیور لاج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:۔

"زندگی کی سادگی اب خواب و خیال ہو گئی، اب نہ کوئی مقصد سامنے ہے نہ اونچا تخیل، ہر شخص رات دن بیل کی طرح اپنے کارخانہ یا دفتر کی غلامی میں لگا ہوا ہے، تیز رفتار سواریوں کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت ہر شخص کے پیر پر گویا سنیچر سوار رہتا ہے۔"

خدا فراموشی کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود فراموش ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ. (حشر. ۱۹)

ترجمہ: ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو خدا فراموش ہو گئے تو خدا نے ان کو خود فراموش بنا دیا۔

بیسویں صدی کا انسان خود فراموشی کا مکمل نمونہ ہے، اس نے اپنی حقیقت، اپنا انسانی امتیاز، اپنا مقصد زندگی اور اپنی پیدائش کی غرض بالکل بھلا دی اور بالکل بہیمانہ یا جماداتی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے، وہ ایک ایسی روپیہ ڈھالنے والی مشین بن گیا ہے، جو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی، حد یہ ہے کہ جسمانی راحت اور قلبی سکون و اطمنان جو اس جد جہد کی کسی معنی میں قیمت ہو سکتا ہے، نہ اس کو اپنی زندگی میں میسر ہے، اور نہ اس کو اس کا ہوش باقی رہا ہے، پروفیسر جوڈ نے صحیح لکھا ہے:۔

> "جہاں تک ہمارے زمانہ کی سوسائٹی کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے، سرعت کا، سرعت زمانہ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانہ پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔" (۱)

اس عالم خود فراموشی اور مدہوشی میں انسان کا موضوع ہی بدل گیا ہے، اس نے اپنے دائرہ ترقی کو چھوڑ کر ترقی کے دوسرے دائروں میں بڑی ترقی

(1) GUIDE TO MODERN WICKEDNESS

کرلی ہے، لیکن کامل انسان کی حیثیت سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ روز بروز اس کے انسانی خواص میں تنزل ہو رہا ہے، موجودہ ترقیات کا تجزیہ کیجئے کچھ درندوں کے کمالات نکلیں گے، کچھ پرندوں کے اور کچھ مچھلیوں کے، ایک مغربی مصنف نے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے، ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سنا کرتے ہیں، بچے ٹیلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، برقی تصویریں آنے لگیں، بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں، ربڑ کی سڑکیں بنتی ہیں، ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندرونی حصہ کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں، تصویریں بولتی اور گاتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے، برقی موجوں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے، بحری جہاز قطب شمالی تک اور ہوائی

جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں، اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (PENDINE SANDS) پر تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے رکارڈ قائم کیا تھا، یا کسی ہواباز نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں بیس گھنٹہ یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی، جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا" (۲)

اس عالمِ خود فراموشی میں مغرب سے خدا فراموشی کا شکوہ ہی فضول ہے، وہ تو اقبال کے اس شعر کا صحیح مخاطب ہے ؎

زخود گریختی، آشنا چہ می جوئی
بہ آدمی نہ رسیدی، خدا چہ می جوئی

اب مغرب کی آخرت فراموشی کو لیجئے، انکار آخرت کا پہلا اور طبعی اثر

(2) GUIDE TO MODERN WICKEDNESS

یہ کہ دنیاوی زندگی اور دنیا کی چیزوں سے لذت و تمتع کا ایک جنون اور بحران پیدا ہو گیا ہے، تمتع ہی مقصدِ حیات قرار پا گیا ہے، آج مغرب کے ہر گوشہ سے صدائے نائے و نوش اور نعرہ "**بعیش کوش**" بلند ہو رہا ہے، اور اس کی ساری زندگی اس کے اور اس کے ذرائع کے حصول کی مسابقت میں صرف ہو رہی ہے، مسابقت نے زندگی کو ایک ایسا ریس کا میدان بنا دیا ہے۔ جس کا کوئی منتہا نہیں، زندگی کی ایک نہ بجھنے والی پیاس اور ایک نہ مٹنے والی بھوک ہے، ہر شخص کی زبان پر "**ھل من مزید**" کی صدا ہے، زندگی کی ضروریات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، نفس کے مطالبات کی تکمیل کا سامان اور اس میں تنوع روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اور اس نے صدہا اجتماعی دشواریاں اور مشکلات پیدا کر دی ہیں، تاجرانہ رقابت اور مقابلہ نے اس میں امدادی معیارِ زندگی روز بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ہر شخص جب نظر اٹھاتا ہے، منزلِ مقصود دور اور بامِ مقصود بلند نظر آتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے حصول کی تمنا اور کوشش میں بے کیف اور بے لطف ہو جاتی ہے اور وہ حرص و طمع کے ایک مسلسل عذاب اور زندگی کی لامتناہی جدوجہد میں مبتلا رہتا ہے، صبر و قناعت جو سکون و اطمنانِ قلب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یورپ میں عرصہ سے ناپید ہے،

انکار آخرت یا آخرت کو فراموش کر دینے کے بعد لذت و تمتع کا یہ جذبہ جس کو ہم مسلمان دیوانگی سمجھتے ہیں منکر آخرت کے نقطۂ نظر سے عین فرزانگی ہے، جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے تصور سے خالی ہو وہ اس زندگی میں لطف اٹھانے اور جگر کی آگ بجھانے میں کیوں کمی کرے اور عیش و

لطف کو کس دن کے لئے اٹھار کھے اس لئے قرآن کہتا ہے :۔
وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَ يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ. ترجمہ :کافر لطف اندوز ہوتے ہیں اور چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے :۔
ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَ يَتَمَتَّعُوا وَ يُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (سورۃالحجر ۳) انھیں انکے حال پر چھوڑ دو کھائیں پیئیں عیش و آرام کریں، امید پر پھولے ہیں وہ وقت دور نہیں کہ انھیں معلوم ہو جائے گا۔

انکار آخرت کا دوسرا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی چیزیں، اس میں کام آنے والے اعمال زیادہ آراستہ زیادہ معقول اور زیادہ مدلل نظر آتے ہیں، مادی ذہنیت اور سطحی نگاہ پیدا ہو جاتی ہے جو حقائق تک نہیں پہونچ سکتی۔
إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (سورۃ النمل ۴) بے شک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کے لئے خوش نما بنا دیئے ہیں پس وہ بھٹک رہے ہیں۔
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً، الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً، أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً. (سورۃ الکہف ۱۰۳۔۱۰۵) کہو ہم تمہیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں، وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکہ میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ

اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے ، اور اس لئے قیامت کے دن ان کا ہم کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں حقیقت و سنجیدگی کا حصہ کم اور لہب ولعب کا حصہ زیادہ ہوتا جارہا ہے ، زندگی کے ایک بڑے حصہ کو تفریحات اور سرور ونشاط کے اعمال و مشاغل گھیرے ہوئے ہیں بڑے بڑے نازک وقتوں اور خطرات میں بھی ان کے اس تفریحی انہماک اور لطف اندوزی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِباً وَّ لَهْواً وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (سورۃ الانعام. ۷۰) چھوڑدو ان کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا رکھا ہے ، اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے یہ حوادث وواقعات کے حقیقی اسباب وعلل پر ان کی نظر نہیں جانے پاتی بلکہ چند ظاہری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے ، وہ معاملات کی گہرائی تک نہیں اتر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہایت نازک وقت میں بھی ان کے تفریحی انہماک اور غفلت میں کمی نہیں ہوتی وہ ان واقعات کی کوئی تاویل کر لیتے ہیں ، اور ان کی کوئی فرضی اور حقیقی وجہ تلاش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں ، اور ان کے رویہ میں کوئی انقلابی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں مادہ پرست اور ظاہر بیں قوموں کی نفسیاتی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے :۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْ نٰا هُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ

یَتَضَرَّعُونَ ، فَلَو لَا اِذجَاءَ ھُم بَأ سُنا تَضَرَّعُوا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوبُھُمْ وَ زَیَّنَ لَھُم الشَّیطَانُ مَاکَانُوا یَعمَلُونَ (سورۃ الأنعام ۴۲۔۴۳) اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں پر رسول بھیجے تھے پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ وہ خدا کے حضور میں گڑگڑائیں پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا عذاب آیا لیکن (الٹے) ان کے دل سخت ہو گئے، اور شیطان نے ان کے کام ان کو آراستہ کر کے دکھائے۔

انکار آخرت کی ایک خاصیت تکبر ہے، منکر آخرت کو متکبر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، جو اپنے سے کسی بالاتر طاقت اور اس زندگی کے بعد کسی زندگی اور روز جزاء کا یقین نہیں رکھتا، اس کو ایک شتر بے مہار اور ایک سرکش انسان بننے سے کیا چیز روک سکتی ہے، اس لئے قرآن مجید میں انکار آخرت کے ساتھ اکثر تکبر کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں لازم وملزوم سے ہیں۔

فَالَّذِینَ لَایُؤمِنُونَ بِالأٰخِرَۃِ قُلُوبُھُمْ مُنکِرَۃٌ وَھُمْ مُستَکبِرُونَ (سورۃ النحل۔ ۲۲) جولوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل منکر اور متکبر ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکر کے متعلق کہا گیا:۔

وَاستَکبَرَ ھُوَ وَجُنُودُہٗ فِی الأرضِ بِغَیرِ الحَقِ وَ ظَنُّوا أنَّھُم إلَینَا لَایُرجِعُونَ (سورۃ القصص ۳۹) فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر وانکار سے کام لیا اور وہ سمجھے کہ وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایسی منکرِ آخرت اور مادہ پرست قوموں کا پنجہ آہنی، ان کی گرفت ظالمانہ اور ان کی فتح ایک زلزلہ ہوتا ہے جو ملکوں اور شہروں کو تہ وبالا کر دیتا ہے۔

وَاِذا بَطَشتُم بَطَشتُم جَبَّارِینَ (سورۃ اشعراء ۱۳۰) جب کسی پر ہاتھ

ڈالتے ہو تو زبردستوں اور ظالموں کی طرح ڈالتے ہو۔

إن الملوك إذا دخلو ا قرية أفسدو ها و جعلوآ أعزة أهلِها أذلة (سورة النمل ٣٤) بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے سرداروں کو بے عزت کر ڈالتے ہیں۔

اسی طرح مغرب ایمان بالرسالۃ کی دولت سے بھی محروم رہا، حضرت مسیح کو اگرچہ اس نے ابن اللہ تسلیم کر لیا لیکن ان کو اپنی پوری زندگی کا رہنما اور رسول مطاع عملاً تسلیم نہیں کیا، پہلی چیز صرف ایک نظری اور اعتقادی تھی، اس کے تسلیم کرنے سے زندگی اور اخلاق واعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن ان کو اپنی زندگی کا رہنمائے کامل، ان کی سیرت کو اپنا مشعل زندگی اور انکو اپنے لئے اسوۂ کامل ماننے سے زندگی کا رخ بدل جاتا، لیکن مغرب نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کرنا آسانی سے ممکن تھا، حضرت مسیح کی زندگی کے صرف تین سال کے حالات اس کے پاس تھے، اور وہ بھی ایسے کہ زندگی میں ان کی تقلید واقتدا بہت مشکل تھی، اگر اہل مغرب حضرت مسیح کی سیرت واقوال اور ان کی ہدایت و تعلیمات کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا چاہتے تو ان کے لئے اس میں عملی دقتیں تھیں، مذہب مسیحی کے نمائندوں کے پاس ایسا کوئی مستند مذہبی سرمایہ نہ تھا جس کی مدد سے وہ ایک پوری قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے، نہ وہ ایسی دینی حکمت وبصیرت رکھتے تھے، جس سے وہ مغرب کی نوخیز قوموں کو دنیاوی ترقی کے ساتھ مذہب کے دائرہ میں رکھ سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی قوموں نے اپنی عملی زندگی حضرت مسیح کی قیادت اور کلیسا کی نگرانی سے آزاد کر لی اور انھوں نے اس طرح کی زندگی گزارنی شروع کر دی گویا وہ کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں،

ان کے دماغوں اور دلوں پر حضرت مسیح کی معصومانہ تعلیمات کا گہرا اثر نہیں پڑ سکا، وہ اس اخلاقی تربیت اور تزکیہ سے محروم رہے جو پیغمبر کے پیرو حاصل کرتے ہیں، انھوں نے وسائل بکثرت حاصل کئے، لیکن خیر کا رجحان صرف پیغمبر کی تعلیمات کے اثر اور اس کی تربیت و اصلاح سے حاصل ہو سکتا ہے، مادی علوم و اکتشافات سے وہ نہ حاصل ہو سکتا تھا، نہ ان کو حاصل ہو سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے وسائل اور یہ تمام طاقتیں جو خیر کے رجحان کے ساتھ عالم انسانی کی بہبود کا سبب بن سکتی تھیں، زمین میں سربلندی اور فساد کا آلہ کار بن گئیں اس لئے کہ ان کے استعمال کرنے والوں کے کان اس صدا سے ناآشنا ہیں۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الأرض ولا فساداً ، و العاقبة للمتقين (سورۃ القصص ۸۳) ترجمہ: وہ پچھلا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد نہیں چاہتے اور انجام کار اللہ سے ڈرنے والوں کا ہے۔

اس خدا فراموشی، آخرت فراموشی، اور پیغمبروں کی تعلیمات سے استغنا و بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب آج اس قدر روشن ہے کہ اس کی رات بھی دن ہے، لیکن اس قدر تاریک ہے کہ دن بھی رات ہے، روشنی اور ترقی کے اس دور میں آج وہ سب کچھ پیش آرہا ہے جو وحشت و بربریت کے دور کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، بقول میر اکبر حسین الہ آبادی مرحوم ؎

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

گذشتہ جنگ کے اختتام پر مسٹر لائڈ جارج نے کہا تھا:۔

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے، وہ ملاحظہ یہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی انسان فتنہ و فساد، کشت و خون، قتل غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے اثر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت فاقہ کشی کی آگئی ہے، اور حضرت آکر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو آپس میں ہاتھ ملاتے یا اس کے بالکل برعکس اس جنگ عظیم سے بھی بڑھ کر مہلک و پر اذیت جنگ کی تیاریاں کرتے، ایک سے ایک بڑھ کر جان لیوا اور ستم کش آلات ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے"۔

اور دوسری جنگ کے آغاز پر مسٹر ایڈن نے فرمایا:

جب تک کچھ کیا جائے اور خبر لی جائے، اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصہ میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرز زندگی اختیار کرلیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا، کیسی عجیب بات ہے تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لئے کروروں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہیں تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں، بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ

اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اور زائرین اس زمین پر آجائے تو وہ ہماری دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا، وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریق استعمال کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔

آج ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی متمدن دنیا جس کی رہنمائی روم و ایران کی مشرقی شہنشاہیوں کے ہاتھ میں تھی، آج کی دنیا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی، انسان پورے طور پر خدا فراموش ہو کر خود فراموش ہوا گیا تھا، خدا کا اعتقاد ایک تاریخی نظریہ اور علم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لوگ صرف تاریخی طور پر یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس عالم کو کسی زمانہ میں خدا نے پیدا کیا تھا، "ولئن سألتهم من خلق السمٰوت والأرض ليقولن الله"لیکن عملی زندگی کا کوئی ربط اس سے باقی نہیں رہا تھا اور زندگی عملاً اس طرح گزر رہی تھی، گویا خدا نہیں ہے یا ہے تو (معاذاللہ) گوشہ نشیں اور دوسرں کی خاطر سلطنت سے دست بردار ہو چکا ہے، ساری زمین پر ارباب من دون الله کی عبادت و پرستش کا جال پھیلا ہوا تھا، کہیں بتوں کی پرستش تھی کہیں قوم و نسل کی، کہیں ہوا و ہوس کی، کہیں بادشاہ و سلاطین کی، اور کہیں احبار و رہبان (عالموں اور عابدوں) کی، انسان اپنی زندگی کا مقصد اور اس کا مبدا و منتہا فراموش کر چکا تھا، اور زندگی کے صحیح مشاغل بھول کر تدریجی خودکشی اور غلط مشاغل میں منہمک تھا، ساری دنیا پر ایک عالم خود فراموشی طاری تھا، اہل حکومت ظلم و جور، جبر و استبداد، مردم آزاری اور دولت ستانی میں مشغول تھے، امراء اپنے عیش و

عشرت میں بدمست ہو رہے تھے، زندگی کا معیار اتنا بلند اور لوازمِ زندگی اتنے کثیر ہو گئے تھے کہ نئے نئے محاصل اور تاوانوں اور مظالم سے بھی پورے نہیں ہوتے تھے، معاشرت کا معیار اور زندگی کا تخیل اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ جس شخص کے پاس امارت کے لوازم نہ ہوتے اس کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا زندگی کی گرانی اور ہم چشموں میں بااعتبار اور باوقار بننے کی فکر میں ہر شخص ہمیشہ ایک فکر و غم اور کوفت میں مبتلا رہتا، متوسط طبقہ کے لوگوں کو اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی نقالی اور ریس سے فرصت نہ ملتی، غربا کو محکومی اور غلامی اور نئے نئے محاصل کے بوجھ سے سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی، وہ اپنے آقاؤں کے عیش و آرام، اور ان کے جائز و ناجائز مطالبات کی تکمیل کے لئے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہتے، جب کبھی اس سے چھٹی ملتی تو زندگی کا غم غلط کرنے کے لئے ناجائز تفریحات اور بدمستیوں سے دل بہلاتے، پورے پورے ملک میں بعض اوقات ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جس کو اپنے دین اور آخرت کی فکر ہوتی اور موت کا خیال آتا، بے گناہ شہری حکومتوں کے حرص و آرزو ملک گیری کی ہوس کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پستے رہتے، ایرانی سلطنت نے بغیر کسی معقول وجہ اور ضرورت کے شام کی عیسائی سلطنت پر فوج کشی کی اور نوے ہزار بے گناہ انسانوں کے خون سے اللہ کی زمین رنگین کی، اس کے جواب میں رومی سلطنت نے ایرانی سلطنت کو زیر و زبر کر دیا اور پر امن شہریوں کا انتقام پر امن شہریوں سے لیا، بلا کسی بلند مقصد اور اخلاقی مہم کے اس خونین جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا اور دنیا کی دو متمدن سلطنتوں کے باشندے اور مہذب و متمدن ترین

انسان و حشیوں کی طرح ایک دوسرے سے دست وگریباں رہے، پورے کرۂ ارض پر اس وقت اندھیرا چھایا ہوا تھا، انسانوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے ایک عالمگیر ابتری اور ہمہ گیر خرابی پھیلی ہوئی تھی، **ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون (سورة الروم ۴۱)**

اس وقت اس متمدن دنیا (جس کو پورے طور پر گھن لگ چکا تھا) سے الگ لیکن اس کے بالکل قریب اور ان دونوں حریف مشرقی و مغربی شہنشاہیوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے امیوں کے درمیان ایک امی پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ دنیا کو اس عذاب سے نجات دے جس میں وہ صدیوں سے مبتلا تھی، اور آخرت کے اس عذاب سے ڈرائے جو پیش آنے والا ہے، تاریکیوں سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کرے اور تمام زنجیریں اور بیڑیا کاٹے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

یأ مر هم با لمعروف و ینههم عن المنکر و یحل لهم ا لطیبات و یحرم علیهم الخبائث و یضع عنهم اصرهم و الأغلا ل التی کانت علیهم (سورة الاعراف ۷ ۱۵) (وہ نبی امی) انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے، پسندیدہ چیزیں حلال کرتا ہے، گندی چیزیں حرام ٹھہراتا ہے، اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتا ہے جس میں وہ گرفتار ہیں۔

اس نبی امی ﷺ نے ۷ھ ۶۳۰ء میں رومی شہنشاہ (ہرقل) کو مدینہ سے ایک خط اور پیغام بھیجا، دعوت یہ تھی۔

یااهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سوآء بیننا بینکم ألا نعبد إلاالله ولا

نشرك بہٖ شیئاً ولایتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون الله(سورۃ آل عمران ٦۴)اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔

ہرقل نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کرلیا، لیکن وہ اپنی کمزوری سے اس ربوبیت سے دست بردار نہ ہو سکا جس سے وہ متمتع ہو رہا تھا، اس طرح رومی زندگی کے اس عذاب سے اس وقت تک نجات حاصل نہ کر سکے جب تک مسلمان مجاہدوں نے شام وروم کے ممالک کو اپنے سایہ رحمت میں نہیں لے لیا۔

لیکن عرب کی درماندہ قوم نے نبی امی ﷺ کے پیغام کو قبول کرلیا اور وہ ساری نعمتیں حاصل کیں جو اس پیغام کا نتیجہ ہیں، ان کی غلامی کی تمام زنجیریں خودبخود کٹ گئیں، خدا کے آستانہ پر سر جھکا کر وہ دنیا کے تمام آستانوں سے بے نیاز ہو گئے، نہ نفس کی بندگی رہی نہ بادشاہوں اور حکومتوں کی غلامی کی، نہ جاہلانہ رسم ورواج اور معاشرت اور سوسائٹی کی سابق ظالمانہ بندشیں، نہ اپنی لائی ہوئی اور نہ دوسروں کی ڈالی ہوئی مصیبتیں، خداشناسی اور خدا کی عظمت وکبریائی کے علم نے دنیا کے مصنوعی خداؤں کی عظمت کا طلسم توڑ دیا۔ اور ان کی نظر سے گرادیا، عرب کے یہ فاقہ مست۔ دریدہ پیرہن، گلیم پوش اعرابی جو کبھی اپنے صحرا اور بادیہ سے باہر نہیں نکلے تھے، اور جنھوں نے شان وشوکت کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا تھا، شاہان عجم سے اس طرح آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بے تکلف باتیں کرتے تھے، اور ان کے درباری کرّوفر کو اس بے پرواہی اور تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے، گویا مٹی کی مورتیں اور کاغذ کے کھلونے ہیں جن کو جھنڈیوں سے آراستہ

کر دیا گیا ہے، وہ ایسے حقیقت شناس ہو گئے تھے کہ شان و شوکت کے کھو کھلے مظاہر ان کو ذرا متاثر نہ کرتے اور کہیں وہ اپنے اصول اور اخلاقی معیار سے ذرا بھی انحراف کرنا پسند نہ کرتے۔ وہ اپنے کو خدا کے بندوں کو دوبارہ خدا کی بندگی میں داخل کرنے اور انسانوں کی خدائی کا طلسم توڑنے پر مامور و مبعوث سمجھتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایرانیوں کے سپہ سالار اعظم اور امیر رستم کی فرمائش پر ربعی بن عامر کو بطور سفیر کے بھیجا، ایرانیوں نے بڑے ٹھاٹ کے ساتھ دربار سجایا، ذریں قالین اور ریشمیں فرش بچھائے یاقوت اور آبدار موتیوں کی چمک سے نظر نہیں ٹھہرتی تھی، رستم کے سر پر تاجِ زریں اور جسم پر زرنگار پوشاک سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا، ربعی اس شان سے دربار میں داخل ہوئے کہ جسم پر موٹے موٹے کپڑے، ہاتھ میں تلوار و سپر، رانوں کے نیچے کوتاہ قامت گھوڑا، وہ اسی شان بے نیازی کے ساتھ دربار میں آگئے، گھوڑے سے اتر کر امرائے دربار کے ایک گاؤ تکیہ سے گھوڑے کو باندھ دیا، زرہ پوش ہتھیار بند مجلس میں آئے، چوبے داروں نے عرض کیا ہتھیار رکھ دیجئے، کہا میں اپنے شوق سے نہیں آیا تمہارا بلایا ہوا آیا ہوں اگر تمہیں اس طرح میرا آنا منظور نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں، رستم نے کہا آنے دو، ربعی قالینوں پر اپنے نیزہ کو چبھوتے ہوئے اور اس سے عصا کا کام لیتے ہوئے اس طرح بے تکلف بڑھتے چلے گئے کہ قالین جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئے۔ اور جا کر رستم کے پاس بیٹھ گئے، رستم نے پوچھا کہ آپ کا اس ملک میں آنے کا مقصد کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے حکم

سے اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت و کشادگی میں، مذاہب کے ظلم وجور سے بچا کر اسلام کے عدل وانصاف میں داخل کریں، اس نے ہم کو اپنی مخلوق کی طرف اپنے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ ہم اس دین کی دعوت دیں اگر وہ اس کو مان لے تو ہم ـــــــ واپس چلے جائیں، اور جس کو اس سے ـــــــ انکار ہو اس سے ہم ہمیشہ لڑتے رہیں، یہاں تک کہ ہم کو اللہ کا انعام مل جائے، رستم نے کہا وہ انعام کیا ہے؟ کہا جو اس راستہ میں مر جائے اس کے لئے جنت اور جو زندہ رہ جائے اس کے لئے اس کی نصرت، رستم نے کہا میں نے آپ کی بات سن لی، کیا آپ ہم کو اس کی مہلت دے سکتے ہیں کہ ہم ارکان سلطنت سے مشورہ کرلیں، کہا ہاں، آپ کو کتنی مہلت چاہئے، ایک دن یا دو دن، کہا اتنے تھوڑے وقت میں کیا ہوگا، ہمیں خط وکتابت کرنی پڑے گی اور رائے معلوم کرنی ہوگی، ربعی نے کہا، رسول اللہ ﷺ نے دشمن سے مقابلہ کرتے وقت تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی نظیر نہیں چھوڑی، اس لئے اس معاملہ پر جلد غور کر لیجئے اور تین چیزوں (اسلام، جزیہ اور جنگ) میں سے کسی چیز کا انتخاب کر لیجئے، رستم نے کہا آپ مسلمانوں کے سردار ہیں؟ ربعیؓ نے کہا نہیں، مسلمان سب جسم واحد ہیں ان میں سے سب سے ادنیٰ کو بھی سب سے اعلیٰ کے مقابلہ میں پناہ دینے کا حق ہے۔

ایک سفارت میں حضرت مغیرہؓ گئے، اس دن دربار کی نئی شان تھی، ایرانیوں نے اپنی شان وشوکت اور دولت وحشمت کا انتہائی مظاہرہ کیا تھا، مغیرہؓ بے تکلف صدر کی طرف بڑھتے ہوئے صدر مجلس (رستم) کے زانوا سے

زانو ملا کر بیٹھ گئے، ایرانیوں نے یہ منظر کہاں دیکھا تھا، تاب نہ لا سکے اور بازو پکڑ کر تخت سے اتار دیا، مغیرہ نے کہا کہ مہمان کے ساتھ تو یہ سلوک مناسب نہ تھا، ہم لوگوں میں یہ دستور تو نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور تمام لوگ اس کے آگے بندوں کی طرح کھڑے ہوں، انکی اس بے باکانہ گفتگو کا جب ترجمہ کیا گیا تو دربار پر سناٹا چھا گیا اور لوگوں نے اعتراف کیا کہ ہماری ہی غلطی تھی۔

ایک رومی دربار میں حضرت معاذ بن جبلؓ سفیر بن کر گئے، دربار میں دیبائے زریں کا فرش بچھا تھا، معاذ زمین پر بیٹھ گئے اور کہا کہ میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے بیٹھنا نہیں چاہتا، عیسائیوں نے کہا کہ ہم تمہاری عزت کرنا چاہتے تھے، لیکن ہم کیا کریں تم کو خود اپنی عزت کا خیال نہیں، معاذؓ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور کہا جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں، اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون خدا کا غلام ہو سکتا ہے، ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے کوئی بڑھ کر ہے، معاذ نے کہا معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں، رومیوں نے اپنے بادشاہ پر فخر کیا معاذؓ نے کہا کہ تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے لیکن ہم نے جسکو اپنا حاکم بنا رکھا ہے، وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا، اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردہ میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال و دولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔

اس ذہنی انقلاب سے جو ایک خدا کو اپنا معبود حقیقی اور رب مان لینے

سے پیش آیا، ان کی زندگی سراسر تبدیل ہو گئی، جو بہائم صفت تھے، وہ فرشتہ خصلت انسان بن گئے، جو غارت گر اور رہزن تھے، وہ دوسروں کے جان و مال اور عزت و ناموس کے محافظ بن گئے جو جانوروں کے پہلے اور پیچھے پانی پینے اور پلانے پر خون کی ندیاں بہادیتے تھے، وہ دوسروں کی خاطر پیاسا مر جانا پسند کر نے لگے، جو اپنی بچیوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے، وہ دوسروں کی بچیوں کی پرورش کے لئے اپنی گودیں خالی کرنے لگے، جو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے، وہ اپنا مال بھی دوسروں کا مال سمجھنے لگے، جن کو دن کی روشنی میں لوگوں کا مال لوٹ لینے میں باک نہ تھا، وہ رات کی تاریکی میں شاہ ایران کا تاج زریں جو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا اپنے کمبل میں چھپا کر امیر کے پاس پہونچا دیتے تھے۔

خدا طلبی نے دنیا طلبی اور رزق طلبی کے اس بحران اور جوش کو سرد کر دیا جس نے دنیا کی عافیت تنگ کر دی تھی، اور دنیا کو محض ایک بازار اور منڈی بنا دیا تھا، مسابقت کا وہ فطری جذبہ جو انسان کی دبی ہوئی قوتوں کو ابھارتا اور اس کے جوہروں کو چمکاتا ہے جس نے پہلے دنیا کی طرف متوجہ ہو کر زندگی کو ایک غیر مختتم کشمکش بنا دیا تھا، اور بھائی بھائی میں رقابت پیدا کر دی تھی، دین کی طرف متوجہ ہو کر اس نے شریفانہ انسانی خصائل کو ابھار دیا اور سیرت کو پاکیزہ بنا دیا مختلف انسانی طبقات اور ان طبقوں کے مختلف افراد میں اب بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش تھی، مگر نیک کرداری اجر و ثواب اور خدا کی مغفرت و رضا کے حصول میں، غرباء نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ ہمارے دولت مند بھائی ہم سے آگے بڑھے جا رہے ہیں، نماز روزہ وہ ہماری

طرح کرتے ہیں، صدقہ اور خیرات میں ہم ان کی برابری نہیں کر سکتے، آپ نے ان کو ایک ذکر بتلا دیا، دولت مندوں نے سنا تو انھوں نے بھی وہی پڑھنا شروع کر دیا غرباء نے آکر پھر عرض کیا کہ ہم تو پھر پیچھے رہ گئے، ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی وہی پڑھنا شروع کر دیا، جو آپ نے ہم کو بتلایا تھا، آپ نے انکو تسکین دی، زہد و قناعت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنادیا جس میں "لا خوف علیهم ولا هم یحزنون" کی جھلکی نظر آتی تھی، مال کی طمع اور حرص و منافست کے دور ہو جانے سے قلوب میں ایسی الفت اور محبت پیدا ہو گئی تھی، کہ "نزعنا ما فی صدورهم من غل" (ہم نے ان کے سینوں کے کھوٹ کو نکال دیا) کا منظر جو اہل جنت کی صفت ہے، دنیا میں نظر آنے لگا، حقوق طلبی کے بجائے فرض شناسی اور طمع کے بجائے ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو گیا تھا کہ "یؤثرون علیٰ أنفسهم ولو کان بهم خصاصة" کا نظارہ دیکھنے والوں کو نظر آیا اور چشم فلک نے حیرت کے ساتھ یہ سماں دیکھا کہ میزبان نے بچوں کو بھوکا سلا کر اور چراغ بجھا کر مہمانوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہے، مہمان شکم سیر ہو کر اٹھے اور میزبان بیوی بچوں سمیت رات بھر بھوکا رہا۔

یہ ساری اصلاح اور یہ ساری ترقی نتیجہ تھی اللہ کو الہ واحد تسلیم کر لینے اور اپنے کو اس کے حوالہ کر دینے اور خود کو ایک معصوم پیغمبر کی نگرانی اور تربیت میں دینے کا، اس سے گویا ان کی زندگی کی چول بیٹھ گئی اور ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک آگئی۔

مسیحی دنیا نے اس پیغام کی قدر نہ کی اس کا مشرقی حصہ تو بہت جلد ان

لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا جو اس پیغام کے حامل اور اپنے پیغمبر کے جانشیں تھے، لیکن اس کا مغربی اور شمالی حصہ (یورپ) مجاہدین و داعیان اسلام کے حلقہ سے باہر رہا، اس نے پوری نو صدیاں (یا ایک ہزار سال) جہالت اور ظلمت کے اس دور میں گزاریں جس کو وہ خود اپنی زبان سے قرون مظلمہ (DARK AGES) کہتا ہے، انسانی تاریخ کا یہ طویل زمانہ جو وحشت و جہالت، عقل دشمنی اور اوہام پرستی، رہبانیت کی مردم آزاری اور آدم بیزاری، ارباب کلیسا کی آتشیں دار و گیر اور ظالمانہ احتساب کے نذر ہوا، اس کا افسوس یورپ کو ہمیشہ رہے گا، اور اس کی ندامت سے اس کی گردن ہمیشہ جھک جانی چاہئے، یہ سب کرشمہ تھا مخلوق پرستی کا۔ إتخذوا أحبارهم و رهبانهم أربابًامن دون الله والمسيح بن مريم (التوبة۳۱) انھوں نے اپنے عالموں راہبوں اور (حضرت) مسیح کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنالیا۔

سولہویں صدی میں جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خیال کیا کہ اس کی ساری مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ کلیسا کی غلامی سے نجات حاصل کر لے، لیکن لاإله کی پوری منزل طے نہیں کی اس نے لا کلیسا کو لاإله کا مرادف سمجھا اور اس کی نفی کر کے اور دوسرے الٰہ اپنے اوپر مسلط کر لئے، اور الااللہ کا تو اس نے آغاز ہی نہیں کیا، مغرب اپنی اہم ترین تاریخ کی ان تین صدیوں میں اپنے ایک پسندیدہ الٰہ سے روٹھ کر دوسرے نئے نئے آلہہ تراشتا رہا اور "أتعبدون ما تنحتون" (کیا تم جن کو اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو، انھیں کی پرستش کرنے لگتے ہو) کا منظر نظر آتا رہا، آج بھی وہ اپنے بہت سے قدیم الٰہہ سے بیزار نظر آتا ہے، لیکن دوسرے الٰہہ باطل تراشتا جارہا ہے ان میں کسی الٰہ کا

نام جمہوریت ہے کسی کا نام آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کسی کا نام سرمایہ داری، کسی کا نام اشتراکیت، کسی کا نام قومی اشتراکیت، کسی کا نام قوم اور کسی کا نام وطن ہے، مغرب اپنی زندگی کے نقشے ادھیڑ ادھیڑ کر بنا تا اور اپنی زندگی کی گھڑی کے پرزے بکھیر بکھیر کر جماتا ہے، لیکن اسکی چول نہیں بیٹھتی، اس الجھی ہوئی ڈور کو وہ برسوں سے اپنے ناخونِ تدبیر سے سلجھا رہا ہے لیکن جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ الجھتی جارہی ہے، یہاں تک کہ اب اس میں خود اس کی انگلیاں اس طرح پھنس گئی ہیں کہ نکلتی نہیں۔

وہ زندگی کے ہزار نقشے بنائے اور ان میں ہزار ترمیمیں کرے اور ان کے نئے نئے نام رکھے ایک شخص کی ذمہ داری بہت سے اشخاص پر منقسم کر دے یا بہت سے اشخاص کی ذمہ داری ایک منتخب ترین اور ذمہ دار ترین فرد پر ڈال دے اور اس شخص کو صدہا قیود و ضوابط سے جکڑ دے لیکن جب تک اس جسم کا قلب نہیں بدلتا، وہ ذمہ دار ایک فرد ہو یا کوئی جماعت یا پوری قوم جب تک اپنے کو ایک بالاتر طاقت علیم وبصیر کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتی، اس کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی باز پرس کا کھٹکا نہیں، خیر کا رجحان اور نیکی وامانت کا شعور نہیں، اس وقت تک محض ناموں کی تبدیلی سے قوانین و ضوابط سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سیرت محمدی کا اصل پیغام اس بیسویں صدی کی دنیا کے نام جس کی قیادت آج مغرب کے ہاتھوں میں ہے یہ ہے کہ اے اللہ سے بھاگنے والو اللہ کی طرف بھاگو اور اس کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ۔

ففروا إلى الله إني لكم منه نذير مبين ، و لا تجعلوا مع الله إلهاً

آخر، إني لكم منه نذير مبين .(الذٰريات ۵۰ ـ۵۱)پس بھاگو اللہ کی طرف بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ، بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

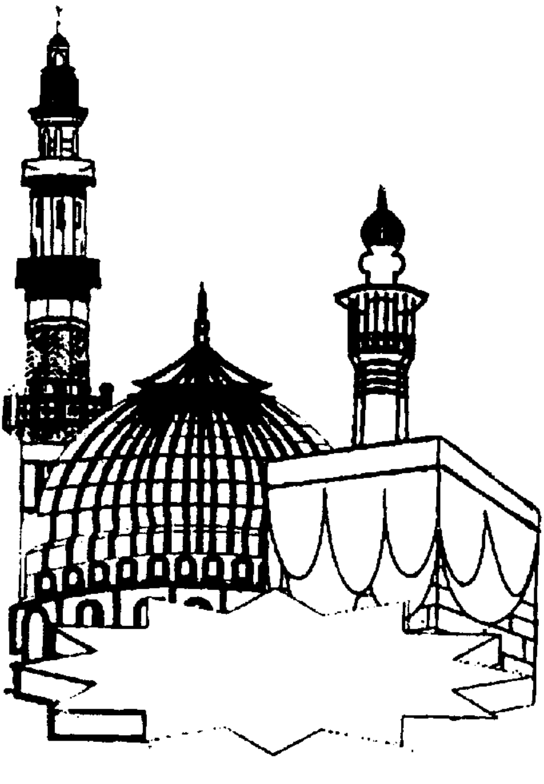
یہ پیغام محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہر سال دنیا کو سناتی ہے، اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک یہ دعوت پہونچاتی ہے، ہوا اپنے کاندھوں پر اور سمندر اپنے سر آنکھوں پر رکھ کر ہر سال اس پیغام اور دعوت کو دنیا کے ملکوں اور قوموں کو پہونچاتا ہے اور دنیا کا یہ شور جو کچھ سننے نہیں دیتا اگر ذرا کم ہو تو اب بھی کان میں یہ آواز آرہی ہے، جس کو پہلی صدی کے اہل کتاب نے سنا تھا۔

قدجاء كم من الله نورٌ وكتاب مبين يهدى به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ويخرجهم من الظلمات الى النور باذنه ويهديهم الى صراط مستقيم .(المائده ۱۵،۱۶) تمہارے پاس ایک روشنی آئی اور ایک کھلی ہوئی کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کی جو اس کی رضا کا پیرو ہو سلامتی کے راستوں کی اور ان کو نکالتا ہے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو ہدایت کرتا ہے سیدھے راستہ کی۔

پیغمبر ہی انسانی جہاز کے ناخدا ہیں، انسانوں کی کشتی ہر زمانہ میں انہیں کی ناخدائی سے ساحل تک پہونچتی ہے، صرف حضرت نوحؑ کے فرزند ہی کی خصوصیت نہ تھی، ہر زمانہ میں جس نے بھی دعویٰ کیا "ساوی الى الجبل يعصمني من الماء" (میں تو پہاڑ پر پناہ لے کر طوفان سے محفوظ رہ جاؤں گا)

اس کو یہی جواب ملا "لاعاصم الیوم" (آج کوئی بچانے والا نہیں) محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب اولین و آخرین سب کے لئے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انہیں کے دامن سے وابستہ ہے۔ ان سے علٰحدہ ہو کر شقاوت اور ہلاکت، محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد عربی ﷺ کابروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او



نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

یہ مقالہ مفکرؒ اسلام نے عربی
میں تحریر کیا تھا، جو دمشق سے شائع
ہونے والا رسالہ ''المسلمون'' میں
شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ افادہ اور استفادہ
کے پیش نظر اس موقر کتاب میں شامل
اشاعت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

نیا ارتداد

اسلام کی تاریخ میں ارتداد کے متعدد واقعات پیش آئے ہیں، سب سے بڑا اور سخت سانحہ ارتداد عرب قبائل کا ارتداد تھا، جو رسول اکرم ﷺ کی وفات کے معاً بعد پیش آیا، یعنی وہ زبردست باغی تحریک جس کو ابو بکر صدیق نے اپنے بے نظیر عزم و ایمان سے سر اٹھاتے ہی کچل دیا تھا، دوسرا بڑا ارتدادی واقعہ نصرانیت اختیار کر لینے کی وبا تھی، جو ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد پھیلی اور بعض ان دوسرے ملکوں میں بھی رونما ہوئی، جو مسیحی طاقتوں کے زیر نگیں تھے، اور عیسائی پادری اور مشزی وہاں اس مقصد کے لئے سرگرم عمل تھے، ان معتدبہ واقعات کے علاوہ ارتداد کے اکادکا واقعات بھی ہیں کہ مثلاً ہندوستان میں کسی خفیف العقل اور پست طبیعت فرد نے اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا، لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر بد نصیب ہسپانیہ کے فتنہ نصرانیت کو ارتداد کہنا صحیح ہے تو اس کو مستثنیٰ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ

مسلمانوں کی تاریخ کسی عام ارتداد سے آشنا نہیں ہوئی ہے، جیسا کہ مورخین مذاہب کا اعتراف ہے۔

یہ واقعات جب کبھی پیش آئے، ان پر ہمیشہ دو اثر مرتب ہوئے (۱) مسلمانوں کی طرف سے سخت ناراضگی اور ناپسندیدگی (۲) اسلامی سوسائٹی سے قطع تعلق یعنی جو کوئی اپنے دین سے منحرف ہوتا تھا، وہ مسلمانوں کے سخت غیظ و غضب کا نشانہ بنتا تھا، اور اس اسلامی معاشرے سے خود بخود منقطع ہو جاتا تھا جس میں اس کی بود و باش ہوتی، مجرد ارتداد سے اس کے اور اس کے اہل قرابت کے درمیان تمام رشتے اور تعلقات کٹ جاتے تھے، اور ارتداد کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آدمی گویا ایک دوسرے معاشرے اور ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا، مرتد کا خاندان اس کا بالکلیہ بائیکاٹ کر دیتا تھا، اب نہ رشتہ رہتا تھا نہ نکاح، نہ اخوت نہ وراثت، ارتداد کی اگر کوئی لہر کبھی اٹھتی تھی تو اس سے بین الادیانی کشمکش برپا ہوتی اور مسلمانوں میں مقاومت اور اسلام کے دفاع کی روح بیدار ہو جاتی تھی، جس اسلامی ملک میں ایسے واقعات پیش آجاتے تھے، وہاں کے علماء، داعیان اسلام اور اہل قلم پرجوش طریقے سے ان کے خلاف صف آرا ہو جاتے، ان کے اسباب کا کھوج لگاتے، اور اسلام کے محاسن و فضائل کو سامنے لاتے تھے، اس مسلمان معاشرے کا یہ حال ہو جاتا جیسے قلق و اضطراب اور غیظ و غضب کی ایک موج آکر سب کو تہ بالا کر گئی ہو، یہ حوادث مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے، اور کیا خواص، کیا عوام سب کیلئے ایک ہی بات اور ایک ہی فکر ہوتی تھی، ــــــ یہ ہوتا تھا اسلامی سوسائٹی پر واقعات ارتداد کا رد عمل اور ان کی لازمی خصوصیت! حالانکہ نہ یہ کسی وسیع پیمانے پر پیش آتے تھے اور نہ زندگی پر ان کے کچھ ایسے اثرات ہی پڑتے۔

لیکن اب کچھ عرصے سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے، جس نے اس کے اس سرے سے اس سرے تک ایک لہر پیدا کر دی ہے، یہ اپنی شدت و قوت اور وسعت و عُمق میں اب تک کی تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے، کوئی ملک نہیں ہے جو اس کی غارت گری سے بچا ہوا ہو، بلکہ ملک تو ملک خاندانوں میں ایسے مشکل ہی سے تھوڑے بہت ہوں گے، جو اسکی دست برد سے محفوظ ہوں، یہ وہ ارتداد ہے، جو مشرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، یہ سب سے عظیم ارتداد ہے، جو عہد رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے،

شریعت اسلامی کی اصطلاح میں ''ارتداد'' کے کیا معنی ہیں؟ ایک دین کی جگہ پر دوسرا دین، اور ایک عقیدے کے بجائے دوسرا عقیدہ اختیار کرنا! رسول جو تعلیمات لے کر آیا، جو کچھ اس سے تواترا منقول ہے، اور جو کچھ اسلام میں قطعی طور پر ثابت ہے، اس سے انکار کرنا! اور مرتد کیا رویہ اختیار کرتا تھا، ؟ رسالت محمدی ﷺ کا انکار کرتا تھا، اور مسیحیت، یہودیت یا ہندو مذہب کی طرف منتقل ہو جاتا تھا، یا الحاد کی راہ اختیار کرتا، وحی و رسالت اور آخرت سے منکر ہو تا تھا، یہ ارتداد کے وہ معنی ہیں، جن سے پوری دنیا یا پرانی سوسائٹی واقف تھی، ہر وہ شخص جو اپنا دین چھوڑتا تھا، اگر مثال کے طور پر نصرانی بن جاتا تو کلیسا میں داخل ہو تا یا ہیکل میں جاتا، یا اگر ہندو مذہب اختیار کرتا تو بت خانے کی راہ لیتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ ارتداد سب پر روشن ہو جاتا تھا، اور مرتد دور سے پہچان لیا جاتا تھا، اس کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں، اور مسلمان اس شخص سے تمام امیدیں منقطع کر لیتے تھے، الحاصل عام طور پر کسی کا ارتداد کوئی راز نہیں ہوا کرتا تھا،

یورپ کا لایا ہوا فلسفہ

یورپ نے مشرق میں وہ فلسفے پہنچائے، جو دین کے بنیادوں کے انکار پر مبنی تھے، جن کی بنیاد اس عالم میں کار فرما (متصرف) قوت کے انکار پر تھی، وہ باشعور قوت جو اس دنیا کو عدم سے وجود میں لائی، اور جس کے دستِ تصرف میں کائنات کی زمام کار ہے، "ألا له الخلق و الأمر" (خبردار! اسی نے تخلیق کی اور اسی کا حکم چلتا ہے) وہ فلسفے جو عالم غیب، وحی، نبوت، شرائع سماویہ اور روحانی واخلاقی قدروں کے انکار پر مبنی تھے، یہ تھی مغرب کے لائے ہوئے تمام فلسفوں کی مشترک بنیاد جن میں کوئی علم الحیات اور ارتقاء کے مسائل سے بحث کرتا تھا، کسی کا تعلق اخلاق سے تھا، کسی کا محور علم النفس تھا، اور کسی کا موضوع بحث سیاست واقتصاد، یہ فلسفے اپنے موضوعات والوں میں خواہ باہم کتنے ہی مختلف تھے تاہم اس نقطے پر سب ملتے تھے کہ انسان وکائنات کو محض مادی نظر سے دیکھیں، اور ان دونوں کے ظاہری احوال وافعال کی مادی توجیہ کریں۔

یہ فلسفے مشرقی اسلامی معاشرہ پر حملہ آور ہوئے، اور اس کے باطن تک گھس گئے، یہ فلسفے سب سے بڑا دین تھے، جو تاریخ میں اسلام کے بعد پیدا ہوا، سب سے بڑا دین اپنی وسعتِ اشاعت کے لحاظ سے، سب سے گہرا دین اپنی جڑوں کے لحاظ سے اور سب سے طاقتور دین دلوں اور اور دماغوں کو مسخر کرنے کے لحاظ سے، اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم وفہم کے لحاظ سے ممتاز تھا، اس دین پر فریفتہ ہوگیا، اس نے اسے نہایت خوش گواری کے ساتھ حلق سے اتار لیا اور اطمینان کے ساتھ ہضم کرلیا، وہ اس دین کا ٹھیک اسی طرح پیرو بن گیا، جس طرح ایک مسلمان اسلام کا اور ایک مسیحی مسیحیت کا، حتی کہ وہ اس پر جان دیتا ہے، اس کے شعائر کی عزت

کرتا ہے، اس کے رہنماؤں اور داعیوں کی عظمت کا کلمہ پڑھتا ہے، اپنے ادب اور تالیفات میں اس دین کی دعوت دیتا ہے، اور جو دین، جو نظام اور جو طرز فکر اس کے معارض ہوتا ہے، اس کی تحقیر کرتا ہے، اس دین کے ہر پیرو سے وہ اخوت کا رشتہ استوار کرتا ہے، اور اس طرح یہ تمام افراد ایک امت، ایک خاندان اور ایک گروہ بن گئے ہیں۔

دین لادینیت

یہ نیا دین۔۔۔۔۔۔اگرچہ اس کے پیرو اس کو "**دین**" کا نام دینے سے انکار کرتے ہوں، کیا ہے۔؟ کائنات کو وجود میں لانیوالی علیم و خبیر ہستی کا انکار جو مالکِ تقدیر بھی ہے، اور رہنمائے حیات بھی (الذی قدر فھدیٰ) حیات بعد الموت، حشر، جنت و دوزخ، ثواب و عذاب کا انکار، نبوت و رسالت کا انکار، شرائع سماویہ اور حدود شرعیہ کا انکار اور اس حقیقت کا انکار کہ اللہ نے اپنی تمام مخلوق پر اپنے برگزیدہ رسول (خاتم الرسل) کی اطاعت فرض کی ہے، اور ہدایت و سعادت کو اس کی پیروی میں منحصر کر دیا ہے، اور اس بات کا انکار کہ اسلام وہ آخری اور دائمی پیغام ہے، جو دین و دنیا کی تمام سعادتوں کا کفیل ہے، اور زندگی کا ایک نظام ہے، جو سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور وہی وہ دین ہے جس کے علاوہ کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں، اور جس کے بغیر دنیا کی فلاح و سعادت کا کوئی امکان نہیں، اور اس کا انکار کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور انسان اللہ کے لئے۔

آج جس طبقے کے ہاتھ میں اکثر ممالک اسلامیہ کی زمام حیات ہے، اس کے افراد کی ایک بڑی تعداد اسی دین کی پیرو ہے، اگرچہ یہ سب پختگی ایمان اور سرگرمی عمل میں ایک درجے کے نہ ہوں، بحمد للہ اس طبقے میں خاصی تعداد میں

ایسے افراد بھی ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کی پیروی کرتے ہیں مگر اس طبقے کا وہ وصف جو افسوس ہے کہ اس پر غالب ہو گیا ہے، اور اس کے بہت مقتدر افراد کا دین یہی مادہ پرستی اور زندگی کا مغربی فلسفہ ہے جو الحاد پر مبنی ہے،

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ وہ ارتداد ہے، جس نے عالم اسلامی کو اس سرے سے اس سرے تک تاراج کیا ہے، گھر گھر اور خاندان خاندان پر اس کا حملہ ہوا ہے، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اداروں سب پر اس کی یورش ہوئی ہے، مشکل ہی سے کوئی ایسا خوش قسمت خاندان ہو گا، جن میں اس دین کا کوئی پیرو کار، پرستار اور عقیدت گزار موجود نہ ہو، آپ جب ذرا اس سے تنہائی میں باتیں کریں گے، کچھ چھیڑیں گے، اور اندر کی بات اگلوائیں گے تو دیکھیں گے کہ وہ ایمان باللہ سے محروم ہو گا، یا ایمان بالیوم الآخر سے خالی ہو گا، یا رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ رکھتا ہو گا، یا قرآن کو ایک معجزہ و ابدی کتاب اور دستور حیات نہ مانتا ہو گا اور ان میں سب سے غنیمت وہ ہو گا، جو کہے گا کہ میں اس قسم کے مسائل پر غور نہیں کرتا اور ان کو کوئی بڑی اہمیت نہیں دیتا۔

ایک لاوارث مسئلہ

بلا شبہ یہ ارتداد ہے، لیکن وہ مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکا، کیوں؟ اس لئے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل میں نہیں جاتا، اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے، نہ معاشرہ اس پر چونکتا ہے کہ احتساب و عتاب کی صورت پیش آئے، اور فصل و انقطاع کا معاملہ درپیش ہو، پس وہ بدستور اسی سوسائٹی اور معاشرے میں رہتا ہے، اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے، بلکہ معاشرہ پر حاوی ہونے تک کا موقع اسکو مل جاتا ہے، یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم

مسئلہ اور بڑا قابل فکر معاملہ ہے، ارتداد پھیلتا ہے، اسلامی معاشرے پر حملہ آور ہوتا ہے، اور کوئی اس پر چونکتا تک نہیں، علمائے امت اور رجال دین اس سے کوئی پریشانی اور بے چینی نہیں محسوس کرتے، پہلے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا تھا تو لوگ اس کو حل کرنے کے لئے حضرت علیؓ کو یاد کیا کرتے تھے، ایسے موقع پر ضرب المثل تھی " قضية ولا ابا حسن لها"(ایک پیچیدہ فقہی مسئلہ درپیش ہے لیکن کوئی نہیں جو اس کو حضرت علی کی ذہانت کے ساتھ حل کرے) اس ارتداد کے موقع بے ساختہ حضرت ابوبکر کی شان عزیمت یاد آتی ہے اور کہنا پڑتا ہے ـــ"قضية ولا ابا بكر لها "(ارتداد کی آگ پھیل رہی ہے، لیکن کوئی نہیں جو ابوبکر صدیقؓ کی قوت ایمانی اور شان عزیمت کے ساتھ اس پر قابو پائے)۔

لیکن یاد رکھئے! اس مسئلہ کا علاج جنگ نہیں، اور نہ اس پر رائے عامہ کو بھڑکانا درست ہے، یہ برافروختگی اور سختی سے حل ہو سکتا، بلکہ سختی الٹا نقصان پہنچائے گی۔ اور فتنے کو اور بھڑکادے گی، اسلام خفیہ تحقیقاتی عدالتوں INQUSI-TION سے آشنا نہیں ہے، اور نہ وہ جبر و ظلم کا روادار ہے، یہ معاملہ عزم و حکمت اور صبر و تحمل چاہتا ہے اور اس سے نپٹنے کے لئے غور و فکر اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

لادینیت کی عالمگیر اشاعت کا راز

یہ دنیا دین اسلامی دنیا میں کیوں کر پھیل سکا؟ کیسے اسے یہ طاقت حاصل ہو سکی کہ مسلمانوں پر عین ان کے گھر کے اندر حملہ آور ہو سکے اور کیوں کر اس کے لئے ممکن ہوا کہ لوگوں کی عقلوں اور طبیعتوں پر اس قدر قوت کے ساتھ مستولی ہو جائے؟ یہ سب سوالات ہیں جو بڑی گہری اور دقیق فکر اور بڑے وسیع مطالعہ کو

چاہتے ہیں۔

قصہ یوں ہوا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام پر تھکاوٹ اور بڑھاپے کے آثار طاری ہونے لگے، دعوت و عقیدہ اور علم و عقلیت کے لحاظ سے وہ شدید ضعف وانحطاط کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔۔اسلام تو بے شک بڑھاپے کی منزل سے آشنا نہیں ہے، اس کی مثال سورج کی سی ہے کہ قدیم ہونے کے باوجود ہر وقت جدید اور ہر دم جوان، لیکن یہ مسلمان تھے، جو ضعف و پیروی کا شکار ہو گئے، علم میں وسعت، فکر میں ندرت، عقل کی عبقریت، دعوت کے جوش وولولہ اور اسلام کو مؤثر طریقے پر پیش کرنے کے سلیقہ میں بڑا خلا محسوس ہوتا تھا۔

مزید بر آں یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ربط نہیں رکھا گیا اور نہ ان کے ذہن کو متأثر کرنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ آنے والا دوران ہی کا تھا، اس نو خیز نسل کو اس بات کا قائل کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی کہ اسلام ایک سدابہار پیغام اور دین انسانیت ہے، قرآن ہی تنہا وہ معجزہ اور ابدی کتاب ہے جس کے عجائبات کی انتہا نہیں، جس کے ذخائر فکریہ کا اختتام نہیں، اور جس کی جدت پر کہنگی کا گزر نہیں، رسول ﷺ اپنی ذات سے ایک زبردست معجزہ، تمام نسلوں کے رسول اور تمام زمانوں کے امام ہیں، اسلامی شریعت قانون سازی کا ایک معیاری نمونہ ہے، اس میں زندگی کے ساتھ چلنے اور اس کے صحیح مطالبات کا جواب دینے کی پوری صلاحیت ہے، ایمان و عقیدہ اور اخلاق وروحانی اقدار ہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ایک شریف سوسائٹی اور پاکیزہ تمدن کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے، نئی تہذیب کے پاس صرف ذرائع ووسائل ہیں، اخلاق و عقائد اور غایات و مقاصد کا سرچشمہ صرف انبیاء علیھم السلام کی تعلیمات ہیں، اور ایک متوازن اور صالح تمدن کا قیام

صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مقاصد و وسائل صحیح تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔

یہ صورت حال اور یہ وقت تھا، جب یورپ اپنے فلسفوں کا لشکر لے کر اسلامی دنیا پر حملہ آور ہوا۔ وہ فلسفے جس کی تدوین اور تراش و خراش بڑے بڑے فلاسفہ اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کی ذہنی کاوشوں کا ثمرہ تھی جنھوں نے ان پر ایسا علمی اور فلسفیانہ رنگ چڑھایا تھا کہ معلوم ہو یہ فکر انسانی کی معراج ہے، مطالعہ و تحقیق اور عقل انسانی کی پرواز اس پر ختم ہے، اور غور و فکر کا یہ وہ نچوڑ ہے، جس کے بعد کچھ اور سوچا نہیں جا سکتا، حالانکہ ان فلسفوں میں کچھ چیزیں وہ تھیں جو تجربات و مشاہدات پر مبنی تھیں، اور وہ صحیح تھیں، اور بہت سی چیزیں وہ تھیں جو محض ظن و تخمین اور مفروضات و تخیلات پر مبنی تھیں، گویا ان میں حق بھی تھا، اور باطل بھی، علم بھی تھا، اور جہل بھی، محکم حقائق بھی تھے، اور شاعرانہ تخیلات بھی۔۔ شاعری، یہ نہ سمجھئے کہ نظم و قافیہ بندی ہی میں منحصر ہے، یہ فلسفہ و علم کے میدان میں بھی ہوتی ہے، یہ فلسفے مغربی فاتحین کے جلو میں آئے اور مشرقی عقل و طبیعت نے فاتحین کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت بھی قبول کر لی، مشرق کے تعلیم یافتہ طبقے نے بڑھ کر ان کو قبول کر لیا، ان لوگوں میں وہ بھی تھے، جنھوں نے سمجھ کر قبول کیا تھا، مگر وہ کم تھے، زیادہ تر وہ تھے جو ذرا بھی نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس پر ایمان بالغیب رکھتے تھے، یہ سب ایک سرے سے مسحور تھے ان فلسفون پر ایمان لانا ہی عقل و خرد کا معیار بن گیا، اور اس کو روشن خیالوں کا شعار سمجھا جانے لگا۔

اس طرح یہ الحاد و ارتداد اسلامی ماحول اور اسلامی دائروں میں بغیر کسی شورش اور کش مکش کے پھیل گیا، نہ باپ اس انقلاب پر چونکے، نہ اساتذہ اور مربیوں کو خبر ہوئی، اور نہ غیرت ایمانی رکھنے والوں کو کوئی جنبش ہوئی اس لئے کہ یہ

ایک خاموش انقلاب تھا، اس الحاد وارتداد کو اختیار کرنے والے کسی کلیسا میں جاکر نہیں کھڑے ہوئے، نہ کسی معبد میں داخل ہوئے، نہ کسی بت کے آگے انھوں نے ڈنڈوت کی، اور نہ کسی استھان پر جاکر قربانی پیش کی، اگلے دور میں یہی سب علامات تھیں جن سے کفر وارتداد اور زندقہ کا علم ہوتا تھا،

نفاق والحاد

اگلے مرتدین اسلامی سوسائٹی کو خیرباد کہہ کر اس سوسائٹی سے منسلک ہو جایا کرتے تھے جس کا دین وہ قبول کرتے تھے، اور اپنے عقیدے کی تبدیلی کا صراحت اور جرأت کے ساتھ اعلان کر دیتے تھے، پھر جو کچھ نئے مذہب کی راہ میں انھیں برداشت کرنا پڑتا تھا، برداشت کرتے تھے، انھیں اس پر اصرار نہیں ہوتا تھا کہ پرانی سوسائٹی میں جو حقوق اور منافع انھیں حاصل تھے، ان کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سوسائٹی سے چپکے رہیں، لیکن آج جو لوگ دین اسلام سے اپنا تعلق منقطع کرتے ہیں، وہ اس پر تیار نہیں ہوتے کہ اسلامی سوسائٹی سے بھی اپنا رشتہ کاٹ لیں۔ حالانکہ دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ ہی تنہا وہ معاشرہ ہے جس کی تاسیس وترکیب عقیدہ کی بنیاد پر ہے اور مخصوص عقائد کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آتا، لیکن یہ نئے مرتدین اصرار کرتے ہیں کہ اس معاشرے کے نام پر فوائد حاصل کرتے ہوئے، اپنی جگہوں پر جمے ہیں اور اسلام کے بخشے ہوئے تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہیں، یہ ایک نرالی صورت حال ہے جس سے اسلام کی تاریخ کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

جاہلی عصبیت اور "مذہب قوم پرستی"

ان فلسفوں نے جہاں ایک طرف عقائد اور اخلاقی قدروں کو مجروح کیا

ہے، وہاں ان جاہلی جذبات واحساسات کی تخم ریزی بھی دنیائے اسلام میں کی ہے، جن سے اسلام نے کھل کر جنگ کی تھی، اور جن پر پیغمبر اسلامؐ نے پوری قوت سے چوٹ لگائی تھی، مثال کے طور پر عصبیت جاہلیہ کو لیجئے جو نسل ووطن یا قومیت کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، پھر اس کی اس قدر تقدیس کی جاتی ہے، اس طرح اس پر جان دی جاتی ہے، اور انسانی برادری کو اس کی بنیاد پر تقسیم کرنے میں اتنا غلو پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ (عصبیت) ایک مستقل عقیدہ اور ایک مستقل دین بن جاتی ہے، دل ودماغ پر اس طرح اس کا قبضہ ہو جاتا ہے کہ ساری زندگی کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے، یہ اپنی ہمہ گیری اپنی طاقت اور اپنے اثرات کی گہرائی اور مضبوطی کے لحاظ سے بلاشبہ دین ومذہب کی حریف ہے، اور اس کی گرفت انسان کی پوری زندگی پر ہوتی ہے، یہ جب کسی معاشرے پر چھا جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی کوشش اور کارناموں پر پانی پھر جاتا ہے، اور دین، عبادات اور چند رسوم ورواج کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جو پوری زندگی پر فرماں روائی کے لئے آیا تھا پھر اس کے نتیجہ میں عالم انسانیت چند متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اور وہ "**امتِ واحدہ**" جس کے متعلق پروردگار عالم کا ارشاد ہوا تھا "و إن هذه أمتكم أمة واحدة وأنا ربكم فاتقون۔ پارہ پارہ ہو کر بے شمار امتوں میں مٹ جاتی ہے۔

اسلام اس "عصبیت" سے کیوں برسرِ جنگ ہے؟

محمد ﷺ نے اس عصبیت جاہلیہ کے خلاف پوری شدت سے جنگ کی تھی، اس کے بارے میں اپنی امت کو صاف الفاظ میں آگاہی دی تھی، اور ہر اس بنیاد پر تیشہ چلایا تھا، جس سے یہ ابھر سکتی ہے، اور اس باب میں یہ رویہ ضروری بھی تھا، اس لئے کہ ان عصبیتوں کے ساتھ ایک عالمی دین کے قیام کا کوئی امکان نہیں تھا،

اور اُمت واحدہ کی وحدت چار دن بھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی، اس عصبیت کی مذمت اور اس کی تردید شریعتِ اسلامیہ میں ایک مسلم حقیقت ہے، بے شمار نصوص ہیں، جو

اس بات کو ظاہر کرتے ہیں، بلکہ اسلام کا عصبیت سے بُعد ایک بدیہی چیز ہے، جو شخص اسلام کے مزاج سے بلکہ مطلق دینی مزاج ہی سے واقف ہو گا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہ مزاج ان عصبیتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتا، سیاسی رجحانات وخیالات سے خالی الذہن ہو کر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نا ممکن ہے کہ بین الانسانی تفریق اور عالم انسانیت کی تباہی و تخریب میں جو عوامل کار فرما رہے ہیں، ان میں ان جاہلی عصبیتوں کا درجہ بہت اونچا ہے، پس قدرتی بات ہے کہ جو انسان اس لئے آیا ہو کہ پوری دنیا کو ایک اکائی بنائے، جو اس لئے آیا ہو کہ تمام نوعِ انسانی کو ایک جھنڈے کے نیچے اور ایک عقیدے پر جمع کرے، جو اس لئے آیا ہو کہ ایک نیا معاشرہ وجود میں لائے، جو دین ایمان برب العالمین کی بنیادوں پر استوار ہو، جو اس لئے آیا ہو کہ خار زارِ عالم میں امن و سلام کے پھولوں کی سیج بچھائے، جو اس لئے آیا ہو کہ انسانیت کے پورے خاندان کو محبت واُلفت کی ایک لڑی میں پروئے، جو اس لئے آیا ہو کہ انہیں باہم شیر و شکر کر کے اس طرح یک جان بنادے کہ ایک کو دکھ ہو تو دوسرا بھی تڑپے۔ اس مشن کے حامل انسان کے لئے تو بالکل قدرتی اور بالکل عقلی بات ہے کہ وہ ان نسلی، قومی اور عصبیتوں کے خلاف کھلا جنگ کرے، اور اس انتہائی حد تک ان کے خلاف لڑے کہ یہ قصۂ ماضی بن کر رہ جائیں

ممالکِ اسلامیہ میں "قوم پرستی" کی مقبولیت

لیکن یورپ کے سیاسی اور ثقافتی غلبہ کے بعد سے دنیائے اسلام کا جو محمد رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کے وجود سے وجود میں آئی، حال یہ ہے کہ انھیں عصبیتوں کو اپنے دل ودماغ میں جگہ دے رہی ہے، اور اس طرح انہیں مانے لے رہی ہے، جیسے کوئی علمی نظریہ اور کوئی حقیقتِ ثابتہ ہو، جس سے مفر نہ ہو، آج اس دنیائے اسلام کا حال یہ ہے کہ اس میں بسنے والی تمام قومیں حیرت انگیز حد تک ان عصبیتوں کو زندہ کرنے اور انکے گن گانے کی طرف راغب ہیں جنکو اسلام ہی نے موت کے آغوش میں سلایا تھا، حتی کہ ان قومی وجاہلی شعائر کے احیاء کا جذبہ بھی آج موجزن ہے، جو کھلی ہوئی بت پرستی کا مظہر ہیں، ان ملکوں میں اس عہدِ قبل اسلام کو سرمایۂ افتخار گردانا جا رہا ہے، جسے اسلام "**جاہلیت**" اور صرف جاہلیت کا نام دیتا ہے —— اور یہ وہ لفظ ہے، جس سے زیادہ وحشت اور تنفر انگیز کوئی دوسرا لفظ اسلام کی لغت میں موجود نہیں، جس سے نجات پانے کو، قرآن مسلمانوں پر احسان ٹھہراتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ مسلمان اس نعمت کا شکریہ ادا کریں وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (آل عمران آیت ۱۰۳) اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر، جبکہ تم تھے آپس میں دشمن پس الفت ڈالی اسنے تمہارے دلوں میں، سواب ہو گئے تم اسکے فضل سے بھائی بھائی، اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے، تو اس سے تم کو نجات دی

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (الحجرات ۱۷)

بلکہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اسنے راہ دی تم کو ایمان کی اگر سچ کہو۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى

النُوْرِ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (الحدید ۹)۔ وہی ہے جو اتارتا ہے اپنے بندے پر صاف آیتیں تاکہ نکال لائے تم کو اندھیروں سے اجالے میں اور اللہ تم پر نرمی کرنے والا مہربان ہے۔

دورِ ''جاہلیت'' کے بارے میں ایک مسلمان کا موقف

اسکے بعد تو ایک مومن کا حال یہ ہونا چاہئے کہ **''جاہلیت''** کا چاہے وہ قریب العہد ہو یا بعید العہد ہو، جب بھی ذکر زبان پر آئے حقارت و نفرت کے ساتھ آئے، اور ہر بُنِ مُو سے ناگواری کے جذبات ٹپکنے لگیں، آپ نے کسی قیدی کو دیکھا ہے کہ رہائی پانے کے بعد وہ اپنے دورِ قید و محن کو یاد کرے، اور اسکا رواں رواں ناگواری سے پھکنے نہ لگے؟ کیا کسی مہلک اور موذی مرض سے صحت پانے والے کو آپ نے دیکھا ہے کہ اسے اپنی بیماری کے ایام و احوال یاد آئیں، اور اسکا دل افسردہ اور رنگ متغیر نہ ہو؟ اور کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ رات کو ڈراؤنے اور پریشان کن خواب دیکھنے والا صبح کو ان خوابوں کو یاد کرے اور خدا کا شکر ادا نہ کرے کہ یہ محض اوہام و خیالات نکلے؟ پھر جب قیدی اپنے دور قید و محن کو خوشی سے یاد نہیں کرتا، جب صحت یافتہ مریض کے لئے اپنے ایام کرب کی یاد خوش گوار نہیں ہوتی اور جب برے خوابوں کو یاد کر کے شکر ہی ادا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ خواب بس خواب ہی رہے، تو جاہلیت تو ان سب سے بدتر شے ہے، جو جہل و ضلالت کے بدترین اقسام پر مشتمل ہے اور دنیا و آخرت کے کتنے ہی نقصانات اور خطرات اسمیں پنہاں ہیں، اس کی یاد پر سزاوار ہے کہ آدمی کو شدید سے شدید تر ناگواری ہو اور بے اختیار شکر ادا کرنے کو جی چاہے کہ دن بیت گئے، اور خدا نے اس تاریکی سے نجات دی اسی لئے تو حدیث صحیح میں آتا ہے:

ثلث من كن فيه وجد حلا وةالايمان ان يكون الله ورسوله احب اليه مما سوا هما وان يحب المرألا يحبه الا لله وان يكره ان يعود الى الكفر كما يكره ان يقذف فى النار(رواه البخارى)

تین باتیں ہیں، یہ جس میں پائی جائیں گی اسے ایمان کاذائقہ نصیب ہوگا، ایک یہ کہ اللہ ورسول ہر شے سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ آدمی اگر کسی سے محبت کرتا ہو تو صرف اللہ کے لئے کرتا ہو، تیسرے یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا اتنا شاق ہو جیسے کہ آگ میں ڈال دیا جانا۔

اور خداوند قدوس جاہلیت کے شعائر اور جاہلی رجال واکابر کی مذمت کرتے ہوئے بے لاگ اور بے رورعایت انداز میں فرماتا ہے :۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَايُنْصَرُوْنَ . وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِى هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ. (قصص. ٤١. ٤٢)

اور کیا ہم نے ان کو (اہل دوزخ کا) پیشوابنایا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف، نہ ملے گی کوئی مدد ان کو قیامت کے دن، اور پیچھے رکھ دی ہے ان کے ہم نے اس دنیا میں لعنت، اور قیامت کے دن ہو گی ان پر برائی۔

ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے :۔

وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ. يَقْدُمُ قَوْمَه يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ. وَاُتْبِعُوْا فِى هٰذِهِ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ. (هود٩٧. ٩٩) اور نہیں تھی بات فرعون کی کچھ نیک ڈھنگ کی، آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن، پھر پہنچادے گا ان کو آگ پر، برا گھاٹ ہے، جس پر پہنچے، پیچھے سے ملتی رہی اس دنیا میں لعنت اور دن قیامت کے بھی برا انعام جو ملا۔

ممالکِ اسلامیہ میں "دورِجاہلیت" کا اعزاز

لیکن بہت سے اسلامی ملکوں اور مسلمان قوموں کا حال اس وقت یہ ہے کہ وہ صرف مغربی فلسفوں اور اہل مغرب کے طرز فکر سے مرعوبیت کے ماتحت اپنے قبل اسلام کے عہد اور اس عہد کی تہذیب ورسوم کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، ان میں اس عہد سے دلی لگاؤ سا پیدا ہوتا جارہا ہے، ان میں خواہش پیدا ہورہی ہے کہ اس عہد کے شعائر کو زندہ کریں۔ اور اس کے مشاہیر بادشاہوں اور ناموروں کو تاریخ کی زندۂ جاوید ہستیوں میں جگہ دلادیں، گویا یہ ان کا کوئی زریں دور تھا، اور کوئی نعمت تھی، جو اسلام نے ان سے چھین لی۔۔۔ العیاذ باللہ! یہ کیسی کھلی ناشکری اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی ناقدری ہے۔۔۔! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کفر وبت پرستی کی شناعت دلوں سے نکل گئی ہے، اور جاہلی خرافات سے کوئی نفرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔۔۔ اور یہ وہ باتیں ہیں کہ ایک باشعور مسلمان کے متعلق ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ان پر تو ایمان اگر سلب ہوجائے، اسلام کی دولت سے محروم کردیا جائے، اور اللہ کی رحمت کے بجائے اس کا عتاب سامنے آجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔۔۔ قرآن نے آگاہ کیا ہے:۔

وَلَاتَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَاتُنْصَرُوْنَ (ھود ۱۱۳) اور مت میلان رکھو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کیا (شرک)، ورنہ کہیں تم کو بھی آگ نہ پکڑلے اور نہ نکلے اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی مددگار، پھر نہ ہوسکے تمہاری کوئی مدد۔

دینی واخلاقی انتشار

ان قوم پرستانہ رجحانات کے علاوہ ایک اور فتنہ بھی ہے، جس سے آج کا

عالم اسلام دوچار ہے، اور وہ ہے اونچے طبقوں میں آنکھیں بند کر کے مادیات کے پیچھے دوڑنے کا رجحان کہ ہر عقیدہ اور ہر قدر اسپر قربان، دوسرے الفاظ میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا رجحان، دنیاوی زندگی پر فریفتگی اور نفس پرستی کا رجحان، پھر اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا کرتا ہے، یعنی اخلاقی بے راہ روی، محرماتِ الٰہیہ کا استخفاف، فسق وشراب کا شیوہ و عموم، اور اسلامی فرائض وقیود سے اسطرح کلی آزادی، جیسے اس طبقہ کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، یا اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور وہ کوئی داستان پارینہ اور قصہ وافسانہ ہے، دنیائے اسلام کے تمام ملکوں کے اونچے طبقے کے افراد میں بڑی تعداد آپ کو اسی رنگ اور اسی مسلک کی ملے گی گویا ایک ہی تصویر ہے، جسکی مختلف کاپیاں کر دی گئی ہیں۔

عالم اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ

یہ ہے اجمال کے پیرائے میں آج کے عالم اسلام کی دینی اور اعتقادی تصویر اس تصویر میں جو کچھ نظر آتا ہے میرے نزدیک یہ جاہلیت کی ایک موج ہے جو اسلام کا سارا سرمایہ بہائے لئے جا رہی ہے، دنیائے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ سرکش موج سے سابقہ نہیں پڑا ہے نہ اس جیسی طاقت اور مخالف موج کا سامنا عالم اسلامی کو کبھی ہوا ہے، اور نہ اس جیسی ہمہ گیر موج کا، اور پھر اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسکی ہلاکت خیزیوں پر چونکنے والے کم، اور وہ تو کم سے بھی کم تر ہیں جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور اپنی ساری قوتوں کا سرمایہ لے کر اس کے مقابلہ پر ڈٹ گئے ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یونانی فلسفے کے اثر سے جو نہی الحاد وزندقہ پھیلنا شروع ہوا فوراً ایسی ہستیاں سامنے آکھڑی ہوئیں جنھوں نے اپنے علمی تبحرُ، عظیم عقلیت، نادرۂ روزگار ذکاوت اور قوی شخصیت کے سارے ہتھیاروں

سے اس کے خلاف جنگ کی، ایسے ہی باطنیت اور ملاحدہ کی جماعت کا ظہور ہوا تو اس کے مقابلے میں بھی علم و حکمت اور دلیل وبرہان کی تلواریں لے کر اسلام کے سر فروش میدان میں آکودے، چناچہ اسلام ان بروقت نصرتوں کی بناء پر علمی و عقلی اعتبار سے ایسی مضبوط پوزیشن میں رہا کہ مخالفت کی موجیں اٹھتیں اور سر ٹکرا کر واپس چلی جاتیں، سیلاب کے ریلے آتے اور بے اثر ہو کر گزر جاتے۔

اولین مسئلہ

عالم اسلام کا وہ مسئلہ جو طوفان بن کر کھڑا ہوا ہے، اور جس کا رخ براہِ راست دین کی طرف ہے، کفر وایمان کا یہی مسئلہ ہے، سوال یہ ہے کہ اسلامی دنیا اسلام پر قائم رہے گی یا اسکا قلادہ اپنی گردن سے اتار دے گی؟ اسلامی دنیا میں آج ایک معرکہ برپا ہے، جس میں ایک طرف مغرب کا فلسفہ لادینیت ہے، دوسری طرف اسلام خدا کا آخری پیغام! ایک طرف مادیت ہے، اور دوسری طرف آسمانی شریعت! میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین اور لادینیت کا آخری معرکہ ہے، اور اس کے بعد دنیا دونوں میں سے کسی ایک رخ کو اختیار کرلے گی۔

مقدّس ترین جہاد

آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصرِ حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے، جو عالم اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، نہیں! بلکہ آگے بڑھ کر اسکے قلب و مرکز پر حملہ کیا جائے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے اساس، عقائد، اس کے نظام و حقائق اور رسالتِ محمدی پر وہ اعتماد واپس لایا جائے، جسکا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس

فکری اضطراب اوران نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہونچایا جائے، جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے، اور اسکی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کردیا جائے، آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں، ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں!

کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے، شک والحاد، نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل ودماغ میں برپا کر رکھا ہے، غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہو رہا ہے، اور سیاست اور اعتقاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہو رہے ہیں، کامل ایک صدی سے اس شکست وریخت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن ہمیں اس کے مقابلے کی کوئی فکر نہیں ہوئی، ہم نے اس کی کوئی پروا نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق قدیم علمی ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح انکا پوسٹ مارٹم کریں، ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نظر ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے، گویا یکایک یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے، اور ایک ایسی نسل تیار ہو کر برسر اقتدار آچکی ہے، جو نہ اسلام کے عقائد ومبادی پر ایمان رکھتی ہے، نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت سے معمور ہے، اور نہ اس کا کوئی علاقہ اپنی مومن ومسلم قوم سے اس کے سوا ہے کہ قومیت کے خانے میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے، یا اگر کچھ تعلق ہے، تو

وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک !بس اسکے سوا کوئی تعلق نہیں !اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لا دینی مزاج اور لادینی اندازِ فکر،ادب و ثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہونچ چکا ہے،اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانے کی لادینیت کا خطرہ منڈلارہا ہے خاکم بدہن !وقت کی رفتار وہ وقت قریب لارہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے کہیں بے دخل کر کے نہ رکھ دیا جائے۔

دعوتِ ایمان

یہ وقت عالم اسلامی میں ایک نئی اسلامی دعوت کا متقاضی ہے،اس دعوت وجدو جہد کا نعرہ اور نشانہ ہو، آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں،لیکن تنہا نعرہ کافی نہیں ہے،اس میں پہلے وہ نفسیاتی راستہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے عالم اسلام کے موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ کے دل ودماغ تک پہنچا جا سکے اور اسے اسلام کی طرف لوٹایا جاسکے۔

بے غرض داعیوں کی ضرورت

آج عالم اسلام کو ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم ،اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال و متاع اس کے لئے وقف کردیں، کسی جاہ ومنصب یا عہدہ وحکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، کسی کے لئے ان کے دل میں کینہ و عداوت نہ ہو، فائدہ پہونچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں،ان کا طرز عمل سیاسی رہنماؤں کے طرز عمل سے ممتاز اور انکی دعوت وجدو جہد سیاسی تحریکات (جس کا مطمح نظر محض حصول اقتدار ہو تا ہے) مختلف اور جداگانہ ہو، اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی،

خود پسندی، اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز۔

دعوت کے لئے نئے اداروں کی ضرورت

اس پر اضافہ یہ کہ آج ایسے علمی ادارے Academies عالم اسلام کی بڑی اہم ضرورت ہیں جو ایسا طاقتور اسلامی ادب پیدا کریں جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام ۔۔۔ وسیع معنی میں اسلام ۔۔۔ کی طرف لا سکے جو انھیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنھیں ان میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر نے محض وقت کی ہوا سے متاثر ہو کر حرز جان بنا لیا ہے ۔۔۔ وہ ادب ۔۔۔ جو ان کے دماغوں میں ازسر نو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب و روح کی غذا بنے ۔۔۔ اس کام کے لئے عالم اسلام کے ہر گوشے میں آج ایسے ارباب عزیمت درکار ہیں، جو معرکے کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین و سیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں، جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فِٹ ہو جائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ۔ "الشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ"۔ کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں، اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں

ہوں، جنکا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اسوقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو، اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔

ماضی کے تجربے

٭ لیکن بات ترتیب اور تقدیم اور تاخیر کی ہے، دینی حکمت اور دینی تفقہ کی ہے، اور سوال حالات کے تقاضے کا ہے، اب تک ہماری کوششیں اور ہماری صلاحیتیں، ہمارے وسائل اور ہمارے اوقات سیاسی اور تنظیمی تحریکات کی نظر ہوتے رہے ہیں، اور یہ ساری جہدو حرکت اس مفروضے پر رہی کہ قوم میں پورا پورا ایمان ہے، اور قوم کی قیادت - جو لامحالہ تعلیم یافتہ طبقے ہی سے ہوتی ہے - وہ بھی پوری طرح مسلمان ہے، اسلام کے عقائد و مبادی پر اسکا ایمان ہے، اسلام کی سربلندی کے لئے اسکے دل میں جوش و جذبہ ہے، اور حدود و احکام کے نفاذ کے لئے بھی وہ تیار ہے، حالانکہ بات برعکس ہے، قوم کا حال یہ ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آچکا ہے، لیکن اس کا نہ ہمیں پتہ چلا نہ خود قوم کو شعور ہوا، تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور سیاست و اقتدار کے اثر سے بیشتر افراد میں عقیدہ گویا پگھل چکا ہے، بلکہ بہت سوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدے سے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں اور ان فلسفوں کے لائے ہوئے افکار و عقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان، ان کے لئے دنیا سے لڑ جانے کا جوش و ولولہ اور انکی نشر و اشاعت کا جنون یہ فکر کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی اور انکی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور یہ کوشش کہ پوری قوم کو اس لادینیت سے مانوس کیا جائے، یہ ہے اس طبقے کے بہت سے افراد کا ذہنی

حال، پھر عمل کے میدان میں بعض جلد باز ہیں، بعض تدریج کے قائل۔ بعض اس لادینی رجحان کو طاقت کے زور سے قوم پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں، اور بعض قوم کو اس شیشے میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں، مگر منزل سب کی ایک اور مقصد و ہدف سب کا واحد!

دینی طبقے کے دو متضاد گروہ

اس طبقے کے بارے میں ہمارا دینی طبقہ۔۔۔ بہ شرطیکہ یہ تعبیر درست بھی ہو، کیونکہ اسلام میں کوئی مخصوص دینی طبقہ اور پاپائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے، اپنے رویہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہے، ایک گروہ ہے جو اس سے برسرِ جنگ ہے، اس کی تکفیر کرتا ہے، اور اس کے سائے سے بھی دور رہنا پسند کرتا ہے، لیکن ان اسباب و علل کی جستجو سے بالکل مستغنی ہے، جنھوں نے اس طبقے میں لادینیت کا رجحان پیدا کیا، یہ گروہ اس کا قائل نہیں کہ اس طبقے سے اختلاط پیدا کیا جائے، دین اور رجال دین سے اس کی وحشت دور کی جائے، اگر کوئی ایمان و خیر کا ذرہ اس میں موجود ہے، تو اسے بڑھاوا دیا جائے، مؤثر اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اس کے اندر دینی افکار اتارے جائیں، اس کے جاہ و مال اور قوت و اقتدار سے استغنا دکھا کر اسلامی کردار کی عظمت کا نقش قائم کیا جائے، مخلصانہ اور حکیمانہ نصیحت کی جائے اور اس طرح اس کے احوال اور دل و دماغ کو بدلا جائے۔

دوسرا گروہ اس کی بالکل ضد ہے، وہ اس طبقے سے تعاون کرتا ہے، مال جاہ میں اس کا شریک بنتا ہے، اسکے ذریعہ اپنی دنیا بناتا ہے، اس کا دین سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، پس اس گروہ میں نہ کوئی دعوتی روح ہے، نہ دینی غیرت کا مظاہرہ، نہ یہاں اس بگڑے ہوئے طبقے کی اصلاح کی کوئی حرص و فکر پائی جاتی ہے، اور نہ اسے

اس قرب و تعاون میں کوئی پیغام ملتا ہے۔

اصلاح اور دینی انقلاب کے لئے جس گروہ کی ضرورت ہے

ایسا کوئی گروہ نہیں جو اس صورت حال پر درد مند ہو، جو یہ سمجھے کہ اونچا تعلیم یافتہ طبقہ مریض ہے مگر علاج کے لائق اور شفایابی کے قابل، اور پھر اس کے علاج کی فکر کرے، حکمت و نرمی کے ساتھ دین کی دعوت لے کر اس میں گھسے اور بے لوث نصیحت کا حق ادا کرے، ایسا کوئی تیسرا گروہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اس مغرب زدہ عنصر کو دین اور دینی ماحول سے قریب ہونے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اس کی ساری زندگی اس ماحول سے وحشت اور دوری میں کٹتی ہے، اور پھر اس بُعد و وحشت کو اہل دین کا گروہ اور بڑھا دیتا ہے، ایسے ہی وہ ایک گروہ بھی اس بُعد و وحشت میں اضافے کا سبب بنتا ہے، جو دین کے نام پر اس طبقے سے جاہ و منصب اور حکومت و سلطنت کے لیے جنگ کرتا ہے، یہ دونوں گروہ اس کے سوائے اس کے کچھ نہیں کرتے کہ اس طبقے کو دین سے خائف کریں، اور ایک بغض و عناد کی کیفیت پیدا کریں، انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ دنیا کا حریص ہے تو اس معاملے میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کر سکتا، اگر حکومت و سلطنت ہی اس کا مقصدِ زندگی ہے تو اس میدان کے حریف کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا، اور اگر بندۂ نفس اور خوگرِ عیش و عشرت ہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی کو سہیم و شریک بننے کی اجازت دے دے۔

عالمِ اسلامی کے درد کی دوا آج وہ گروہ ہے، جو خواہشات سے بلند اور داعیانہ بے غرضی کا پیکر ہو، ہر اس بات سے دامن بچائے جس سے وہم بھی ہو سکتا ہو کہ اسے دنیا کی طلب ہے، یا اس کا مطمح نظر اپنے لئے، اپنی پارٹی کے لئے یا اپنے خاندان

کے لئے حکومت واقتدار کا حصول ہے، وہ گروہ جو اس طبقے سے میل ملاقات کے ذریعہ، مراسلات اور گفتگو کے ذریعہ، دعوتی اسفار کے ذریعہ، پُر اثر اسلامی ادب کے ذریعہ، شخصی روابط کے ذریعہ، پاکیزگیِ کردار اور علوِ اخلاق کے ذریعہ، زُہد واستغنا اور پیغمبرانہ اخلاق کی پُر اثر نمائندگی کے ذریعہ ان نفسیاتی اور عقلی گرہوں کو کھول دے جو مغربی علوم نے پیدا کی ہوں یا دینی طبقے کی بے تدبیری سے پڑی ہوں، یا کم فہمی، کم نظری اور اسلام اور اس کے صحیح ماحول سے بُعد ان کا سبب ہوا ہو۔

اس طرز پر کام کرنے والوں کی کامیابی

یہی وہ گروہ ہے، جس سے ہر دور میں اسلام کی خدمت بن آئی ہے، اموی سلطنت کا رخ پھیر دینے اور تخت خلافت پر عمر بن عبدالعزیز کو لا بٹھانے کا سہرا اسی گروہ کے سر ہے، جس کی نمائندگی رجاء بن حیوہ نے کی، اور پھر ہندوستان میں مغل سلطنت میں اسی نوعیت کا انقلاب بھی اسی گروہ کا رہین منت ہے، اکبر جیسے طاقتور بادشاہ نے اسلام سے انحراف کر کے اور کھلی اسلام دشمنی پر کمر باندھ کے گویا یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس اسلامی برِ آعظم کو جو چار صدیاں اسلامی حکومت کے سائے میں گزار چکا تھا، پھر پرانی جاہلیت کے سانچے میں ڈھال دے، لیکن اس حکیمانہ دعوت اور ایک ایسے حکیم اور داعیٔ اسلام کے ظہور میں آنے کے طفیل، جس نے اسلام کے لئے خلوص اور اس کے تفقہ کا حق ادا کیا، اور اس کے جانشینوں کی کوششوں کے طفیل، یہ ملک اک بار اسلام کے ہاتھ سے نکل کر پھر اس کے ہاتھ میں آیا۔ اور پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ آیا۔ اکبر کے تخت پر پے در پے ایسے بادشاہ آئے جن میں سے ہر ایک اپنے پیش رو سے بہتر تھا، حتی کہ نوبت اورنگ زیب عالم گیر تک پہونچی، وہ اورنگ زیب جس کا ذکر تاریخِ اسلام اور تاریخِ اصلاح کا ایک زریں باب

ہے۔اور معلوم ہے کہ تاریخ ہمیشہ دہرائے جانے اور بار بار دہرائے جانے کے لئے تیار ہے، اسے کبھی اس عمل سے انکار نہیں ہوا بس بات صرف اس وقت کی رہی ہے، جو اس کا رخ پھیر سکے، اور اسلام کے تابندہ ادوار کو دُہرا کر لانے والی قوت صرف یہی دعوت اور یہی حکمت واخلاص ہے!

سنگین صورت حال

اس صورتِ حال کا ہمیں ہمت واستقلال اور حکمت ودانائی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے، دنیائے اسلام پر آج ایک دینی، فکری اور تہذیبی ارتداد کی سخت مصیبت آئی ہوئی ہے، یہ مصیبت ان تمام لوگوں کے غور وفکر کا موضوع بن جانی چاہئے جو اسلام کا درد رکھتے ہیں، آج ہر اسلامی ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے افراد کا حال یہ ہے کہ اعتقاد وایمان کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، اخلاقی بندشیں وہ توڑ کر پھینک چکے ہیں، انداز فکر ان کا سر تا سر مادی ہو چکا ہے، اور سیاست میں انہوں نے لادینیت کا نظریہ اپنالیا ہے، اگر ''**اکثر**'' کا لفظ بولتے ہوئے مجھے خوف بھی ہو تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں، جو اسلام پر ایک عقیدے اور ایک نظام کی طرح ایمان نہیں رکھتے، اور مسلمان عوام۔۔۔باوجودیکہ ان میں خیر وصلاح کے تمام جوہر موجود ہیں، اور وہ اپنی طبیعت سے انسانیت کا صالح ترین گروہ ہیں۔۔۔اس طبقے کی علمی بالاتری ذہنی تفوق اور اثر ونفوذ کی بناء پر اس کے ماتحت اور مطیع ہیں۔

اگر یہ صورت حال یونہی چلتی رہی تو یہ الحاد وفساد ان عوام میں بھی گھس کر رہے گا، دیہاتوں کے سادل دل مسلمان بھی اس کی لہروں سے نہ بچ سکیں گے اور کھیت اور کارخانوں کے مزدوروں کا بھی دین وایمان یہ پلٹ کر کے چھوڑے گا، یہ

سب کچھ اسی رفتار اور انداز سے یورپ میں ہو چکا ہے، اور اگر حالات کا رخ اور رفتار یہی رہی، اور اللہ کا ارادۂ قاہرہ بیچ میں حائل نہ ہو گیا تو مشرق میں بھی یہی سب کچھ ہونے جارہا ہے۔

کام کی فوری ضرورت

اس فریضے کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کا موقع نہیں ہے، دنیائے اسلام کو ارتداد کی بڑی زبردست لہر کا سامنا ہے، ایسی لہر جو اس کے عزیز ترین طبقوں اور بہترین حصوں میں پھیل چکی ہے، یہ اس عقیدے، اس نظامِ اخلاق اور ان اقدار کے خلاف بغاوت ہے، جو دنیائے اسلام کی سب سے برتر متاع ہے، اگر یہ دولت ضائع ہو گئی، جو رسول کا ترکہ ہے، جسے نسلوں پر نسلیں منتقل کرتی ہوئی لائی ہیں، اور جس کی راہ میں اسلام کے جانبازوں نے مصائب کے کتنے ہی پہاڑ اٹھائے ہیں، تو سمجھ لیجئے کہ عالمِ اسلام بھی گیا۔

کیا ہم اس حقیقت اور وقت کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے؟

(عربی سے ترجمہ ــــــــــ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

اسلامیات

اور

مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مقالہ ۲۱؍ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین اعظم گڑھ میں "اسلام اور مستشرقین" کے عنوان پر منعقدہ ایک اہم کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

اور

مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین

فیصلہ کرنے اور حکم لگانے کے سلسلہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات

تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے (جو علم کی قدر و قیمت، بحث و تحقیق کے میدان کی محنتوں اور کاوشوں اور صحیح علمی نتائج تک پہونچنے کی راہ کی دشواریوں سے بخوبی واقف ہیں) سب سے مشکل کام یہ ہے کہ علم و تحقیق کا کام کرنے والی کسی جماعت یا فرد کے بارے میں غیر منصفانہ سخت اور بے لچک رویہ اختیار کیا جائے، اس کی حق تلفی کی جائے، اور اس کے تمام محاسن و خصائص کا یک قلم انکار کر دیا جائے، اور سب کو ایک ہی پیمانہ سے ناپا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ اہل علم اور بحث و تحقیق کا سنجیدہ و مخلصانہ کام کرنے والوں کا طبقہ ہمیشہ دوسرے ہم پیشہ اور ہم مذاق لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ فراخ دل، وسیع النظر اور دوسروں کی محنت و کاوش کا اعتراف کرنے میں عالی حوصلہ

ہوتا ہے، وہ نہ صرف اپنے پیشرووں، بلکہ خورد سال معاصرین اور ''تازہ واردان بساط علم'' کی علمی کاوشوں اور نتائج تحقیقات سے بھی استفادہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا، غیر منصفانہ فیصلہ، کسی کے محاسن و کمالات کا انکار، قرآنی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کے سراسر منافی ہے۔

قرآن کی آیت ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُکُمۡ اَن تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَن تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ .اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا. سورۂ النساء. ۵۸) خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا :۔

یٰاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا. اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی. (سورۂ المائدہ.۸) اے ایمان والو ! خدا کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو، اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔

ایک جگہ اور ارشاد ہے :۔

وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ . (سورۂ الرحمن.۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔

اس لئے اگر کسی علمی کام، کسی اسکالر کے ریسرچ و تحقیق پر تبصرہ کرنا، اور

اس سے اختلاف رائے کا اظہار، یا اس کی تردید و تغلیظ، یا بعض غلطیوں کی نشاندہی ضروری ہو تو علم و تحقیق کا تقاضہ ہے کہ اس کے لئے علمی اسلوب، اور متوازن تنقید کا طریقہ اختیار کیا جائے، اس تبصرہ اور جائزہ میں تنقیدی عنصر کا تناسب صحیح اور معتدل ہو، کیونکہ ضرورت کو (جیسا کہ فقہائے اسلام کہتے ہیں) بقدر ضرورت ہی پورا کرنا چاہئے۔

مستشرقین کی علمی کاوشوں کا اعتراف

اس حقیقت کا اعتراف ایک صاحبِ علم کا علمی و اخلاقی فرض ہے کہ متعدد مستشرقین نے اسلامی علوم کے مطالعہ میں اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں کا فیاضانہ استعمال کیا، انہوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، ان میں سے بہت سے فضلاء مشرقی اور اسلامی علوم کا موضوع، سیاسی، اقتصادی، اور مشنری اغراض و مقاصد کے ماتحت نہیں، بلکہ محض شوق علم اور جذبۂ بحث و تحقیق کی خاطر اختیار کیا، اور اس کام میں خاصی جگر کاوی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا، یہ ہٹ دھرمی اور ناانصافی ہوگی، کہ ان کے اس پہلو کا اظہار و اعتراف نہ کیا جائے، ان کی کوششوں سے بہت سے نادر اسلامی مخطوطات، جو صدیوں سے سورج کی روشنی سے محروم تھے، نشر و اشاعت سے آشنا ہوئے، اور نادان و نااہل وارثوں کی غفلت اور کرم خوردگی سے بچ گئے، کتنے علمی مآخذ، اور اہم تاریخی دستاویزیں، اور اول انہیں کی کوششوں اور علمی دلچسپی اور شغف کے نتیجہ میں منظر عام پر آئیں، جن سے مشرقی دنیا کے علماء و محققین کی آنکھیں روشن ہوئیں، اور ان کا علم و تحقیق کا کام آگے بڑھا۔

ان سب مستشرقین کے ناموں اور کاموں کا احاطہ تو اس مقالہ میں ممکن

نہیں، جن کا علمی دنیا پر احسان ہے، محض مثال کے طور پر مندرجہ ذیل حضرات کا نام لیا جاسکتا ہے، پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (T.W. ARNOLD) جن کی قابل قدر کتاب (THE PREACHING OF ISLAM) (دعوت اسلام) ہے، اسٹینلی پول (STANLEY LANE-POOLE) جن کی کتاب (SALA-DIN) (سلطان صلاح الدین ایوبی) اور (MOORS IN SPAIN) (عرب اندلس میں) بڑی حد تک منصفانہ تصنیفات ہیں، ڈاکٹر اسپرنگر (DR. ALOYS SPRENGER) جنہوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب "**الاصابة فی تمییز الصحابة**" مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کو ایڈٹ کیا، اور اس پر انگریزی میں فاضلانہ مقدمہ لکھا، اڈورڈ لین (EDWARD WILLIAM LANE) جو اس عربی وانگریزی ڈکشنری کے مرتب ہیں، جو (ARABIC ENGLISH LEXICON) کے نام سے مشہور ہے، اور انگریزی زبان میں عربی مفردات کی تفصیلی شرح پر قابل اعتماد مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس سے خود عربی زبان اور عربی نحو کے ماہرین فائدہ اٹھاتے ہیں، اے۔جے ونسنک (A.J. WENSINCK) جنہوں نے أئمہ محدثین کی حدیث وسیرت ومغازی پر مشتمل چودہ کتابوں (۱) سے تخریج احادیث کے لئے بڑا ہی مفصل انڈکس تیار کیا ہے، اور علمی وفقہی عنوانات، اسماء اور سیرت کی بعض ذیلی سرخیوں پر اس کو ترتیب دیا ہے، پھر ان عنوانات کو حروف تہجی پر مرتب کیا ہے، مشہور مصری عالم استاذ فواد عبد الباقی نے اس کتاب کو عربی میں منتقل کیا ہے، اور اس کا نام "**مفتاح کنوز السنه**" رکھا ہے، علامہ سید رشید رضا مصری اور علامہ احمد محمد شاکر نے اس پر بڑے فاضلانہ اور اعتراف وتشکر آمیز

مقدمے لکھے ہیں، اسی طرح مستشرق ونسنک نے **المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی** (احادیث نبوی کے الفاظ کی ڈکشنری (۲)) کی ترتیب میں بھی نگرانی کا کام انجام دیا ہے، جس کی ترتیب وتالیف میں کئی مستشرق علماء و محققین شریک ہیں، اور اس کو ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا، مذکورالصدر کتاب کے مقابلہ میں اس کتاب سے استفادہ زیادہ آسان ہے، یہ سات بڑی جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جی۔بی اسٹرنج(G.B. STRENGE)اوران کی کتاب (LANDS OF THE EASTERN CALIPHATE) (جغرافیہ خلافت مشرقیہ) بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔

یہ تمام تصنیفات اور علمی و تحقیقی کوششیں (۳) اس بات کی دلیل ہیں کہ ان مصنفین ومرتبین نے جدوجہد میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور اس طویل جاں گسل مطالعہ اور کاوش بحث و تحقیق میں اپنے موضوع کے ساتھ خلوص وانہماک کا پورا ثبوت دیا ہے۔

اکثر مستشرقین کی تصنیفات میں کمزوریوں کی جستجو اور خوردہ گیری اور ریزہ چینی کی کوشش

لیکن مستشرقین کے علم وفضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس موقر علمی مجلس میں اس حقیقت کی وضاحت کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت، مسلمانوں کی تاریخ، اور تہذیب وتمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کریں، اور سیاسی و مذہبی اغراض کی خاطر رائی کا پربت بنائیں، اس سلسلہ میں ان کا رول بالکل اس شخص کی طرح رہا ہے، جس کو ایک منظم وخوشنما وخوش منظر

شہر میں صرف سیور لائنز، نالیاں، گندگی اور گھورے نظر آئیں، جس طرح محکمۂ صفائی کے انچارج (DRAIN INSPECTOR) کا کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی میں فریضۂ منصبی ہوتا ہے کہ اس طرح کی رپورٹ پیش کرے، وہ متعلقہ ڈپارٹمنٹ کو جو رپورٹ پیش کرتا ہے، اس میں طبعی طور پر قارئین کو سوائے گندگیوں اور کوڑے کرکٹ کے تذکرہ کے عام طور پر کچھ نہیں ملتا۔

افسوس کی بات ہے کہ ہم بہت سے مستشرقین کو یہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہ اپنی ساری کدوکاوش، تاریخ اسلام، اسلامی معاشرہ تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت میں جھول اور کمزوریوں کی تلاش و نشاندہی میں صرف کرتے ہیں، پھر ہولناک اور ڈرامائی انداز میں ان کو پیش کرتے ہیں، وہ خوردبین (MICRO-SCOPE) سے ان کا پتہ لگا کر اپنے قارئین کے سامنے ذرہ کو پہاڑ اور قطرہ کو دریا بنا کر پیش کرتے ہیں، ان کی ذہانت وطباعی کا پورا مظاہرہ چہرۂ اسلام کو بد نما دکھانے میں ہوتا ہے، اور اس طرح اسلامی ممالک کے زعماء و قائدین کے (جنہوں نے یوروپ کی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی، یا اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کیا ہے) دل و دماغ میں اسلام اور اسلامی قانون و تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں، اور اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا سارا جوش و خروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے (MODERNISA-TION) اور اسلامی قانون میں اصلاح و ترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہو کر رہ جاتا ہے۔

نازک مستشرقانہ حکمت عملی

بہت سے مستشرقین کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے ایک مقصد متعین کر لیتے ہیں، پھر ہر ممکن طریقہ سے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ رطب ویابس معلومات (جن کا بعض اوقات موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا) دینی، تاریخی اور ادبی کتابوں بلکہ شعروشاعری، قصوں کہانیوں، مسخروں کی خوش گپیوں اور طنز نگاروں کی نگارشات سے (خواہ وہ کتنی ہی سطحی اور بیہودہ ہوں) معلومات اخذ کرتے ہیں، پھر مکمل فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بنیاد پر ایسے علمی نظریات قائم کرتے ہیں، جن کا ان کے ذہن ودماغ کے علاوہ کہیں وجود نہیں پایا جاتا، اکثر ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کی کسی محبوب و معظم شخصیت کی کسی ایک کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں اور قارئین کے دلوں میں اس کی جگہ بنانے کے لئے دس پندرہ فضائل ومحاسن (جن کی صحیفۂ اخلاق میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی) بڑی دریادلی سے ذکر کر جاتے ہیں، نتیجۃً قاری ان کی کشادہ دلی اور سیر چشمی سے مرعوب اور ان کی انصاف پسندی سے متاثر ہو جاتا ہے، اور اس کمزوری کو (جو تمام فضائل ومحاسن پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کر لیتا ہے، یہ مستشرقین کسی دعوت وشخصیت کے ماحول، تاریخ اور طبعی اسباب ومحرکات کی ایسی مہارت اور چابک دستی سے تصویر کشی کرتے ہیں کہ یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے، کہ یہ دعوت یا شخصیت دراصل اسی ماحول اور انہیں محرکات کا قدرتی نتیجہ اور انکا طبعی ردعمل تھا، اور گویا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے لئے تیار تھا، اس شخصیت نے صحیح وقت پہچان لیا، ایک چنگاری دکھائی اور وہ پھٹ پڑا، اس لئے قاری کا ذہن کسی غیر مادی سرچشمہ یا طاقت کی طرف جانے نہیں پاتا، اور اس شخصیت یا دعوت کی عظمت یا اس کے ساتھ تائید الٰہی اور ارادۂ غیبی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ (۴)

ان میں سے بہت سے مستشرقین اپنی کتابوں اور مضامین میں زہر کی ایک خاص مقدار بہت احتیاط سے ملاتے ہیں، جو تناسب سے بڑھنے نہیں پائے اور قارئین کے لئے وحشت کاباعث نہ بنے، اور انکو بیدار اور محتاط نہ بنادے، نیز "**محقق علام**" کی انصاف پسندی اور خلوص نیت مشتبہ نہ کردے، اس طرح کے مستشرقین کی تصنیفات ان مخالف مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ ضرررساں اور خطرناک ہوتی ہیں، جو کھل کر دشمنی کا اظہار کرتے ہیں، اور جن کی کتابوں میں دجل وفریب وافتراپردازی، عریاں طریقہ پر نظر آتی ہے، کیونکہ مذکورۃ الصدر کتابوں کا مطالعہ کرنے والا، متوسط درجہ کا کتاب خواں، ان کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مشرقی جامعات اور علمی حلقوں کا مستشرقین کی کتابوں کو علمی مآخذ سمجھنا

عالم اسلام اور ممالک عربیہ کی علمی کمزوری، پست ہمتی اور بے مائیگی کی یہ کھلی دلیل ہے کہ یہ ممالک، ایک طویل زمانہ سے خالص اسلامی موضوعات پر مستشرقین کی کتابوں کو ماخذ ومرجع سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک ان کی یہ محققانہ کتابیں "کتاب مقدس" (GOSPELL) کی حیثیت رکھتی ہیں، مثال کے طور پر آر، اے نکلسن (R.A. NICHOLSON) کی کتاب (A LITERARY HISTORY OF ARABS) (تاریخ ادبیات عرب) ڈاکٹر ہٹی (DR. P.K. HITTI) کی کتاب (HISTORY OF THE ARABS) (تاریخ عرب) کارل بروکلمان (CARL BROCKLEMANN) کی جرمن زبان میں کتاب (CESCHT IRDER ARABICHEN LI-

(THE HIS-اوراس کاانگریزی ترجمہ (تاریخ عربی ادبیات) TERATURE)
TORY OF ARAB LITERATURE) جو عربی ثقافت وفنون پر
مشتمل ہے(۵)، گولڈزیہر (GOLDZIHER) کی کتاب -INTRODUC
TION TO ISLAMIC THEOLOGY AND LAW (اسلامی
عقیدہ وشریعت کا تعارف) اور -MOHAMMED NISCHE STUDI
EN HALLE (مطالعہ اسلامیات) شاخت (SCHACHT) کی کتاب
THE ORIGINS OF MOHAMMADAN JURISPRU-
DENCE (فقہ اسلامی کے ابتدائی مآخذ) اور ڈبلیو، سی اسمتھ (.W.C
SMITH) کی کتاب ISLAM IN MODREN HISTORY (اسلام
جدید دنیامیں) اور اے، آرگب (A.R. GIBB) کی کتاب -WHITHER IS
LAM (اسلام کا رُخ کس طرف ہے ؟) مونٹگمری واٹ -MONTGOM)
ERY WATT) کی تصنیفات MOHAMMAD IN MECCA (محمدؐ مکہ
میں) MOHAMMAD IN MEDINA (محمدؐ مدینہ میں) اور -MOHAM
MAD PROPHET AND STATESMAN (محمدؐ بحیثیت نبی اور
سیاستدان)۔

ان سب کتابوں کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ منفرد تصنیفات ہیں، اسلامی مشرق کی یونیورسٹیوں کے عربی زبان وادب اور اسلامیات کے شعبوں میں ان کو اہم علمی مآخذ گردانا جاتا ہے، اور تصنیف وتالیف کا کام کرنے والے زیادہ تر ان ہی پر اعتماد کرتے ہیں، اسلامی انسائیکلوپیڈیا -ENCY
CLOPAEDIA OF ISLAM جس کی تالیف کا کام مستشرقین کے ہاتھوں

انجام پایا ہے، (اگرچہ اس میں بعض مسلمان مقالہ نگاروں کا بھی کچھ حصہ ہے) اور جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ اسلامی حقائق و معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے قیمتی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، اور بعض عرب اور مسلمان ملکوں کے علمی حلقوں میں اس کو اسلام سے متعلق معلومات کا اساسی اور بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے، مصر میں عرصۂ دراز سے اس کا لفظی ترجمہ شائع ہو رہا ہے، حالانکہ مصر جیسے ملک سے اس کی توقع تھی کہ وہ مسلمان محققین اور اسلامی موضوعات پر اصحاب اختصاص مسلمانوں کے قلم سے مستقل اسلامی انسائیکلو پیڈیا یا دائرۃ المعارف الاسلامیہ پیش کرتا ہے۔(۶)

بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں عالم اسلام کے خود کفیل ہونے کی ضرورت

مستشرقین کے منفی اثرات کے ازالہ اور اس عظیم نقص کی اصلاح کے لئے علمائے اسلام محققین و مفکرین اور مسلمان ریسرچ اسکالر کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی موضوعات پر محققانہ اور "**اوریجنل**" تخلیقیں تیار کریں، اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل اعتماد معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات اور حقائق سے (ان خوبی اور امتیازات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مستشرقین کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں) روشناس کریں، بلکہ علمی اسلوب واصول بحث، مجتہدانہ تحقیق و دقتِ نظر، وسعت مطالعہ، مآخذ و مراجع کی صحت واستناد اور پر زور استدلال واستنتاج میں ان پر بھی فوقیت لے جائیں، اور ان غلطیوں اور علمی کمزوریوں سے بھی محفوظ ہوں، جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں۔

مستشرقین کی علمی تحقیقات کا محاسبہ وجائزہ

یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان علماء و محققین مستشرقین کی تصنیفات و علمی تحقیقات کا جائزہ لیں اور حقائق و واقعات کی روشنی میں ان کا علمی محاسبہ کریں، ان کی دسیسہ کاریوں اور عربی عبارتوں کے مفہوم سمجھنے یا ان کی تحلیل و تشریح میں ان غلطیوں کی نشاندہی کریں جس سے قارئین کو یہ معلوم ہو کہ جن مراجع و مآخذ پر وہ اعتماد کرتے ہیں، وہ ناقابل اعتماد ہیں، انہوں نے ان سے جو اہم نتائج نکالے ہیں، اور ان پر اپنے دعوے کی پوری عمارتیں قائم کرلی ہیں، ان کی بنیاد ہی کمزور، مشکوک یا سرے سے معدوم ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائیں کہ ان کی ان معصومانہ علمی کاوشوں میں سیاسی و مذہبی (مشنری) اغراض و مقاصد کہاں تک کام کر رہے ہیں۔ (۷)

مثبت اور تعمیری کام کی ضرورت

لیکن صرف یہ ناقدانہ اور سلبی کام کافی نہیں ہے، مثبت اور تعمیری کام بھی ناگزیر ہے، اس کی فوری ضرورت ہے کہ اسلامی موضوعات پر عمیق و فکر انگیز معلومات اور محققانہ علمی کام کا سلسلہ جاری رہے جو تحلیل و تجزیہ، مآخذ و مراجع کے دیانتدارانہ حوالہ اور مفید و متنوع تفصیلی انڈکس سے (جو مستشرقین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) معمور ہو، اس سلسلہ میں ایسے مواد اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے، جن کی طرف بادی النظر میں ذہن نہیں جاتا، اور جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا اور نہ روایتی طور پر وہ تاریخ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، جو عام طور پر سرکار دربار، حرب و ضرب اور سیاسی حوادث و واقعات کے گرد گردش کرتی ہیں، اس جدید مواد اور ایسے مفید مآخذ کی (بہت سا علمی کام ہو جانے کے باوجود) اب بھی کمی نہیں، جو ایک محنت کش، دیدہ ور، علم کی سچی پیاس رکھنے

والے عالم و محقق کے منتظر ہیں، آج بھی ہاتف غیبی کی صدا کانوں میں آتی ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ دررگ تاک است

ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے خالص علمی اور تحقیقی کاموں میں بے جا تطویل و عبارت آرائی سے گریز کیا جائے، اور حتی الامکان طنز و تضحیک اور مفروضات کے قائم کرنے سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ اس طریقۂ کار (طنز و تضحیک) سے بحث و تحقیق کا علمی وقار اور تحقیقی وزن جاتا رہتا ہے۔

جب تک یہ دونوں کام نہ انجام دیئے جائیں گے، اس وقت تک عالمِ اسلام کا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں پر مشتمل ہے، اور جو یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہا ہے، یا خود اپنے ملک میں اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کرنے کا عادی ہے، مستشرقین کے مسموم افکار اور ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

زندگی کے کسی گوشہ میں بھی خلا زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا، یہ خدا کے تکوینی قوانین اور فطرتِ بشری کے منافی ہے، کیونکہ حاجتمند اگر صحیح ذریعہ سے اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو غلط اور مناسب طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب تک مستشرقین اور مغربی مفکرین کی (اسلامیات کے میدان تک میں) فکری قیادت اور علمی رہنمائی کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک عالم اسلام عقلی و ذہنی انتشار اور فکری ارتداد کی آندھیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، تجدد و مغربیت کے داعی و علمبردار، مغرب کے افکار و خیالات کے نقیب و ترجمان بنتے رہیں گے، اور جب ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گا تو وہ بزورِ حکومت اور قانون سازی

کے ذریعہ وہ "**اصلاحات**" نافذ کریں گے جو اسلام پر تیشہ زنی کے مرادف ہوں گی، وہ ایسے معاشرہ کو تشکیل دیں گے جو قدیم اسلامی معاشرہ سے صرف رنگ ونسل کی مشابہت رکھتا ہوگا، ورنہ وہ حقیقتاً غیر اسلامی معاشرہ اور واقعاتی دنیا میں کلیتہً ایک مغربی اور مادّی معاشرہ ہوگا، اس وقت اس کے داعیوں اور نقیبوں اور رہروؤں کو مخاطب کر کے عارف شیرازی کے الفاظ میں یہ کہنا صحیح ہوگا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

بحث وتحقیق کے میدان میں عالم اسلام کی کوششوں کاایک اجمالی جائزہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امید پوری ہوئی یا نہیں؟ کیا مسلمان مصنفین اور محققین نے عالمی اثر و نفوذ رکھنے والی مغربی زبانوں میں بحث و تحقیق کی مطلوبہ خدمات انجام دے کر اپنا علمی ودینی فریضہ ادا کیا؟ ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ اجمالی جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ مسلمان اہل علم اور اہل تحقیق کتنی منزلیں اب تک سر کر چکے ہیں، اور وہ کہاں تک اپنی اسلامی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے، مندرجہ ذیل سطور میں اس سلسلہ میں ہونے والے کاموں کاایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

باخبر قارئین اس سے ناواقف نہیں کہ عالم اسلام کو اور خاص طور پر اس کے چار اہم ممالک ترکی، مصر، ایران وہندوستان کو انیسوی صدی عیسوی کے وسط سے مغربی تہذیب وتمدن، علوم وفنون، افکار واقدار کا براہ راست سامنا کرنا پڑا، یہ صورت حال اس بات کی متقاضی اور طالب تھی کہ ترقی یافتہ اور عالمگیر مغربی زبانوں

میں (کم سے کم ان ملکوں میں جن کا مغربی تہذیب اور فلسفہ سے رُودر رُو مقابلہ تھا) زیادہ سے زیادہ کم ہوا ہوتا، اور اسلامی عقائد و اصول، تہذیب و تمدن، قانون، علوم و فنون، مثالی اسلامی ادوار کی تاریخ، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے عہد، اسلامی معاشیات اور اسلام کے اخلاقی فلسفہ کی وضاحت کے لئے اعلیٰ معیار کی کتابیں اور محققانہ بحثیں منظر عام پر آتیں، یہ بھی توقع تھی کہ یہ ممالک کم از کم انگریزی، فرنچ، جرمن اور ڈچ (۸) زبان کو بحث و تحقیق مغربی تہذیب پر تنقید، اس کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کا ذریعہ بنائیں گے، اور ان ممالک کے مسلمان فضلاء و اہل قلم ان زبانوں میں اپنی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے، اور تھوڑی مدت میں ایک ایسا وسیع کتب خانہ تیار ہو جائے گا، جو مسلمان نوجوانوں میں اسلام کی صلاحیت حیات اور اس کے زندگی کے ہر میدان میں خود کفیل ہونے پر اعتماد بحال کرے گا، اور یوروپ و امریکا کے تعلیم یافتہ طبقہ، مغربی مفکرین کو اگر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کر سکا تو کم از کم اسلام کے سنجیدہ مطالعہ پر ضرور آمادہ کر دیگا، اور اسلامی تحقیقی مقالوں اور لسانی و ادبی تحقیقات کا ایسا سیل جرار وجود میں آئے گا جس کی طاقتور موجیں یورپ و امریکا اور کناڈا کی عالمی اور مشہور یونیورسٹیوں کی دیواروں سے ٹکرائیں گی۔

اس کی بھی توقع تھی کہ ان مغربی زبانوں میں مہارت رکھنے والے فرزندانِ اسلام اپنی یونیورسٹیوں کو تاریخ اسلام، قوانین اسلامی اور مشرقی ادبیات اور تنقید و تاریخ میں اس طرح سے بے نیاز کر دیں گے کہ پھر ممالک عربیہ یا ایران کی ادبی و سیاسی و تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو کسی نکلسن (NICHOL-SON) کسی براؤن (BROWNE) کسی ہٹی (HITTI) پر اعتماد نہ کرنا پڑے گا،

اس طرح اسلامی شریعت اور تدوین حدیث وفقہ کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے کسی گولڈ زیہر (GOLZIHER) اور کسی شاخت (SCHACHT) پر عربی زبان وادب اور شعر جاہلی کے مطالعہ کے لئے کسی مارگولیتھ (MORGOLIOTH) پر انحصار نہ کرنا پڑے گا۔

یہ تحقیقی کام نہ صرف اس فکری ارتداد کی روک تھام کے لئے سد سکندری ثابت ہوگا، جو ذہین تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بہائے لئے جارہا ہے، اور جوان ممالک میں جو مغربی سامراج کے آہنی پنجہ میں گرفتار رہ چکے ہیں، جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا ہے، بلکہ مغرب میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے بھی مفید ومددگار ثابت ہوگا، پھر مشیت الٰہی جس کو سعادت کا پروانہ دینا چاہے گی، وہ اسلام کے **"چشمہ حیواں"** کی طرف کشاں کشاں آئے گا۔

مغربی زبانوں میں تحقیقی وعلمی کام کی کمی

اس کے پورے اسباب و قرائن پائے جاتے تھے، کہ عالم اسلام میں بحث و تحقیق اور اسلامی موضوعات پر مغربی زبانوں میں تصنیف و تالیف کا ایک نیا دور شروع ہوگا، اور ایسی تصنیفات عالم وجود میں آئیں گی، جن کی زبان وادب کی چاشنی، اسلوب نگارش، قوت استدلال، اور فنی مہارت سے فضلائے مغرب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

لیکن یہ ایک افسوسناک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور یہ اندازہ صحیح نہیں نکلا، ایک حقیقت پسند مورخ اس موقعہ پر مایوسی اور استعجاب کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسلم اور عرب ممالک میں ہندوستان کا امتیاز

ان ممالک میں جو اسلامی و مغربی تہذیبوں اور فلسفوں کی آویزش کا میدان تھے، ہندوستان کو یہ امتیاز و فخر حاصل ہے کہ اس سلسلہ کا سب سے بڑا کام اس کی سرزمین پر انجام پایا، یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ وہ براہ راست برطانیہ کے زیر اقتدار تھا، جو مغربی تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا نمائندہ اور سب سے پرجوش داعی تھا، اور اس کی غلامی کی مدت پر پوری ایک صدی گذر گئی، نیز اس کا مغربی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ (M.A.O.) کالج، علی گڑھ، عرصہ تک تجربہ کار انگریز فضلاء کے زیر اثر اور ان کی رہنمائی میں رہا۔

لیکن اس سب کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کا دینی شعور اور ان کی غیرت اسلامی دوسرے مسلم و عرب ممالک کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں اور فعال رہی۔(۹)

ہندوستانی مسلمانوں کا اس میدان میں حصہ اگرچہ ضرورت و زمانہ کے رقبہ کے لحاظ سے کم لیکن دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں زیادہ ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

علمی بنیادوں پر عیسائیت کی تنقید کا کام

اسی دینی غیرت و حمیت کا جو ہندوستانی مسلم قوم کا طرۂ امتیاز رہا ہے، یہ نتیجہ ہے کہ مسیحیت کے رد اور عہد قدیم و عہد جدید تورات و انجیل پر فاضلانہ تنقید کے سلسلہ کی سب سے اہم اور وقیع کتابیں اسی ملک میں مرتب ہوئیں، ہندوستانی مسلم قوم نے مشنری چیلنج کا دوبدو مقابلہ کیا، اور اس رزمگاہ میں (ان نازک حالات (۱۰) کے باوجود جن سے کسی دوسرے مسلم ملک کو واسطہ نہیں پڑا تھا) سب سے پہلے قدم رکھا۔

اس اقدامی (نہ کہ دفاعی) تحریک کی قیادت وسربراہی کے لئے اللہ نے ایسے باصلاحیت افراد پیدا فرمائے، جنھوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں ان میں سر فہرست مجاہدِ وقت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۳۳ھ-۱۳۰۸ھ) کی شخصیت ہے۔ جن کے اندر اس عظیم کام کے انجام دینے کے لئے (انگریزی زبان سے براہ راست واقفیت کے ماسوا) تمام علمی مناظرانہ اور خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، اس کمی کو پورا کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک غیر تمند وباحمیت مسلمان ڈاکٹر محمد وزیرخاں اکبر آبادی کی خدمات اور معاونت نصیب فرمائی، جنھوں نے ۱۸۳۲ء میں لندن کا سفر مڈیسن کی تعلیم کی غرض سے کیا، اور اس میں اعلیٰ دگری حاصل کی، انگریزی میں مہارت بہم پہونچائی، یونانی زبان سیکھی، اور میسیحت کا اس کے اصل ماخذ سے مطالعہ، اور ان کتابوں کے حصول کا خاص اہتمام کیا، اور یہ قیمتی کتب خانہ اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اس سے مولانا رحمت اللہ صاحب نے پورا استفادہ کیا، اور پھر پادری فنڈر (DR. C.G. PFANDER) سے مناظرہ کرنا طے کیا، جس نے عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو چیلنج کر رکھا تھا، اور اپنی کتاب **"میزان الحق"** (۱۱) لکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں میں اس کے جواب کی طاقت نہیں، یہ تاریخی مناظرہ ۱۱ر رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ر اپریل ۱۸۵۴ء اکبر آباد آگرہ کے ایک محلہ **"عبد المسیح"** میں منعقد ہوا، مناظرہ میں ضلع کے حکام، انگریزی چھاؤنی کے انگریز افسر وملازمین، اور شہر کے معززین شریک ہوئے، مناظرہ کا اختتام اس طور پر ہوا کہ پادری فنڈر نے انجیل کے آٹھ مقامات پر تحریف ہونے کا اعتراف کیا، دوسرے دن مجمع بہت زیادہ اکٹھا ہوگیا، انگریز حکام، عیسائی، ہندو، سکھ بھی بڑی تعداد میں

شریک ہوئے، مناظرہ میں پادری کی کمزوری اور ہٹ دھرمی کھل کر سامنے آئی، تیسرے دن پادری مناظرہ کے لئے نہیں آیا، پھر اس کا یہ حال ہو گیا کہ جہاں اس کو مولانا رحمت اللہ صاحب کے موجود ہونے کا پتہ چلتا وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز اور صدر اعظم خیر الدین پاشا کی تجویز پر "**اظہار الحق**" (۱۲) تصنیف فرمائی، مولانا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے تھے، وہ ۱۸۶۴ء میں خلیفۃ المسلمین کی طلب پر قسطنطنیہ تشریف لے گئے، اور ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں یہ کتاب تصنیف فرمائی، علامہ ابن تیمیہؒ نے "**الجوابُ الصحیحُ لمن بدّل دینَ المسیح**" میں جس طرح حملہ آورانہ طریقۂ کار اور اسلوب اختیار کیا ہے، اسی طرح مولانا نے بھی اس کتاب میں یہ اسلوب اختیار کیا، اور بائیبل کی ان غلطیوں، بیانات اور مضامین کے کھلے ہوئے تعارض اور روشن بدیہیات کے خلاف جو باتیں اس میں آئی ہیں، ان کی نشاندہی کی، جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، انہوں نے ریاضی کے نتائج کی طرح کے نتائج سامنے رکھ دیئے، جن میں قیل و قال کی گنجائش نہیں، انہوں نے مسیحی عقیدۂ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اس پر بڑی عالمانہ تنقیدیں کیں، اور اسی کے ساتھ قرآن پاک کے اعجاز اور اسکے منزل من اللہ ہونے کا علمی و عقلی ثبوت دیا، سیرت نبویؐ، معجزات اور ان بشارتوں کا بھی تذکرہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کے سلسلہ میں آئی، اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا، انگلینڈ کے ایک بڑے اخبار نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :۔

> "اگر لوگ اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے تو دنیا میں
> مسیحیت کی ترقی نہ ہو سکے گی"۔ (۱۳)

ہندوستان کے اور دوسرے علماء نے بھی مسیحیت کی تردید، اور بائیبل پر تنقید کے سلسلہ میں اہم اور قابل قدر علمی اور تنقیدی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان میں مولانا سید آل حسن موہانی (م ۱۲۸۷ھ) مصنف کتاب الاستفسار اور الاستبشار مولانا عنایت رسول چڑیاکوٹی (م ۱۳۲۰ھ) مصنف بشریٰ جنھوں نے عبرانی زبان کا نہ صرف مطالعہ بلکہ اس میں کمال بہم پہونچایا، سرِ فہرست آتے ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا عبد الحق حقانی، مولف **"تفسیرِ حقانی"**، مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء، قاضی محمد سلیمان منصور پوری مصنف **"رحمۃ للعالمین"** پروفیسر سید نواب علی مصنف **"تاریخِ صحفِ سماوی"** اور مولانا ثناء اللہ امرتسری ان علماء میں ہیں، جنھوں نے اس موضوع کی طرف توجہ کی اور وقت کی ضرورت پوری کی۔

اس طرح ہندوستان میں خاص اسباب کی بناء پر، جنہیں مسلمانوں کی دینی و ملی حمیت اور عیسائیت کے جارحانہ طرز عمل کو خاص دخل ہے، عیسائیت کے خلاف ایک قابل قدر کتب خانہ تیار ہو گیا۔

ایک صدی کا حاصل

اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی انگریزی زبان کی طرف توجہ اور اس کی تعلیم سے دلچسپی اور اہتمام کی ابتدا ۱۸۷۵ء سے تسلیم کی جائے، جبکہ علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا گیا تھا، اور ۱۹۸۱ء تک اس سلسلہ کو کھینچا جائے (۱۴) تو صاف نظر آئے گا کہ اس مدت میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے ایسے کئی افراد پیدا کئے، جو اہلِ زبان کی طرح انگریزی میں زبان لکھتے اور بولتے تھے، اس ایک صدی کی طویل مدت کے اعتبار سے انگریزی میں ان کی تصنیفات، تعداد میں اگرچہ کم ہیں، لیکن اپنی

علمی قدر و قیمت ، اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہیں، اور دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

ہندوستانی مصنفین کی چند ممتاز انگریزی تصنیفات

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہمیں انگریزی کے ایسے مسلمان مصنّفین نظر آتے ہیں، جنھوں نے تاریخ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے موضوع پر ایسی کتابیں تصنیف کیں، جن کی زبان کی حلاوت و قوت سے خود اہل زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، اور جنھوں نے اپنے قیمتی مواد اور دلکش اسلوب بیان سے یورپ کے اہل نظر کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا، ان میں سر فہرست رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی ہیں، جنھوں نے The Spirit of Islam (روح اسلام) تصنیف کی، اگر چہ ان کے افکار و خیالات سے کلیتہً اتفاق مشکل ہے، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس کتاب نے برطانیہ کے علمی و ادبی حلقوں کو اعتراف و تحسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزوں کی ایک تعداد کو اسلام کی صداقت و حقانیت تسلیم کرنے پر مجبور کیا، مستشرق (OSBORN) اس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے :۔

> "یہ کتاب یقیناً داد و تحسین کی مستحق ہے، اس کا طرز بیان بتاتا ہے کہ مصنف کو انگریزی زبان پر بھرپور قدرت ہے، کم ایسے اہلِ زبان ہوں گے جو مصنف کے اسلوب کا مقابلہ کر سکیں، یہ اسلوب ان عیوب و نقائص سے پاک ہے، جن میں ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ عام طور پر مبتلا ہیں، مسلمانانِ ہند کو مبارک ہو کہ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو اس مقام پر

فائز ہیں، یہ ناممکن ہے کہ جس کا نقش اول یہ کتاب ہو وہ
مستقبل میں فعال کردار اور گہرے اثرات نہ چھوڑے، جہاں
تک کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، ہم بہت سے مسائل میں
ان سے اختلاف رکھتے ہیں، اور اپنا نقطۂ نظر اور درجۂ اختلاف
بعد میں ذکر کریں گے"۔(۱۵)

سید امیر علی کی دوسری کتاب A SHORT HISTORY OF THE SARACENS(مختصر تاریخ عرب) بھی طویل زمانہ تک زبان کی سلاست وروانی، عمدہ طرز نگارش اور اعتدال وتوازن کی بناء پر مقبول عام رہی۔

دوسرے مسلمان مصنف کی شہرت ہندوستان سے متجاوز ہو کر دوسرے ممالک تک پہونچی صلاح الدین خدابخش ہیں، جنہوں نے اسلامی موضوعات پر کئی اہم کتابوں کا جرمن سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، ان کی براہ راست انگریزی تصنیفات اور مجموعۂ مقالات میں زیادہ مشہور(۱۶) (CONTRIBUTION TO THE HISTORY OF ISLAM CIVILIZATION) (اسلامی تہذیب وتمدن کی تاریخ پر ایک نظر) کی دوسری جلد، اور ,ESSAYS (INDIA ISLAMIC) (ہندوستان اور اسلام۔ چند مضامین ومقالات) ہیں، اگرچہ ان کے بہت سے افکار وخیالات سے جن میں تجدد اور مغربی خیالات سے تاثر صاف طور پر نمایاں ہے، تعلیمات اسلام اور تاریخ اسلام سے براہ راست واقفیت رکھنے والے متفق نہیں ہو سکتے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے برطانیہ کے علمی حلقوں سے دادو تحسین حاصل کی۔

اس دور یعنی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ان

مسلمان مصنفین کی، جنہوں نے اسلامیات پر انگریزی میں کتابیں لکھیں، یہ نمایاں کمزوری رہی ہے کہ وہ مغرب، مغربی فلسفہ، اور مغرب کے طبیعاتی علوم سے جو ابھی تک طفولیت کے مراحل سے آگے نہیں بڑھے تھے، بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، ان کے ہاں غیبی حقائق معجزات، ماوراء الطبیعات اشیاء کی دور از کار تاویلات، ایک طرف یہ سائنسی معلومات وانکشافات اور طبیعاتی اصول و ضوابط اور دوسری طرف ان سماوی حقائق کے درمیان تطبیق، اسلامی و مغربی تہذیب و تمدن کو ہم آہنگ کرنے کی مضطربانہ کوششیں پائی جاتی ہیں، مزید برآں اس طرح کی اکثر کتابیں معذرت آمیز (APOLOGETIC) اور مدافعانہ (DEFENSIVE) اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔

ان دو مصنفین کے بعد انگریزی میں لکھنے والے قابل ذکر مصنفین میں جن کے علم و فضل، گہرے مطالعہ اور تفکر نے بیرونی علمی دنیا کو متوجہ کیا، اور بلند پایہ اہل قلم اور اہل فکر نے اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالہ دیئے، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور انکی فکر انگیز کتاب (RECONSTRUCTION OF RE-LIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) جو ان کے مدراس کے لکچروں کا مجموعہ ہے، خاص طور پر نمایاں ہے بعض عقائد اور دینی حقائق کی تفہیم و تشریح میں فلسفیانہ غلو کے باوجود جس سے اتفاق مشکل ہے (۱۷)۔

دوسرے علامہ عبداللہ یوسف علی ہیں، جن کے انگریزی ترجمہ قرآن کو صفائی زبان، ادبی چاشنی، طاقتور اسلوب اور مترنم انداز بیان کی وجہ سے یورپ وامریکہ میں مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے متعدد ایڈیشن پاکستان، سعودی

عرب، اور دوسرے اسلامی ممالک سے شائع ہوئے ہیں، اسی طرح ایم۔ ایم پکھتال(M.M. PICKHTHALL)کاانگریزی ترجمہ گو اس میں بعض اغلاط پائے جاتے ہیں، کی زبان کی شیرینی اور اہل زبان کی سلاست وطلاقت کی بناء پر انگریزی بولنے والے ملکوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔

قرآن کے انگریزی تراجم کے اس تذکرہ میں بڑی ناسپاسی اور ناانصافی ہوگی، اگر ہم اردو کے مسلمہ ادیب مولانا عبد الماجد دریابادی کے انگریزی ترجمۂ قرآن کا تذکرہ نہ کریں، اس ترجمہ کی اہمیت ووقعت ان معلومات افزا حواشی اور نوٹس کی بناپر ہے جو بائبل اور قرآن کے مشترک مقامات، شخصیات اور واقعات پر نئی تحقیقات اور مذاہب وعقائد کے گہرے تقابلی مطالعہ کا نتیجہ ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں نئے علمی مواد اور مسیحی اور یہودی مآخذ سے پورا فائدہ اٹھایاہے، اور اس مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ان حواشی میں رکھ دیاہے، اور اس سے قرآن کے علوم وحقائق کو ثابت کرنے اور قرآن کے اعجاز کو واشگاف کرنے میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا، یہ وہ پہلو ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر مترجمین قرآن سے فائق نظر آتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک اس ترجمہ کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔(۱۸)

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے تعارف کے سلسلہ میں احمدیوں کی ابتدائی مساعی

لاہور کی جماعت احمدیہ نے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے کے کام سے خاص دلچسپی لی، ان کے کام کو ہندوبیرون ہند کے تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی زبان میں ہونے اور اچھے انداز میں پیش کئے جانے

کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، ان مصنفین میں سر فہرست خود جماعت احمدیہ لاہور کے بانی و امیر مولوی محمد علی لاہوری (۱۹) ہیں، جنھوں نے انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا، جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ،ان کے قلم سے جو تشریحات و حواشی نکلے ان سے ایسے بہت سے افراد متاثر ہوئے ، جن کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ براہ راست اور گہرانہ تھا، اور جو جدید نظریات و تحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مرعوب تھے، اور جن کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی تشریحات کی تلاش تھی، جو ان کی علمی و مذہبی پیاس بجھا سکے، ان کے تفسیری نوٹس میں معجزات اور غیبی حقائق کو طبعی اشیاء اور عام قانون قدرت کے تابع بنانے کا رنگ، مبالغہ آمیزی و انتہا پسندی کی حد تک غالب ہے، خواہ ایسے موقعوں پر عربی زبان اور قرآنی الفاظ ساتھ نہ دے سکیں، (۲۰) انہوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ طبعیات کا علم اور اس کی تحقیقات تغیر پذیر ہیں، اور وہ ابھی طفولیت کے مرحلہ سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔

مولوی محمد علی لاہوری کی ایک کتاب سیرت نبویؐ کے موضوع پر (MUHAMMAD THE PROPHET) کے نام سے ہے، جو ہند و بیرون ہند میں وسیع پیمانہ پر پڑھی گئی، اور تعلیم یافتہ نوجوان، اور یونیورسٹیوں کے ان اساتذہ نے اسے پسند کیا، جن کے سامنے سیرت پر انگریزی میں کوئی اور ایسی کتاب نہ تھی، جو نبوت محمدی کی عظمت اور پیغام اسلام سے پردہ اٹھاتی، اور اس ماحول و حالات کی تصویر کشی کرتی جن میں نبوت کا ظہور ہوا، نیز رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کرتی، اس صورت حال سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ صحیح اسلامی کتابوں کا وجود جن سے

نوجوان اور تعلیم یافتہ افراد اسلام اور پیغامبر اسلام ﷺ سے متعارف ہو سکیں، ازحد ضروری ہے، کیونکہ اگر مکمل قابل اعتبار اور معیاری تصنیفات موجود نہیں ہیں، تو یہ طبقہ اپنی پیاس ان کتابوں سے بجھائے گا، جو بآسانی میسر ہو جاتی ہیں، اور جن میں صحیح الخیال طبقہ اور علمائے دین کو قابل اعتراض چیزیں نظر آتی ہیں۔

مولوی محمد علی لاہوری کے بعد ان کے رفیق و ہم عصر اور انگلینڈ میں مشہور و معروف مبلغ اسلام اور انگریزی کے زبان آور خطیب خواجہ کمال الدین نے اس میدان میں خصوصی شہرت حاصل کی، اس سلسلہ میں ان کی دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک THE IDEAL PROPHET (مثالی نبی) دوسری SOURCES OF CHRISTIANITY (ینابیع المسیحیت) یہ بھی اپنے رفیق و امیر مولوی محمد علی لاہوری کی طرح مرزا غلام احمد صاحب کے معتقد و مرید تھے، لندن کا WOKING MISSION سنٹر عرصہ تک ان کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتا رہا۔ (۲۱)

معاصر مصنفین

مغربی زبانوں کے مصنفین کی اس پہلی نسل سے ہم آگے بڑھیں تو معاصرین میں فاضل گرامی ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مقیم حال پیرس، نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں، جن کے علمی کاموں کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہے، انہوں نے قرآن مجید کا فرنچ میں ترجمہ کیا، جس نے فرانس کے علمی حلقوں میں قبول عام اور اعتماد حاصل کیا، ان کی تصنیفات میں سے دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک (INTRODUCTION TO ISLAM) (اسلام کا تعارف) اور دوسری MOHAMMAD RASOOLULLAH (محمد رسول

اللہ علیہ وسلم) ان دونوں کتابوں کے ذریعہ ہزاروں انگریزی داں حضرات کو اسلام اور پیغامبر اسلام علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے واقف اور لذت آشنا ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن ان کی وہ کتاب جو ان کے فضل و کمال اور بحث و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے، وہ صحیفۂ ہمام بن منبہ ہے جس میں انہوں نے طاقتور اور واضح دلائل سے یہ ثابت کیا ہے، کہ جمع و تدوین حدیث کا کام عہد نبوی علیہ وسلم میں شروع ہو چکا تھا، اور وہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے مصنفین صحاح و سنن کے زمانہ تک جاری رہا، فاضل محقق نے اس کتاب میں نہ صرف علم حدیث کی، بلکہ اسلام کی عظیم خدمت انجام دی، جو تمام مسلمانوں کے شکر و اعتراف اور تحسین و آفریں کی مستحق ہے، ان کی دو اور کتابیں **"عہد نبوی کا پہلا سیاسی دستور"** اور **"عہد نبوی کے میدان جنگ"** بھی بحث و تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی خدمات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات کو تاریخی دستاویزوں اور شہادتوں سے اور زیادہ مدلل اور محکم بنادیا۔ STUDIES IN EARLY HADITH LITERATURE (ابتدائی ذخائر حدیث کے مطالعے) لکھ کر اس علمی دعوی کو زیادہ تفصیل اور مدلل طور پر ثابت کر دیا کہ تدوین حدیث کا کام مسلسل طور پر جاری رہا، اور اس کی عمر اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کی بتائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں اسلامیات پر انگریزی میں لکھنے والوں کی فہرست طویل ہے، نمایاں لکھنے والوں میں مثال کے طور پر OUTLINES OF ISLAMIC CULTURE کے مصنف ایم۔ اے شوستری، اور THE MUJADDID'S CONCEPTION OF TAUHID کے مصنف ڈاکٹر برہان

احمد فاروقی، نیز حافظ غلام سرور، ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آبادی (جنہوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا) سر امین جنگ، ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر ظہیر الدین فاروقی، (۲۲) سید مظفر الدین ندوی، (۲۳) فضل کریم صاحب، سید اطہر حسین، سید محی الدین وغیرہ ہیں، لیکن یہ تصنیفی و تحقیقی کام اس زمانی رقبہ کے اعتبار سے کم ہے، جو پوری ایک صدی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۸۱ء) پر محیط ہے۔

بعض نومسلم مصنفین کی طاقتور اور موثر تصنیفات

یہ حقیقت بڑی تعجب خیز اور اسلام کی قوت تسخیر اور اس کی نئی نئی فتوحات کی دلیل ہے کہ ایک نو مسلم انگریزی زبان میں ایسی کتابیں لکھتا ہے، جو ایمان افروز، روح پرور اور خود مسلمانوں میں خود اعتمادی اور نیا ایمان پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میری مراد محمد اسد صاحب سے ہے، جن کا نام مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے LEOPOLD WEISS تھا، جرمنی کے ایک یہودی خاندان سے ان کا تعلق ہے، ان کی کتاب ISLAM AT THE CROSSROADS (اسلام دوراہہ پر) نے صرف ایشیاء بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے نئے تعلیم یافتہ اور صاحب فکر طبقہ میں اپنے دین و تہذیب کی طرف سے خود اعتمادی اور یقین کی روح پھونک دی، ایک طویل زمانہ سے عالم اسلام میں سنت نبوی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا علمی و فکری طور پر اس طرح دفاع نہیں کیا گیا، اور اس کے مقدمہ کو (کم سے کم کسی مغربی زبان میں) اس طاقت سے پیش نہیں کیا گیا، جیسا کہ اس کتاب میں کسی یورپین مصنف نے ابھی تک اسلامی و مغربی تہذیب کے نقطہ ہائے اتفاق و اختلاف کو اس تفصیل و وضاحت سے بیان نہیں کیا تھا، اور مغربی تہذیب کی ایسی جرأتمندانہ تنقید نہیں کی تھی، جیسی کہ محمد اسد صاحب نے اس کتاب میں کی

ہے، مصنف نے یہ کتاب ہندوستان کے دوران قیام میں تصنیف کی، بیروت کے فاضل ادیب و مورخ استاذ عمر فروخ نے "**الاسلام علی مفترق الطرق**" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

محمد اسد صاحب کی دوسری کتاب جس کو یورپ و امریکہ میں بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھا گیا وہ ROAD TO MECCA ہے، جس میں مصنف نے اسلامی تہذیب و تمدن کے محاسن و خصائص اور اسلام کی صداقت و عظمت کو بڑی مہارت اور سبک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور اسلامی معاشرہ اور مسلمان ملکوں کی تہذیبی خصوصیات کی دلآویز طریقہ پر تصویر کشی کی ہے، جس کا تجربہ اور مشاہدہ اپنی ایک صحافتی مہم کے دوران ان کو ہوا، صحرائے عرب کے ایک پُر خطر سفر میں پیش آنے والے ذاتی تجربات کے پردہ میں وہ بہت سی ایسی حقیقتیں بیان کر گئے ہیں، جو ایک کھلے ہوئے دعوتی اور تبلیغی پیرایہ میں بیان نہیں کی جا سکتیں، پھر یہ کتاب اعلیٰ ادبی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کتاب کا عربی ترجمہ "**الطریق الی مکہ**" کے نام سے ہوا، اردو ترجمہ "**طوفان سے ساحل تک**" (۲۴) کے عنوان سے مولوی محمد الحسنی مرحوم مدیر "**البعث الاسلامی**" نے مؤلف کی اجازت سے کیا، اور "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" سے شائع ہوا ہے۔

اسلامی موضوعات پر انگریزی زبان میں تصنیفات کے اس تذکرہ میں نو مسلم خاتون مریم جمیلہ کی نگارشات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، جو ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور وسیع مطالعہ رکھنے والی امریکی خاتون ہیں، اسلام سے مشرف ہونے سے پہلے ان کا نام MARGARET MARCUS تھا، ان کے مضامین اور تصنیفات کی بنیاد مغربی تہذیب کے عمیق مطالعہ اور اس کے ذہنی اثرات سے نہ

صرف مکمل آزادی بلکہ بیزاری اور بغاوت پر قائم ہے، ان کی دو کتابیں ISLAM VERSUS THE WEST(اسلام یورپ کے مقابلہ پر) اور ISLAM AND MODERNISM(اسلام اور تجدد پسندی) ان اہم کتابوں میں ہیں، جن میں صاف طور پر سلامت فکر، عمیق مطالعہ اور اسلامی بصیرت جھلکتی ہے، مغربی تہذیب کی تنقید اور تجدد پسند تحریکوں پر تبصرہ کے سلسلہ میں ان کا قلم بڑا طاقتور اور بے لوچ ہے۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور اس کی خدمات

جدید اسلامی لٹریچر تیار کرنے کے سلسلہ میں (خاص طور پر انگریزی زبان میں) ندوۃ العلماء لکھنؤ کی "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام"، سب سے کم عمر، نوخیز اور کارگذاری علمی مجلس (اکیڈمی) ہے، جو ۱۹۵۹ء میں قائم کی گئی، اس علمی ادارہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں اسلام کی قائدانہ صلاحیت، اور پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت اور اسکی خاتمیت اور ابدیت پر اعتماد بحال کیا جائے اور وہ از سر نو اس حقیقت پر ایمان لائیں کہ آپ۔ ﷺ۔ "دانائے سبل، مولائے کل، ختم الرسل" ہیں، اور ایسے تقابلی مطالعے اور علمی بحثیں کی جائیں، جو ایک طرف اسلام کی صحیح ترجمانی کا فریضہ انجام دیں، اور دوسری طرف نئی نسلوں کے اطمینان اور ایمان کا سامان بھی فراہم کریں، مجلس کی ابتدا بہت چھوٹے پیانہ اور بہت محدود وسائل کے ساتھ (جن کا اس جیسے وسیع علمی اور تحقیقی منصوبہ کے لئے تصور کرنا بھی مشکل ہے) ہوئی، لیکن صرف ربع صدی میں خداتعالیٰ کے فضل بے پایاں سے مختلف زبانوں میں ۱۵۵ کتابیں اور رسائل شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے پچاس انگریزی میں، ۶۰ اردو میں، ۳۸ عربی میں اور ۷ ہندی زبان میں ہیں۔

مجلس کی قابلِ ذکر مطبوعات میں راقم سطور کی بعض تصنیفات کے انگریزی تراجم جیسے Muhammad Rasulullah ترجمہ "نبی رحمت" ﷺ The four pillars of Islam ترجمہ " ارکانِ اربع" western civlization Islam and Muslims ترجمہ " اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" Religion and civilization ترجمہ "مذہب وتمدن" Islam and the world ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور Saviours of Islamic spirit ترجمہ "تاریخ دعوت وعزیمت" اور Qadianism, Acritical Study (۲۵) ترجمہ "قادیانیت: مطالعہ اور جائزہ" اور The Msalman ترجمہ " ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں" وہ کتابیں ہیں جو راقم سطور کے قلم سے ہیں، اور مجلس سے شائع ہوئی ہیں، ان کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس کا ترجمہ Muhammad the Ideal Prophet کے نام سے، خلفائے راشدین کے موضوع پر سید اطہر حسین صاحب کی کتاب The glorious caliphate اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی بعض تصنیفات کے تراجم جیسے "معارف الحدیث" کا ترجمہ Meaning and Message of the Traditions "اسلام کیا ہے" کا ترجمہ What Islam is? "دین وشریعت" کا ترجمہ Islamic Faith and Practice "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" کا ترجمہ The Quran and you سید اطہر حسین صاحب کی کتاب The Messege of Quran

ان کے علاوہ تاریخ وادبیات کے موضوع پر بھی کئی کتابیں شائع کی گئیں جن میں "**نقوش اقبال**" کا ترجمہ Glory of Iqbal مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب "**ہندوستان اسلامی عہد میں**" کا ترجمہ India during Muslim Rule مقالہ نگار کی کتاب "**ہندوستانی مسلمان**" کا ترجمہ Muslim in India محی الدین صاحب کی "**سید احمد شہیدؒ اوران کی اصلاحی وجہادی تحریک**" پر مفصل ومحققانہ کتاب Saiyd Ahmad shahid کے عنوان سے، اور راقم سطور کے یورپ وامریکا کی تقریروں کے مجموعے جیسے "**مغرب سے صاف صاف باتیں**" کا ترجمہ Speaking Plainly to the West اور "**نئی دنیا امریکا میں صاف صاف باتیں**" کا ترجمہ From the Depth of Heart in America قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں صرف انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کے تذکرہ پر اکتفا کیا گیا ہے، ان کتابوں کا جدید ادبی انگریزی زبان میں (۲۶) ترجمہ کا کام زیادہ تر ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اور محی الدین صاحب نے انجام دیا ہے، اس علمی وادبی خدمت میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کا زیادہ تر حصہ رہا ہے، اور علمی ودعوتی حلقوں میں ان ترجموں کو پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اور یورپ وامریکہ وافریقہ تینوں براعظموں میں ان ترجموں کی بڑی پذیرائی ہوئی، وہاں سے ان کی ایسی مانگ ہے کہ مجلس اپنے محدود وسائل کی بناء پر اس کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

اردو زبان میں عظیم علمی وتحقیقی کام

اسلامی مقاصد کے تحت علمی موضوعات پر جو کچھ علمی اور اکیڈمی کام بیسویں صدی میں ہوا، اور جس کا بڑا حصہ تقسیم سے پہلے اور کچھ تقسیم کے بعد انجام پایا، اس کا تعلق انگریزی زبان سے ہے، اگر انگریزی زبان کے حدود سے تجاوز کر کے اردو زبان کا جائزہ لیا جائے، تو اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ مطالعہ کی وسعت و گہرائی، تحریر کی سنجیدگی، مواد کی فراوانی اور استناد اور علمی قدر و قیمت کے لحاظ سے اردو کا اسلامی لٹریچر مسلمانوں کی دوسری زبانوں سے فائق ہے، قدیم دینی اور مشرقی مدرسے (اپنے وسیع مفہوم میں) کے ساتھ انتساب رکھنے والے علماء نے جدید طبقہ کے مقابلہ میں اپنی صلاحیت و قوتِ عمل، کا زیادہ ثبوت دیا ہے، انہوں نے اس ذہنی اور تہذیبی ارتداد کا (جو بعض اوقات اعتقادی اور مذہبی ارتداد کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے) زیادہ پامردی، جفاکشی اور قابلیت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین

دارالمصنفین (ہماری معلومات کی حد تک) سب سے پہلے علمی و تحقیقی اور غیر سرکاری اکیڈمی ہے، جس کا قیام مغرب کے فکری حملوں اور مستشرقین کی مسموم تصنیفات اور مضامین کی تردید، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات کی برتری پر مطمئن کرنے، رسول اللہ ﷺ کی عظیم شخصیت و سیرت، اور اس نسل کے کارناموں سے واقف کرانے (جس نے آغوش نبوت میں تربیت پائی تھی) اور اسلام کے علمی و تحقیقی سرمایہ سے متعارف کرانے کی خاطر عمل میں آیا۔

مشہور مسیحی مصری فاضل جرجی زیدان نے بیسویں صدی کے اوائل میں جب مصر سے اپنی مشہور کتاب "**تاریخ التمدن الاسلامی**" شائع کی، تو

علمی حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی، جرجی زیدان کی، اس کتاب میں معلومات مواد کی فراوانی کے ساتھ ساتھ، اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ اور بعض تاریخی حقائق کی تحریف سے کام لیا گیا تھا؛ اور کتب خانہ اسکندریہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ لگادینے کی اس بے اصل داستان کو دہرایا گیا تھا، جو عرصہ سے مسیحی مورخین کا وتیرہ بن گیا تھا، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور مولف کا علامہ کی تعریف وتوصیف، اور ان کی کوششوں کو سراہنا، بُعد مکانی اور خود مصر میں جید علماء کی موجودگی کوئی چیز بھی علامہ شبلی کی راہ میں حائل نہ ہوسکی، انہوں نے عربی زبان میں ۱۹۱۲ء میں "**الانتقاد علی التمدن الاسلامی**" کے نام سے کتاب لکھی، جس میں پُرزور دلائل سے ان الزامات کی تردید کی، ہندوستان ومصر کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا (۲۷)، اور اہل حمیت اور عرب فضلا وبالخصوص علامہ سید رشید رضا نے ان کی اس خدمت کا ممنونیت وتشکر کے ساتھ ذکر کیا۔

دبستان شبلی نے بحث وتحقیق، وسعت مطالعہ، قلم کی شائستگی اور تحریر کی شگفتگی کے دلآویز نمونے پیش کیے، اس مکتب فکر کے فضلاء نے عالمانہ وادیبانہ طرز تصنیف وحسنِ ترتیب کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، انہوں نے علمی وتحقیقی بلکہ فلسفیانہ اور متکلمانہ مضامین کے لئے، وہ اسلوب تحریر اختیار کیا جو سنجیدہ اور عالمانہ مقاصد کے لئے ہر طرح موزوں تھا، جس میں زبان کی چاشنی، اور ادب وانشا کا حسن، صحیح تناسب کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ خصوصیت نئی نسل کے ان خوش مذاق نوجوانوں کے لئے باعث کشش بن گئی جو ادب وانشاء کی چاشنی کے بغیر کسی ٹھوس، غور طلب اور فکر انگیز مضمون یا کتاب کا مطالعہ نہیں کرسکتے، اس

دبستان کی کتابوں اور مضامین نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تہذیب وثقافت، مسلمانوں کی تابناک تاریخ اور ان کی علمی و تمدنی خدمات کو اس طرح پیش کیا، جس نے اسلام کی برتری اور عظمت اور اسلاف کی ذہنی اور انسانی بلندی پر اس کا اعتماد جو جدید تعلیم اور مغربی لٹریچر کے اثر سے متزلزل ہو رہا تھا، بحال کر دیا، اور اس احساس کمتری کو دور کرنے میں موثر رول ادا کیا، جو ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں پیدا ہو گیا تھا۔

ان مصنفین کی تصنیفات اور مضامین کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحث و تحقیق میں براہ راست واقفیت اور اصلیت (ORIGINALITY) پائی جاتی ہے، جو ان کو عربی و فارسی زبانوں پر قدرت اور اصل مآخذ سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور علوم اسلامیہ کی باقاعدہ تحصیل کا نتیجہ تھی، اور جس کی کمی مستشرقین کے خوشہ چینیوں اور بالواسطہ (SECOND HAND) معلومات رکھنے والوں میں نمایا طور پر نظر آتی ہے۔

علامہ شبلی کا (جو دار المصنفین کے خیال و منصوبہ کے اصل محرک ہیں (۲۸) سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر قدیم و جدید طرز کے عام مصنفین کی روش اور طریقہ سے ہٹ کر وسیع تخیل اور ہمہ گیر و مکمل خاکہ کے ساتھ کام شروع کیا، جس کو ان کے نادرۂ روزگار تلمیذ و جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اور زیادہ وسعت دے کر سات جلدوں میں مکمل کیا، اس سلسلہ کی پہلی جلد مکمل علامہ شبلی کے قلم سے ہے، دوسری جلد میں مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے ہیں، بقیہ جلدیں ان ہی کے رواں اور شاداب قلم کا نتیجہ ہیں، تیسری جلد کا تعلق دلائل و معجزات نبوی سے ہے، چوتھی

جلد منصب نبوت، نبوت کے خصائص، بعثت محمدی کے وقت جزیرۃ العرب اور متمدن دنیا کے حالات، اور اسلامی عقائد سے تفصیلی بحث کرتی ہے، پانچویں جلد عبادات بدنی، مالی، قلبی کے ساتھ مخصوص ہے، چھٹی جلد اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کے اخلاقی فلسفہ سے متعلق ہے، اس موضوع پر ہمارے علم میں اس تفصیل اور دیدہ ریزی سے کم لکھا گیا ہے، ساتویں اور آخری جلد معاملات اور سیاست کے موضوع پر ہے، اور اس طرح یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوت کا ایک جامع تعارف اور ایک چھوٹا انسائیکلو پیڈیا بن گیا ہے۔

علامہ شبلی کی زندہ جاوید تصنیفات میں ان کی کتاب "**الفاروق**" خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کو ان کی انشا پردازی کا شاہکار کہا جاسکتا ہے، اس کتاب نے بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی محبت کا بیج بویا اور ایمان کی آبیاری کی، اور وہ مغرب کے فکری و تہذیبی حملوں کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بنی، علامہ موصوف کے سوانح و سیرت نگاری کے اس مفید سلسلہ میں "**الغزالی**"، "**سوانح مولانا روم**"، "**المامون**" اور "**سیرت النعمان**" بھی شامل ہیں جو تذکرہ اور سوانح کی ترتیب کا جدید اور قابل تقلید نمونہ ہیں، ان کے تلامذہ نے اسلامی تاریخ کی جو قدیم کتابوں کے صفحات اور شکنوں میں بھولی بسری اور کتابوں کے ڈھیر میں دبی پڑی تھی، عصری اسلوب، اور جیتی جاگتی زبان میں تشکیل جدید کا کام کیا، جس کا نمونہ "**اسوۂ صحابہ**"، "**اسوۂ صحابیات**"، "**سیر الصحابیات**"، "**خلفائے راشدین**"، "**مہاجرین انصار**"، "**سیر الصحابہ**"، "**اہل صحابہ وتابعین**" اور "**سیرت عمر بن عبد العزیز**"

اور "**تاریخ اسلام**" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کی "**شعر العجم**" فارسی شعروشاعری کی تاریخ، تحلیل و تنقید اور مختلف شعراء کے خصوصیات کلام اور محاسن شاعری کے موضوع پر ایسی امتیازی حیثیت رکھتی ہے کہ اس سے جزئی اختلاف اور اس کے بعض مضامین پر تنقید نے بھی اس کی اہمیت کم نہیں کی، اس طرح ان کی کتاب "**الجزیۃ فی الاسلام**"، "**حقوق الذمّیین**" جو اسلامی جزیہ کی حقیقت، ذمیوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے بحث کرتی ہے، "**کتب خانۂ اسکندریہ**" اور "**اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر**" خواص و عوام میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور افتراپردازیوں کا پردہ چاک کرتی ہے، اور تاریخ کے روشن حقائق کے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے (جو اسلامی ممالک میں یورپین سامراج کا زمانہ ہے) تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی نظام حکومت، اور اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم محکوموں کے ساتھ سلوک وبرتاؤ سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کردیئے گئے تھے، اور تاریخ کو شک آفرینی، اعتقادی تزلزل اور ذہنی مرعوبیت کا ایسا ہی ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اور اس سے وہی کام لیا جانے لگا تھا، جو تیسری چوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفہ سے لیا گیا تھا، اس لئے اس کی شدید ضرورت تھی کہ تاریخ کو صحیح طریقہ پر پیش کیا جائے اور شبہات اور افتراپردازیوں کا پردہ چاک کیا جائے، یہ نہ صرف ایک علمی و تاریخی خدمت تھی، بلکہ ایک نیا "**علم کلام**" تھا جس سے ایمان کی حفاظت و تقویت کا کام لیا جاسکتا تھا، علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کے فضلاء نے اس سلسلہ میں مفید اور ناقابل فراموش خدمت

انجام دیں۔

علامہ شبلی کے بعد ان کے نابغۂ روزگار تلمیذ اور ندوۃ العلماء کے مایۂ ناز اور یگانۂ فاضل مولانا سید سلیمان ندوی کا دور آتا ہے، جنہوں نے "**ارض القرآن**" کے عنوان سے، قرآنی عہد، اور انبیاء کے ظہور اور ان کی دعوتوں اور سرگرمیوں کے مرکزوں کا جغرافیائی اور تاریخی جائزہ لیا، اس میں عربوں کی تاریخ، اسلام سے پہلے ان کی فتوحات، جزیرۃ العرب کے مختلف خطوں سے، دنیا کے مختلف ممالک، اور مختلف ممالک سے جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں کی طرف انسانی قافلوں کی آمد کے واقعات، ان علاقوں کی زبانوں، مذاہب، تجارتی کاروانوں اور تہذیب کے مختلف دوروں کا تذکرہ کیا ہے، انہوں نے ۱۹۱۵ء میں یہ کتاب مرتب کی، جس میں دوسری زبانوں کے مآخذ و مراجع سے پورا استفادہ کیا گیا، اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات "**عرب وہند کے تعلقات**"، "**عربوں کی جہاز رانی**" اور "**خیّام**" وہ کتابیں جو طویل بحث و تحقیق، اسلامی کتب خانہ کی غواصی اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں، اور جدید علمی طریقۂ بحث و تحقیق کا وہ نمونہ پیش کرتی ہیں، جس پر اردو زبان، اور نئی نسل کو بجا طور پر فخر ہونا چاہئے۔

"**عمر خیام**" ایران کا سرمایۂ فخر فرزند، نادرۂ روزگار شاعر اور علوم ریاضیات کا ماہر ہے، لیکن خود ایران عمر خیام کی سیرت و شخصیت پر کوئی ایسی کتاب پیش نہیں کرسکتا، جو اس نابغۂ وقت شخصیت کی عظمت اور اس کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے اور علمی و تاریخی عمیق و طویل مطالعہ میں اس کتاب کی ہم پلہ ہو۔

ان کی کتاب "**خطبات مدراس**" جس کا ترجمہ خود بلاد عربیہ میں "**الرسالۃ المحمدیہ**" (۲۹) کے نام سے شائع ہوچکا ہے، سیرت

نبوی اور تعلیمات نبوت پر ایسی طاقتور، موثر اور پُر مغز اور پراز معلومات کتاب ہے، جس کی نظیر مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ملنی مشکل ہے، اسی طرح **"سیرتِ عائشہؓ"** اپنے موضوع پر منفرد کتابوں میں ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی، وسعت مطالعہ، حدیث وفقہ کے اولین مآخذ سے گہری واقفیت، اور اختلافی وکلامی مسائل میں جمہور اہلسنت والجماعت کے مسلک کی پابندی میں اپنے استاد پر بھی فوقیت لے گئے، سید صاحب کے گرد (جو اس عظیم ادارہ کی روح اور اس کے دائرہ کا مرکز تھے) اہل قلم فضلاء اور سنجیدہ تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک ٹیم جمع ہوگئی، جس میں زیادہ تر دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل نوجوان تھے، اس مختصر مقالہ میں ان کے نام اور ان کی اہم تصنیفات کے ناموں ہی پر قناعت کی جاسکتی ہے، اِن میں سرِ فہرست **"اسوۂ صحابہؓ"** اور **"شعرالہند"**، **"حکمائے اسلام"** اور دیگر کتابوں کے مصنف مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی (سابق استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد) جن کے قلم سے سیرۃ النبی کی جلد سوم میں جدید فلسفہ اور علوم عقلیہ کے نقطۂ نظر سے معجزات نبوی کی اہم بحث شامل ہے، اور جو **"مذہب وعقلیات"** اور **"مذہب وسائنس"** کے مصنف ہیں، مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی، مولوی سید ریاست علی ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی ایم۔ اے، مولوی سعید انصاری، مولوی ابو الحسنات ندوی، مولوی ابو الجلال صاحب ندوی ڈاکٹر محمد عزیر صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، مولوی ابو ظفر صاحب ندوی، مولانا محمد ادریس ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولوی مجیب اللہ ندوی، مولوی ضیاء الدین اصلاحی، اور موجودہ ناظم دار المصنفین اور

مدیر "**معارف**" سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم، اے، شامل ہیں، دارالمصنفین کے قیام وترقی کے سلسلہ میں مولانا مسعود علی ندوی کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، جن کی انتظامی اور تعمیری صلاحیتوں نے اس کو ایک منظّم، خوش اسلوب اور ترقی پذیر ادارہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی

دارالمصنفین کے بعد جس کا قیام ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا تھا، ندوۃ المصنفین کے نام سے دہلی میں ۱۹۳۸ء میں ایک مجلس علمی قائم کی گئی، اس کے بانی اور ناظم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ہیں، اس کے قیام کے اولین محرکوں میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی (سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند) تھے، ندوۃ المصنفین سے ایک موقر علمی مجلّہ "**برہان**" کے نام سے نکلتا ہے، جس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے (سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پر ہے، اس مجلس سے بہت سی اہم اور قابل قدر مطبوعاتِ شائع ہوچکی ہیں، جن کو اسلامی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی، قرآن مجید، اخلاق وتربیت، اسلام کے سیاسی وتربیتی نظام، اسلامی ممالک کی تاریخ، تاریخ فقہ، تاریخ تصوف، ہندوستان کے صوفیاء ومشائخ کے تراجم وسیر کے موضوع پر اہم کتابیں شائع ہوئیں، (۳۰) اس کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔

کچھ اور مصنفین اور محققین

کچھ اور محقق مصنفین بھی ہیں، جن کے نام، علم و تحقیق اور ادب وانشاء کے میدان میں روشن اور نمایاں ہیں، اگرچہ ان کا ان دونوں بڑے اداروں میں سے کسی سے تعلق نہیں، لیکن ان کی اپنے موضوع پر قابل قدر تصنیفات ہیں، ان میں

ہندوستان کے شہرۂ آفاق قائد ورہنما، ادیب وخطیب اور جمہوریہ ہند کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، جن کی تصنیف **"ترجمان القرآن"** اگرچہ مکمل نہ ہوسکی، لیکن اس نے تعلیم یافتہ طبقہ پر گہرا اثر ڈالا اور اس میں مطالعۂ قرآن کا ذوق پیدا کیا، اور اپنے بلیغ و موثر اسلوب کے ذریعہ اعجاز قرآن پر ایمان وایقان میں اضافہ کیا، ان کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مصنف **"النبی الخاتم"**، **"تدوین حدیث"**، **"ہمارا نظام تعلیم وتربیت"**، **"اسلام کا معاشی نظام"**، **"امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی"** وغیرہ، مولانا عبدالماجد دریابادی مفسر قرآن، اور متعدد علمی وادبی کتابوں کے مصنف مولانا عبدالرؤف داناپوری مؤلف **"اصح السیر"** اور **"اسلام اور تمدنی مسائل"** اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (بانی جماعت اسلامی ہند) ہیں، جن کی اولین بلند پایہ تصنیف **"الجہاد فی الاسلام"** کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوا، ان کی متکلمانہ اور مقبول کتابوں میں **"پردہ"**، **"سود"**، **"تنقیحات"** جو مغربی تہذیب واقدار کی تنقید پر مختلف مقالات کا مجموعہ ہے **"تفہیمات"** جو مختلف اسلامی موضوعات پر ان کے مقالات کا مجموعہ ہے، اور تفسیر **"تفہیم القرآن"** وغیرہ، مولانا مودودی کی تصنیفات ومضامین میں معذرت آمیز اور مدافعانہ اسلوب کے بجائے اقدامی اور خود اعتمادی سے بھرپور اسلوب پایا جاتا ہے، ان کے بعض نقطہائے نظر، خیالات وافکار اور ان کی تفہیم دین کے بنیادی طرز سے اختلاف کے باوجود (جس کی گنجائش ہر دور میں اور بحث وتحقیق کا کام کرنے والے ہر مصنف کے لئے موجود ہے)(۳۱) اس حقیقت کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ مولانا نے اسلامی مسائل

کی تشریح میں وہ طرز اختیار کیا، اور موجودہ مسائل و مشکلات کے اسلامی حل اس انداز سے پیش کئے، جنھوں نے ان اسلامی حلقوں میں جو فکری بے چینی کا شکار تھے، اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان کے عبوری دور سے گذر رہے تھے، مفید خدمت انجام دی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مصنف "**الرق فی الاسلام**" اور "**صدیقؓ اکبر**" وغیرہ، پروفیسر خلیق احمد نظامی صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، وغیرہ قابل ذکر مصنفین اور انشا پرداز ہیں، ان کے علاوہ کچھ ابھرتے ہوئے نئے مصنفین بھی ہیں، جن کا مستقبل تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق کے میدان میں روشن ہے، یہ مضمون تحقیقی کام کرنے والوں اور اسلامیات کے مصنفین و مضمون نگاروں کی کوئی جامع فہرست (DIRECTORY) نہیں، یہ ہندوستان کی علمی سرگرمیوں اور تصنیف و تالیف کے کام کا مختصر سا تعارف ہے۔

پاکستان میں اسلامی تحقیقات کا کام

پڑوسی ملک پاکستان کے مشہور اسلامی مصنفین اور مضمون نگار حضرات کے تفصیلی تذکرے (۳۲) کے بارے میں معذرت خواہ ہوں، بر صغیر کے علمی و تحقیقی کام کے عمومی تذکرہ میں، تقسیم ملک سے پہلے کی اہم انگریزی تصنیفات اور تحقیقی کاموں کا تذکرہ آگیا ہے، پاکستان بننے کے بعد وہاں اس سلسلہ میں جو کام ہوا یا ہورہا ہے، اس کا مکمل جائزہ لینا اس مقالہ میں دشوار بھی ہے، اور نازک بھی، تاہم چند اہم شخصیات کے ناموں اور کاموں سے اس مختصر رسالہ کو خالی نہیں

رکھا جاسکتا، جن میں پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم ایم، اے۔ (ڈی،او،ایل)(سابق پرنسپل اورینٹل کالج وپروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی) نگران اعلیٰ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جو پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہورہاہے، سرفہرست ہیں، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سابق وزیر تعلیمات پاکستان، ڈاکٹر محمد رفیع الدین مصنف **"قرآن اور سائنس"**(۳۳) ڈاکٹر سید عبداللہ نگران حال اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بزمی انصاری، پروفیسر محمد اسلم، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا محمد تقی عثمانی (جن کا مولانا رحمت اللہ صاحب کرانوی کی شہرۂ آفاق کتاب **"اظہار الحق"** کے اردو ترجمہ **"بائبل سے قرآن تک"** پر سیر حاصل اور پر مغز مقدمہ ہے) پروفیسر عبدالحمید صدیقی، پروفیسر خورشید احمد، اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اسلامی تحقیقات ونشریات کے سلسلہ کے دو ادارے قائم ہوئے، ایک ادارہ ثقافۃ اسلامیہ لاہور، دوسرا مجمع البحوث الاسلامیہ اسلام آباد (ISLAMIC RECEARCH INSTITUTE ISLAMA-BAD) جو اسلام آباد کے اسلامی یونیورسٹی کے تابع ہے، اور اس کے صدر ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا ہیں، یہ اکیڈمی عربی زبان میں ایک مجلّہ **"الدراسات الاسلامیۃ"** کے نام سے، اور ایک رسالہ اردو میں **"فکرونظر"** کے نام سے نکالتی ہے۔

قدیم مدارس کے فضلاء کی علمی خدمات اور بحث وتحقیق کے میدان میں فوقیت وامتیاز

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے وہ علماء جنھوں نے قدیم

طرز پر تعلیم حاصل کی، علم اور بحث و تحقیق کے قافلہ سے کبھی نہیں بچھڑے، اور اپنے ملک کی زبان وادب اور علوم سے کبھی انکا رشتہ ٹوٹنے نہیں پایا، جیسا کہ بعض اسلامی عرب ملکوں میں پیش آیا، وہ سیاسی قیادت، اور آزادی کے جدو جہد میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ علمی وادبی میدانوں میں بھی قائدانہ کردار ادا کرتے رہے، انہوں نے ادب و تنقید اور شعروشاعری کے ایسے شاہکار چھوڑے جو ان کے زبان وادب کے مذاق سلیم، اور ان کی ناقدانہ نظر کے گواہ ہیں، زبان وادب کے میدان کے ناپختہ کار شہسوار ان کی کوششوں کو کتنا ہی ابتدائی کاوشوں کا نام دیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تصنیفات ادب و تنقید کے علمی سفر میں سنگ میل کا کام دیتی ہیں، مولانا حالی کا "**مقدمۂ شعروشاعری**" اور "**یادگارِ غالب**"، علامہ شبلی کا "**موازنۂ انیس ودبیر**"، مولانا حکیم سید عبدالحی کی "**گلِ رعنا**" جو اردو زبان کی تاریخ اور اردو شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اور "**یادِ ایام**" جو گجرات کے اسلامی عہدِ زریں کی مختصر مگر جامع، علمی و تہذیبی، تمدنی وعمرانی، اجتماعی واخلاقی تاریخ، اور وہاں کے علماء و مشائخ، اولیاء و صلحاء، اور سلاطین وامراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اور اس موضوع پر قلم کی شگفتگی، اور کسی ملک یا علاقہ کی تاریخ کو پیش کرنے کی اچھی مثال اور کامیاب کوشش ہے،(۴۰) مصنف نے "**گلِ رعنا**" میں کچھ ایسے سوالات اٹھائے ہیں، اور ایسے نئے نظریئے پیش کئے ہیں، جن سے مصنف "**آبِ حیات**" مولوی محمد حسین آزاد کے تاریخی مسامحات اور بعض مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ خیالات و نظریات کی نشاندہی ہوتی ہے "**آبِ حیات**" کا اس کے جادو نگار مصنف کے زور قلم کی وجہ سے ادبی حلقوں پر ایسا جادو تھا کہ کسی کو تنقید، تحلیل و تجزیہ اور بحث و تحقیق کا خیال بھی نہ آتا تھا،

''گلِ رعنا'' نے پہلی مرتبہ یہ جادو توڑا، اور ناقدین و مورخین ادب کو دعوت فکر و مطالعہ دی، (۳۵) اسی طرح مولانا عبد السلام ندوی کی ''شعرُ الہند'' بھی اس سلسلہ کی سنجیدہ اور باوقار کوشش ہے، جس سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس کی اہمیت و افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چند باکمال حضرات جنہوں نے تنہا اکیڈمیوں کا کام کیا

ہندوستان کے متعدد باکمال افراد نے بحث و تحقیق اور تالیف و تصنیف کا وہ کام انجام دیا، جو بڑی اکیڈمیاں اپنے وسیع کتاب خانوں، بھرپور وسائل اور ادارتی و تحریری عملہ کے ذریعہ انجام دیتی ہیں، یہ کام انہوں نے بے سروسامانی اور گمنامی کی حالت میں سرکاری امداد و تعاون سے بے نیاز ہو کر اپنے ذاتی جذبۂ خدمت اور علمی شغف کی بنا پر انجام دیا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ہمارا قدیم تعلیمی نظام، اور علمی ماحول، جن میں ان افراد نے نشو و نما پائی اور پروان چڑھے، موجودہ تعلیمی نظام اور علمی ماحول کے مقابلہ میں صبر و تحمل، ہمت و استقلال، جفاکشی اور سخت کوشی، اور قربانی و بے نفسی کی صلاحیت پیدا کرنے پر زیادہ قدرت رکھتا تھا۔

ان قابلِ ذکر علماء و محققین میں مولانا محمود حسن خاں ٹونکی (م ۱۹۴۶ء۔ ۱۳۶۶ھ) مؤلف ''معجمُ المصنفین'' کا نام لیا جا سکتا ہے، جنہوں نے عربی زبان میں اس کتاب کو تقریباً ساٹھ جلدوں میں مکمل کیا ہے، یہ بیس ہزار صفحات اور چالیس ہزار مصنفین کے تذکروں پر مشتمل ہے، نظام دکن میر عثمان علی خاں کے تعاون سے (۱۳۵۴ھ۔ ۱۹۳۵ء) میں بیروت سے اس کی چار جلدیں شائع ہوئیں، پہلی جلد مفید اور عام معلومات پر مشتمل ہے، (جیسے اسلام میں علم کی اہمیت، سب سے پہلے وجود میں آنے والے علوم، اسلام میں تدوین علوم کا سلسلہ

وغیرہ) کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے، کتاب کے مقدمہ میں مصنف حاجی خلیفہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''**کشفُ الظنون**'' اور اس پر استدراکات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> ''اس طرح یہ کتاب ''**کشفُ الظنون**'' کی شرح ، اور تصنیفات کے سلسلہ میں اس پر استدراکات کی حیثیت رکھتی ہے، میں نے احاطۂ معلومات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اور ان تمام علماء کے تراجم جمع کرنے کی پوری کوشش کی جنہوں نے اسلامی عہد میں متداول اسلامی علوم پر قابلِ ذکر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، اس سلسلہ میں فلاسفہ اور حکماء، اور عرب و عجم، عراق و مصر، اندلس اور روم، خراسان وماوراء النہر، ہندو سند، اور ان کے علاوہ مختلف خطوں کے علماء کے تذکرے آگئے ہیں، تاہم میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اس کتاب میں تمام علماء کا استیعاب واستقصا کرلیا ہے، اور ہر چھوٹے بڑے مصنف کو اس میں شامل کرلیا ہے، حقیقتاً یہ انسانی طاقت سے باہر ہے''۔(۳۶)

کتاب وسعت وہمہ گیری کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف ابراہیم نام کے جن مصنفین کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کی تعداد ۳۴۸ ہے، لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ یہ خزانۂ بے بہا حیدر آباد کے مخطوطات و محفوظات کے انبار میں دبا پڑا ہے ، اس لئے کہ مشرق میں کام کی وقعت واہمیت ، اس کی علمی قدرو قیمت مصنف کی کدوکاوش، اور علم دوست حضرات کی ضرورت نہیں، بلکہ ذرائع ابلاغ،

اعلان واشتہار اور اداروں وحکومتوں کی رحم وکرم کی مرہون منت ہیں۔

اس سلسلہ میں جن دوسرے عظیم مصنف ومورخ کا نام لیا جا سکتا ہے، وہ مولانا حکیم سید عبد الحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء (م ۱۹۲۳ء - ۱۳۴۱ھ) ہیں، جنہوں نے "**نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر**" (۳۷) کے نام سے عربی میں ۸ جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے، جو پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی علماء وصلحاء اعیان وامراء، اور ادباء وشعراء کے تقریباً چار ہزار پانچ سو تذکروں پر مشتمل ہے، ہندوستان کے علماء ومشائخ کے حالات پر یہ کتاب مشرق ومغرب میں سب سے بڑے مرجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کا زمانی رقبہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک، اور مکانی رقبہ درۂ خیبر سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے، کتاب کی یہ وہ خصوصیت ہے، جس میں کسی مسلم یا عرب ملک میں تصنیف شدہ طبقات وتراجم کے موضوع پر کوئی کتاب شریک وسہیم نہیں، (۳۸) اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی دقت نظر، علمی دیانتداری، خصائص وکمالات اور واقعات کے حسن انتخاب خوبی اختصار، اور صاحب سوانح کے مقام علم وفضل اور "**اختصاص**" کی تعین وتحدید کتاب کی ایک نمایاں صفت ہے، جس میں مشہور تذکرہ نگار ابن خلکان کی کتاب "**وفیاتُ الاعیان**" کی جھلک نظر آتی ہے، اور جس کی قدر وہی حضرات کر سکتے ہیں، جن کی تذکرہ وتراجم کی کتابوں اور سوانح نگاری کی مشکلات ونزاکتوں پر گہری نظر ہے۔

ان کی دوسری اہم کتاب "**الثقافة الاسلامية فى الهند**" (۳۹) اس کتاب کا اردو ترجمہ دار المصنفین کی طرف سے "**اسلامی علوم**

وفنون ہندوستان میں"میں کے نام سے شائع ہوا،(۴۰)جو علوم آلیہ (صرف، نحو، بلاغت) علوم دینیہ (تفسیر و حدیث و فقہ و اصول) اور حکمت و فلسفہ ادب و شعر میں علماء ہند کی تصنیفات کی مکمل اور جامع ڈائرکٹری، علمی کوششوں، اور ان میں ہونے والی ترقیوں، نصاب تعلیم، اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں، اور ان تبدیلیوں کے اسباب، اور ان کے پس منظر کی مفصل تاریخ ہے، ہمارے علم میں کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں ہے، جس کے نظام و نصاب، تعلیم کی مکمل تاریخ، اور تغیر وارتقاء کے اسباب و محرکات کی روئیداد ایسی تفصیل و وضاحت کے ساتھ مرتب کی گئی ہو۔

ان کی تیسری اہم کتاب "**الہند فی العہد الاسلامی**" (۴۱) ہے، جس کا ترجمہ اردو میں "**ہندوستان اسلامی عہد میں**" کے نام سے، اور انگریزی میں INDIAN DURING MUSLIM RULE(۴۲) کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، یہ کتاب مختلف ممالک کے آثار و تمدن اور تمدنی و عمرانی ترقیوں اور ان سے متعلق مفید اور ضروری معلومات کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں (مثلاً "**خطط مصر**"، "**خطط الشام**" وغیرہ) کے سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے، جس کا ایک باب پورے ایک کتب خانہ کا خلاصہ، اور ایک صفحہ ایک ضخیم کتاب کا قائم مقام ہے۔

اسی نوع کے مصنفین میں مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ۔ ۱۹۳۰ء) کی بھی شخصیت ہے، جو تفسیر کے ایک خاص طرز اور مکتب فکر کے بانی ہیں، جس کا خاص موضوع آیات قرآنی کا باہمی ربط، اور مضامین کی ہم آہنگی ہے، ان

کی اہم تصنیفات میں "**نظام الفرقان**"، "**الامعان فی اقسام القرآن**" اور "**الرأی الصحیح فیمن ھوالذبیح**" ہے، آخر الذکر اپنے موضوع پر منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

اسی فہرست میں علامہ عبدالعزیز میمن راجکوٹی (م ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء) مصنف "ابوالعلاؤ ماالیہ (۴۳)" کا نام آتا ہے، یہ کتاب تحقیق، دقت نظر، اور وسعت مطالعہ کے اعتبار سے اس موضوع پر سب سے بہتر کتاب ہے، ان کی دوسری کتاب "**سمط اللآلی**" کے نام سے ہے، جو ان کی نحو ولغت میں دیدہ وری اور اس کے مآخذ پر وسیع عبور کی شاہد ہے، (۴۴) علامہ میمن مرحوم دمشق کی نامور علمی اکیڈمی المجمع العلمی (حال مجمع اللغة العربیة) کے مدة الحیاة رکن رہے، "**لسانُ العرب**" جیسی عظیم کتاب کی تصحیح کے لئے ماہرین زبان کی جو کمیٹی بنائی گئی تھی، میمن صاحب اس کے بھی ایک رکن تھے۔

ہندوستان کے ممتاز علماء میں جنہوں نے انفرادی طور پر وہ علمی خدمت انجام دی، جو ایک پوری جماعت علماء یا ایک ادارہ کی کارگذاری سے کم نہیں، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری مرحوم (م ۱۳۵۳ھ۔ ۱۹۳۴ء) جو "**جامعُ الترمذی**" کی شرح "**تحفۃُ الاحوذی**" کے مصنف ہیں، جس کی پہلی جلد مقدمہ پر اور تین ضخیم جلدیں شرح پر مشتمل ہیں، اس کتاب سے مصنف کے فن اسماء الرجال، اور علم جرح وتعدیل میں مہارت، محدثین کے طبقات سے واقفیت، اور تخریج احادیث کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب ہندوستان اور عرب میں بار بار شائع ہوئی ہے، اور حدیث شریف میں درس وتدریس سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے تحفہٗ بے بہا ہے۔

حدیث کی خدمت و تحقیق کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدینہ منورہ کا نام اور کام بہت روشن ہے، (۴۵) جن کی وسعت نظر اور بحث و تحقیق میں دیدہ ریزی کی روشن دلیل ان کی کتاب "**اوجز المسالک الی مؤطا الامام مالک**" ہے، جو ۶ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب پر، اور "**لامع الدراری علی جامع البخاری**" پر ان کا مقدمہ، ان دونوں جلیل القدر کتابوں اور ان کے عظیم مصنفوں کے حالات و خصوصیات اصول حدیث، اور اسماء الرجال کے مفید مباحث، ائمہ اربعہ اور ان کے مسالک کے متعلق قیمتی معلومات، ہندوستان میں علم حدیث اور ہندوستان کے بڑے محدثین کے تذکرے پر مشتمل دو چھوٹے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح "**حجة الوداع وعمرات النبی**" اپنے موضوع پر بڑی مکمل، جامع، اور منفرد کتاب ہے۔

انہیں شخصیات میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا نام بھی بہت نمایاں ہے، جن کی علم حدیث و اسماء الرجال میں فنی مہارت، اور علوم حدیث میں دقت نظر اور گہری بصیرت مصنف عبدالرزاق (۴۶) کی محدثانہ خدمت سے عیاں ہے، ایک مستقل جلد اس کتاب کے مقدمہ پر مشتمل ہوگی، اس سے پہلے "**مسند الحمیدی**" اور "**سنن سعید ابن منصور**" کی تحقیق و تصحیح کی خدمت انجام دے چکے ہیں، ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب "**الزہد والرقائق**" حافظ نورالدین ہیثمی کی "**کشف الاستار عن زوائد البزار**" اور حافظ ابن حجر العسقلانی کی "**المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ**" کی تحقیق کی ہے۔

مولانا محمد یوسف کاندھلوی امیر جماعت تبلیغ (م ۱۳۸۴ھ۔ ۱۹۶۴ء)
کی **"حیاۃ الصحابہؓ"** سہ جلد، صحابہ کرام کی سیرت اور ان کی ایمانی، دعوتی، اخلاقی وتربیتی زندگی کا ایک دائرۃ المعارف ہے، اور اس موضوع پر سب سے زیادہ جامعیت، استیعاب اور تنوع کی حامل ہے، اس سلسلہ میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم (۷۴) کے تحقیقی کاموں میں ان فاضلہ کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جوانھوں نے امام سفیان ثوری کی **"تفسیر القرآن الکریم"** کی تصحیح ومقابلہ، تحقیق ومفید حواشی کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد عالم اسلام کے ان عظیم الشان اداروں میں ہے جنھوں نے قدیم علمی ودینی کتابوں کے (جو مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں) احیاء اور قدیم کتب خانوں کے دفینوں سے علمی جواہرات کو برآمد کرنے، اور تصحیح و تحقیق کے ساتھ نشرواشاعت کا کام انجام دینے میں تاریخی کردار انجام دیا ہے، یہ ادارہ ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۸ء میں نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی، ملا عبدالقیوم، اور فضیلت جنگ مولانا انواراللہ خاں استاد میر عثمان علی خاں نظام دکن کی تحریک سے قائم ہوا، اور اس نے اس قلیل عرصہ میں حدیث، اسماء الرجال، تاریخ، ریاضیات اور حکمت وفلسفہ کی ڈیڑھ سو سے اوپر ان بیش قیمت کتابوں کو شائع کیا، جن کا علماء ومدرسین صرف تذکرہ سنتے تھے، اس ادارہ کا قیام اور اس کی خدمات علم ودین کی عظیم خدمت، اور ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی ثقافت سے روحانی وفکری وابستگی، اور گہری محبت اور شغف کی دلیل ہے، مشرق ومغرب کے علم دوست حضرات اور مصنفین ومحققین نے اس عظیم ادارہ کی خدمات، اس کے کام

کی اہمیت، اور اس کے مطبوعات کی علمی وقعت کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔(۴۸)

عالم عربی میں تصنیف وتالیف اور بحث وتحقیق کا کام

عربی زبان جو عالم اسلام کی بین الممالک علمی زبان ہے، اور جو سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے، کہ اس میں اسلامی موضوعات پر اعلیٰ سے اعلیٰ معیار، اور وسیع سے وسیع تر پیمانہ پر کام انجام دیا جاتا، لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس زبان کی عظمت عالم عربی کی وسعت اور وسائل وامکانات کی کثرت کے مناسب ممالک عربیہ میں اس دور میں تحقیقی کام انجام نہیں پایا، لیکن بہر حال ایسی مثالیں موجود ہیں، جن کو علمی بحث و تحقیق، اور وسیع مواد کے لحاظ سے علمی و تحقیقی کوشش کا اچھا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے، ان کتابوں میں سر فہرست ڈاکٹر احمد امین کی **"فجر الاسلام"**، **"ضحی الاسلام"** اور **"ظہر الاسلام"** کا سلسلہ ہے، جو بعض علمی فروگذاشتوں، قابل تنقید اور شاذ آراء خیالات کے باوجود، قدیم مآخذ و مراجع میں منتشر مواد کو یکجا کرنے اور ترتیب دینے، اور ان کا تجزیہ کرنے، اور ان کے نتائج نکالنے میں (جو مستشرقین کا امتیاز سمجھا جاتا ہے) بلند پایہ اور قابل قدر تصنیفات ہیں، ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے حسن انشاء، سلاست وبر جستگی میں بھی (جو مولانا شبلیؒ کی یاد تازہ کرتی ہے) تاریخ نویسی، اور علمی مباحث پر قلم فرسائی کا اچھا نمونہ ہے۔

اس سلسلہ میں امیر البیان امیر شکیب ارسلان (م ۱۳۶۶ھ۔ ۱۹۴۶ء کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جو کوئی پیشہ ور مصنف نہ تھے، خاص طور پر ان کی جلیل القدر کتاب **"الحلل السندسیة فی الرحلة الاندلسیة"**، (۴۹) اندلس کے متعلق تفصیلات و معلومات کا ایک خزانہ ہے،

جن کا کسی ایک کتاب میں ملنا ممکن نہیں، ان کا دوسرا اہم کارنامہ **"حاضر العالم الاسلامی"** پر ان کے گرانقدر حواشی اور مستقل مضامین ہیں، یہ کتاب دراصل ایک امریکی فاضل (LOTHROP STODDARD) کی کتاب (THE NEW WORLD OF ISLAM) کا ترجمہ ہے، جو ایک فلسطینی ادیب عجاج نویھض کا کیا ہوا ہے، امیر شکیب ارسلان کے بیش قیمت اضافوں اور مستقل مضامین کے بعد یہ کتاب عالم اسلام کی عظیم شخصیتوں، تحریکوں، اور ممالک کے حالات پر ایک چھوٹا انسائیکلو پیڈیا بن گیا ہے، اس میں مستشرقین، یورپین مؤرخین کے بیانات پر مبصرانہ تنقید بھی کی گئی ہے، اور اسلامی تہذیب وتمدن، علمی سرگرمیوں کا قیمتی جائزہ بھی لیا گیا ہے، خلافت عثمانیہ اور ترکی کے بارے میں اس میں مستند ومتوازن معلومات (امیر کے براہ راست تعلق اور شاہد عینی ہونے کی بناء پر) ملتے ہیں، ان کی تیسری کتاب **"غزوات العرب فی فرنسا وشمالی ایطالیا وفی سویسرا"** بھی خاص اہمیت رکھتی ہے، اور تحقیقات ومعلومات کا ذخیرہ ہے۔

خیر الدین زرکلی کی کتاب **"الاعلام"** جو اصل کتاب استدراکات اور فوٹوؤں کے ساتھ بارہ جلد میں شائع ہوئی ہے، مصر عرب وغیر عرب، مسلمان اور مستشرق علماء اور مشہور شخصیات کے تراجم وسیر کی ایک عظیم ڈکشنری ہے، مصنف کا یہ انفرادی کارنامہ ایک اکیڈمی کی ناموری وافتخار کا بھی باعث ہو سکتا ہے، وسعت معلومات، جامعیت، حسن انتخاب اور جامع اختصار اور مصنفین ومحققین کو ضخیم مآخذ ومراجع سے مستغنی کرنے میں مصنف کی مہارت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔

اسی طرح استاذ عباس محمود العقاد، اور علامہ محمد کرد علی کی تصنیفات،

مطالعہ کی گہرائی، وسعت نظر، اور غیر عربی مآخذ سے گہری واقفیت کی آئینہ دار ہے، عباس محمود العقاد کا سلسلۂ عبقریات (۵۰) "**المرأة فى القرآن**" (عورت قرآن کی روشنی میں) "**اثر العرب فى الحضارة الاوربه**" (مغربی تہذیب پر عربوں کے اثرات) "**حقائق الاسلام وابا طيل خصومه**" (اسلام کے حقائق اور دشمنان اسلام کی افتراپردازیاں) علامہ کرد علی کی "**الاسلام والحضارة العربية**" (اسلام اور عربی تہذیب) اور "**خطط الشام**" (ملک شام کے عمرانی اور تمدنی حالات) علمی تصنیف اور انشاء پردازی، اور اکیڈمک اور انسائیکلوپیڈیائی کام کا نمونہ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر جواد علی کی "**تاريخ العرب قبل الاسلام**" (اسلام سے پہلے عربوں کی تاریخ) اور فواد سزکین کی کتاب "**تاريخ التراث العربى**" (عربی علمی ورثہ کی تاریخ) جامع اور تحقیقی کتابیں ہیں، جو بعض مسائل میں اختلاف رائے اور تنقید کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے قدرو تحسین کی مستحق ہے، فاضل عراقی جنرل اللواء محمود شیث خطاب کی "**قادة الفتح الاسلامى**" (اسلامی فتوحات کے قائدین) اور "**الرسول القائد**" (کمانڈر پیغمبر) کے عنوان سے علمی، تاریخی، اور فوجی معلومات کی اہمیت کے حامل اور وسیع مطالعہ پر مبنی ہے۔

اس موقعہ پر اس عظیم علمی منصوبہ، اور مفید و وسیع تصنیفی پروگرام کو نہیں بُھلایا جاسکتا جس کو "**موسوعة مقدمات العلوم والمناهج**" کے عنوان سے ہمارے فاضل مصری دوست انور الجندی چلارہے ہیں، اس سلسلہ کی پہلی جلد فکر اسلامی کے ساتھ خاص ہے، دوسری جلد کا تعلق تاریخ اسلام سے

ہے، تیسری جلد موجودہ عالم اسلامی سے، اور چوتھی جلد زبان وادب اور ثقافت سے متعلق ہے، یہ چاروں جلدیں شائع ہو چکی ہیں، پانچویں جلد مسیحی دعوت و تبلیغ، مستشرقین اور تخریب کار تحریکوں کے موضوع پر، چھٹی جلد مسلم سوسائٹی پر، ساتویں تہذیب و علم، اور سوشل سائنس کے موضوع پر، آٹھویں اسلام اور ادیان و مذاہب اور مختلف فلسفوں سے متعلق اس کے موقف پر، نویں شکوک و شبہات اور مشہور عوام غلطیوں یا غلط فہمیوں پر، اور دسویں جلد اسلامی بیداری، اور نشأۃ ثانیہ کے موضوع پر ہوگی، اگر اس کتاب کی تمام جلدیں تیار ہو گئیں تو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا، اور اسلامی علوم وادبیات کا ایک قیمتی کتب خانہ مرتب ہو جائے گا۔

استاذ خیر الدین الزرکلی کی "**الاعلام**" (قاموس تراجم) اور فواد سزکین کی "**تاریخ التراث العربی**" کی طرح عمر رضا کحالہ کی "**معجم المؤلفین**" بھی قابل ذکر ہے، جو عربی زبان میں کتابوں کے مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے، اور ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اگرچہ اس میں بہت سے معاصر مصنفین رہ گئے ہیں، لیکن یہ کوشش شکر و سپاس کی مستحق ہے۔ (۵۱)

خالص دینی اور شرعی موضوع پر اگر دیکھا جائے تو ائمہ مذاہب اور اسلامی فرقوں اور ان کے عقائد کی تاریخ پر نامور مصری فاضل علامہ محمد ابوزہرہ کی تصنیفات، ہمارے مجاہد اور داعی الی اللہ فاضل دوست ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم کی "**السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی**" (سنت اور اسلامی شریعت میں اس کا مقام) جو اپنے موضوع پر سب سے فائق اور جامع کتاب ہے، اسی طرح "**المرأۃ بین الفقہ والقانون**" (عورت فقہ اسلامی اور قانون

کی روشنی میں) اور ان کے رفیق اور ہمارے فاضل دوست مصطفیٰ احمد الزرقا کی کتاب "**المدخل الفقهی العام**" جو ایک عظیم علمی کوشش ہے، اور ان اسلامی ممالک کی ضرورت پوری کرتی ہے، جو شریعت اسلامیہ اور اسلامی سول قانون کے نفاذ کی خواہش رکھتے ہیں، اسی طرح استاد عبدالقادر عودہ شہید کی کتاب "**التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی**" ایک علمی و تحقیقی کام اور اہم قانونی بحث ہے۔

تحریک اخوان المسلمین کے ناموربانی امام حسن البنا کے والد گرامی شیخ احمد بن عبد الرحمٰن البنا الساعاتی کی "**الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد الشیبانی**" (۵۲) جو فقہی ابواب پر مسند امام احمد کی ترتیب و تحقیق پر مشتمل ہے، عظیم علمی کام بلکہ کارنامہ ہے، اسی موضوع پر علامہ احمد محمد شاکر کا انفرادی کام بھی اجتماعی اور پوری اکیڈمی کے کام پر بھاری ہے۔ (۵۳)

عمیق اسلامی تقابلی مطالعہ

اسی دوران شیخ ندیم الجسر مفتی طرابلس وشمالی لبنان کی کتاب "**قصة الایمان بین الفلسفة والعلم والقرآن**" شائع ہوئی ہے، جو ایک فقیہ اور عالم دین کی وسعت معلومات، فلسفہ قدیم وجدید پر گہری نظر، اور طبیعات اور فلکیات میں علم جدید کے انکشافات کے دقیق ووسیع مطالعہ کی دلیل، اسلامی عقائد کو ایک دلچسپ قصہ کے رنگ میں خوش اسلوبی سے پیش کرنے اور ٹھوس علمی دلائل سے اس کو ثابت کرنے کی کامیاب اور مؤثر کوشش ہے، اسی طرح عراقی عالم محمد باقر الصدر کی دو کتابیں "**اقتصادنا**" (ہماری اقتصادیات) جس کی پہلی جلد مختلف اقتصادی مکاتب فکر کے معروضی جائزہ، اور دوسری جلد اسلام کے اقتصادی

نظام کی تشکیل پر مشتمل ہے، اور ''**فلسفتنا**'' (ہمارا فلسفہ) جو موجودہ فکری کشمکش کا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے، عمیق تقابلی مطالعہ، وسیع معلومات، جدید نظاموں اور فلسفوں پر گہری نظر کی کھلی دلیل ہیں، یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ اعتراف ان دونوں کتابوں کے مضامین سے مکمل اتفاق کا مستلزم نہیں۔

ان کے بعد سید قطب کے مضامین ومقالات اور تصنیفات، جن میں سرفہرست ''**العدالة الاجتماعية في الاسلام**''(۵۴)(اسلام میں عدل اجتماعی (SOCIAL JUSTICE IN ISLAM)کا نام لیا جاسکتا ہے، اور ان کے بھائی محمد قطب کی تصنیفات، جیسے ''**شبهات حول الاسلام**'' اور اسلامی نفسیات اور اسلامی تربیت کے موضوع پر ان کی کتابیں، ڈاکٹر محمد بہی کی ''**الفكر الاسلامي الحديث**'' محمد المبارک (جن سے ابھی قریب ہی عرصہ میں عالم عربی اوراسلامی تحریک محروم ہوگئی) کی کتاب ''**في الفكر الاسلامي الحديث**'' اور محمد حسین کی کتاب ''**الاتجاهات الوطنية في الادب المعاصر**'' اور ''**حصوننا مهددة**'' وغیرہ تصنیفات کا دور آتا ہے، اور ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی ''**فقه الزكاة**'' اس موضوع پر ایک جامع کتاب اور دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

فکر اسلامی کے داعی اور دعوتی موضوعات پر لکھنے والے مصنفین

ہماری یہ بحث صرف ان کتابوں اور مضامین تک محدود ہے، جو علمی اور موسوعی (ENCYCLOPAEDIC) طرز پر لکھی گئیں، اور جن میں تقابلی

مطالعہ اور غیر ملکی زبانوں کے مراجع سے استفادہ اور ان موضوعات کو اختیار کیا گیا جو مستشرقین کے خاص موضوعات اور ان کی تصنیف و تالیف کا خاص میدان سمجھے جاتے ہیں، ورنہ مصر میں تحریک اخوان المسلمین کے اثر سے تصنیف و تالیف اور ادب و زبان کی ایک طاقتور تحریک وجود میں آگئی، اور ادب انشاء پردازی، اور تصنیف و تالیف کے کام، بحث و تحقیق کے اس دائرہ سے (جس سے صرف علماء اور ریسرچ اسکالرز کو دلچسپی تھی) نکل کر وسیع تر عوامی دائرہ میں داخل ہو گئے، اور ایسے انشاء پرداز اور مصنفین ابھر کر سامنے آئے، جنہوں نے عوام کو مخاطب کیا، اور ایمان، دینی خدمات، اور سعی و عمل کے اندرونی محرکات کو بیدار کیا، ان کی کتابیں غذائے عقلی کے ساتھ سامانِ دل بھی رکھتی ہیں، اور دونوں طرح سے پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سر فہرست سید قطب، محمد الغزالی، سید سابق مصنف کتاب "**فقه السنة**" ادیب کبیر علی طنطاوی وغیرہ آتے ہیں، ان مصنفین، اور ان کی اسلامی دعوتی تصنیفات کا جائزہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کے مورخ کا موضوع ہے، اور اس بحث کا میدان بڑا وسیع ہے، جس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔(۵۵)

جزیرۃ العرب میں علمی وتحقیقی کام

جزیرۃ العرب ایک زمانہ تک بحث و تحقیق کے اس قافلہ سے محروم رہا، جو خاص طور پر مصر و شام میں علمی مجالس (ACADEMIES) متعدد عظیم جامعات، اور موقر علمی رسائل و مجلات کی بناء پر سرگرم عمل تھا، لیکن سعودی حکومت کے دور میں اب اس نے اپنا علمی و تحقیقی سفر شروع کیا ہے، اور ایسے مقالات اور علمی بحثیں سامنے آئی ہیں، جو بحث و تحقیق کی روح اور علمی اور

انسائیکلوپیڈک طرز کی نمائندہ ہیں، ان کے اچھے نمونے شیخ حمد الجاسر (۵۶) کی جغرافیائی تحقیقی بحثوں، اور شیخ احمد عبد الغفور عطار کی لسانی تحقیقی مقالات (۵۷)، شیخ عبد القدوس انصاری کے آثار قدیمہ اور جزیرۃ العرب کے تمدنی حالات پر محققانہ مؤرخانہ مضامین (۵۸) اور محمد احمد باشمیل کے اسلامی جنگوں اور مشہور غزوات نبویہ پر ادبی و تحقیقی سلسلۂ مقالات میں نظر آتے ہیں (۵۹)۔

ان کے علاوہ فقہ و شریعت اسلامی، حدیث و تفسیر اور مسائل حاضرہ پر بھی متعدد علمی بحثیں، اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس میدان میں کام کرنے والوں کی فہرست طویل ہے، اور اس بات کا خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اس مختصر وقت میں وہ نام نہ رہ جائیں جو ذکر کے مستحق ہیں۔

شرق عربی کے بڑے بڑے اسلامی و عربی مراکز علوم و فنون میں بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور ناگفتہ بہ صورت حال نے بہت سے ممتاز عرب فضلاء، اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے اساتذہ و ماہرین فن، اور اسلامیات پر قابل قدر تحقیقی کام کرنے والوں کو زیادہ تر سعودی عرب، کویت، قطر، اور امارات عربیہ متحدہ میں، اور کسی قدر لبنان واردن میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، اس صورت حال نے ان ممالک کو جو "**بضاعت علم**" کو صرف درآمد کرتے تھے، برآمد کرنے پر قادر نہ تھے، بڑا فائدہ پہونچایا، وہاں کی یونیورسٹیوں میں ان کو جگہ دی گئی، اور بحث و تحقیق، علمی مقالات و مضامین اور ایم۔ اے اور پی، ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کا سلسلہ خاص طور پر سعودی عرب کی چھ (۶۰) یونیورسٹیوں، اور کویت یونیورسٹی، دوحہ کی قطر یونیورسٹی، اور امارات کی العین یونیورسٹی میں سرگرمی سے شروع ہو گیا، اور مختلف معیار و درجہ کی بحثیں اور ایم۔ اے اور پی، ایچ ڈی کے مقالات جن کی علمی

قدر و قیمت و افادیت میں تفاوت ضرور پایا جاتا ہے، لیکن انہوں نے عربی کتب خانہ میں بڑا قیمتی اور مفید اضافہ کیا، سامنے آئیں، ان ممالک میں علمی و فکری پناہ حاصل کرنے والے علماء و اساتذۂ فن اور اساتذہ یا زائرین (VISITING PROFES-SORS) کی فہرست طویل ہے، لیکن وہ ان جامعات کے لئے باعث صد افتخار اور خیر عمیم کا سرچشمہ ہیں۔

جامعات کی علمی بحثیں اور ڈاکٹریٹ کے مقالات

ڈاکٹریٹ کے مقالات اور جامعات میں طلبہ سے مطلوب علمی بحثوں کا نظام، جدید عصری اسلوب میں علمی بحثیں تیار کرنے اور اس کی مشق کرنے کے سلسلہ میں مفید ثابت ہوا، اگرچہ ان میں سے اکثر بحثیں اور مقالات، طلبہ کی کثرت، اور ذمہ دارانہ نگرانی کے فقدان، اور متعدد جامعات میں سنجیدہ اور علمی رہنمائی کی نایابی کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت اور علمی قدر و قیمت نہیں رکھتے، لیکن بعض ان خصوصیات کی حامل ہیں، جو مستشرقین کی تصنیفی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہیں، اس کے ساتھ بعض وہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، جو اہل زبان اور اسلامی موحول میں تربیت پانے والے نوجوانوں کا خاصہ ہیں، مثال کے طور پر ڈاکٹر ناصر الدین اسد کا مقالہ ''**مصادر الشعر الجاہلی**''(جو اب اضافوں کے ساتھ ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہوگیا ہے) ڈاکٹر شکری فیصل کا مقالہ ''**المجتمعات الاسلامیة فی القرن الاول**''(٦١)(ڈاکٹر عبد المنعم النمر (٦٢)(سابق وزیر اوقاف مصر) کا مقالہ بعنوان '**ابوالکلام آزاد**'' استاذ احمد ابراہیم شریف مدرس کلیۃ الآداب جامعۂ عین شمس کا مقالہ ''**مکہ والمدینة فی الجاہلیة وعہد الرسول** ﷺ''(٦٣)(ڈاکٹر نادیہ

حسنی صقر کا مقالہ "**الطائف فی العصرالجاہلی وفی صدر الاسلام** "(۶۴) ڈاکٹر محمد سید طنطاوی کا مقالہ "**بنواسرائیل فی القرآن والسنة**"اور ڈاکٹر رمزی نعناعہ کا مقالہ **الاسرائیلیات واثرھا فی کتب التفسیر** "وغیرہ کانام لیاجاسکتا ہے۔

ایران وترکی میں

ایران وترکی کی علمی وتحقیقی خدمات کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں ، ہاں ڈاکٹر سید حسین نصر کی انگریزی زبان میں کتابوں کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، جوبحث وتحقیق اور زبان کے اعلیٰ معیار کا نمونہ ہیں۔

مغرب اقصیٰ (مراکش والجزائر وغیرہ)

جہاں تک شمالی عرب مغرب کا تعلق ہے تو وہاں کا اسلامی عربی ومغربی مدرسہ فکر، وسعت مطالعہ ، صفائی زبان، اور حدیث وسنت کے مآخذ سے گہری واقفیت کاایک خاص امتیاز رکھتا ہے، علامہ عبدالحی کتانی حسنی کی تصنیفات، خاص طور پر ان کی کتاب "**التراتیب الادرایة فی نظام الحکومة النبویة** " ایک طرح کا دائرة المعارف ہے، جو وسیع معلومات اور بڑے اہم افادات سے مملو ہے۔

مغرب عربی نے بہت سے ایسے محققین اور مصنفین پیدا کئے ہیں، جن کی دینی معلومات پر گہری نظر ،اور جن کو شریعت اسلامیہ کے مقاصد اور حکمتوں کا عمیق فہم حاصل ہے،ان میں علامہ علال فاسی،(۶۵) شیخ طاہر بن عاشور،اوران کے فاضل صاحبزادہ فاضل بن عاشور مالک بن بنی، اور محمد بشیر الابراہیمی، سرِفہرست ہیں،اور محمد الفاسی، عبداللہ کنون، عبدالکریم الخطیب،مہدی بعبود،

عبدالسلام یٰسین، ڈاکٹر حبیب بلخوجہ، شاذلی النیفر اور احمد الحمانی جیسے علماء و محققین اپنی نگارشات وافادات، اور علمی بحثوں اور تحقیقات سے اسلامی عربی کتب خانہ میں قیمتی اضافہ کرتے رہتے ہیں، کچھ اور بھی انشاء پرداز مصنفین، اور محقق مضمون نگار ہیں جو مراکش سے نکلنے والے مجلہ "**دعوۃ الحق**" اور عالم عربی کے اس خطہ سے نکلنے والے دوسرے موقر علمی رسائل و مجلات کے صفحات پر نظر آتے ہیں، اور بحث و تحقیق کے میدان میں اچھے اور روشن مستقبل کا پتہ دیتے ہیں، ان کے اسماء گرامی کا احصاء دشوار ہے

آج کا جہاد اور حتمی فریضہ

اس مضمون کا اختتام میں اپنے ہی ایک رسالہ "**نیا طوفان**" کے ایک اقتباس سے (خفیف سی لفظی ترمیم کے ساتھ) نقل کر رہا ہوں :۔

"آج کا جہاد، وقت کا فریضہ، اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے، جو عالم اسلام کے سر سے گذر رہی ہے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب و مرکز پر حملہ آور ہے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے اصول و عقائد، اس کے مسلمات و حقائق، اور رسالت محمدی پر وہ اعتماد واپس لایا جائے، جس کا رشتہ اس طبقہ کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی دعوتی واصلاحی خدمت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن میں آج کا

تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے، اوراس کے قلب ودماغ کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کردیا جائے، آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے ان بنیادی افکار سے جو دل ودماغ میں گھر کرگئے ہیں، علم وعقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول و مبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔!

کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہاہے، شک والحاد، نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل ودماغ میں برپاکررکھاہے، غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہورہاہے، اور سیاست اور اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہورہے ہیں، کامل ایک صدی سے اس شکست وریخت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن ہمیں اس کے مقابلہ کی کوئی فکر نہیں ہوئی، ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق قدیم علمی ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں، ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نظر ہوتارہا، یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے گویا یکایک یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے، اور ایک ایسی

نسل تیار ہو کر بر سر اقتدار آچکی ہے، نہ جس کا دفاع اسلام کے عقائد و مبادی پر ایمان سے معمور ہے، نہ اس کا قلب اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت سے مخمور، اور نہ اس کا علاقہ اپنی مومن و مسلم قوم سے مستحکم ہے (اس کے سوا کہ قومیت کے خانہ میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے) اگر کچھ تعلق بھی ہے، تو وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک، اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر، صورت حال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج، اور لادینی انداز فکر ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستہ سے جمہور تک پہونچ چکا ہے، اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیانہ کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے، خاکم بدہن، وقت کی رفتار، وہ وقت قریب لارہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے کہیں بے دخل کر کے نہ رکھدیا جائے۔

یہ وقت عالم اسلام میں ایک نئی اسلامی دعوت کا متقاضی ہے، اس دعوت وجدوجہد کا نعرہ و نشانہ ہو "آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں" لیکن تنہا نعرہ کافی نہیں ہے، اس میں پہلے وہ نفسیاتی راستہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، جس سے عالم اسلام کے موجودہ برسر اقتدار طبقہ کے دل ودماغ تک پہونچا جا سکے، اور اسے اسلام کی طرف لوٹایا جا سکے"۔

(عربی سے ترجمہ۔ مولانا سید سلمان حسینی ندوی)۔

حواشی :۔

(۱) ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کے اسماء گرامی اور مرتب کتاب کے اصول و طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے کتاب کے مقدمہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

(۲) یہ کتاب صحاح ستہ، مسند الدارمی، موطا امام مالک و مسند امام احمد بن حنبل پر مشتمل ہے۔

(۳) مقالہ نگار نے مستشرقین کی صرف ان تصنیفات و تحقیقات پر اکتفا کیا ہے جو انگریزی میں ہیں، اور جو عام طور پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر طعن و تشنیع اور حقائق کی تحریف سے خالی ہیں، مقالہ نگار نے دوسری یوروپین زبانوں جیسے فرنچ، جرمن اور ڈچ زبانوں کی کتابوں سے تعرض نہیں کیا، کیونکہ وہ براہ راست ان سے واقف نہیں۔

(۴) مستشرقین نے سیرت نبوی اور تاریخ عرب کے موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں عہد جاہلیت اور زمانۂ ماقبل اسلام کی ایسی تصویر کشی کی ہے، کہ گویا انقلاب کا سب سامان تیار تھا، پیغمبر اسلام ﷺ نے صرف وقت شناسی سے کام لیا، اور سرا ان کے سر بندھ گیا۔

(۵) یہ کتاب اپنی جامعیت اور مصنف کی محنت اور وسعت معلومات کی بنا پر قابل قدر و لائق استفادہ ہے لیکن اس پر کلی اعتماد اور انحصار صحیح نہیں ہے۔

(۶) یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ لاہور کی پنجاب یونیورسٹی میں اردو اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا جو کام ہوا ہے اور جاری ہے، وہ حذف و اضافہ، تنقیحات و تشریحات کے ایک مستقل علمی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۷) راقم سطور کو جولائی ۱۹۷۸ء میں لاہور کے قیام کے دوران یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ پروفیسر ظفر علی قریشی صاحب نے مستشرقین کی سیرت النبی ﷺ پر تمام تصنیفات و مقالات جمع کرنے اور ان پر علمی تنقید، محاسبہ اور تردید کا کام شروع کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مفصل قیمتی بحث انگریزی میں لکھی ہے جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، راقم سطور ان کی اس انفرادی رضاکارانہ کوشش اور ان کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھ کر متاثر اور مسرور ہوا، ساتھ ساتھ ہی اس پر متعجب بھی، کہ کسی مسلم حکومت یا بڑے ادارہ کی طرف سے اس کام کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا ثبوت نہیں دیا گیا۔

(۸) یہی وہ چار زبانیں ہیں جن میں اسلامی موضوعات پر بکثرت تصنیفات اور مقالات شائع ہوئے ہیں۔

(۹) اس پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) نے جب اپنی مشہور انگریزی کتاب (LIFE OF MOHAMED) لکھی، جس میں مسیحی تعصب سے کام لیا گیا تھا اور حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تو سر سید احمد خاں (جو جدید مغربی تعلیم کے اولین نقیب تھے، اور انگریزی حکومت کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے) اس کو برداشت نہ

کر سکے، انہوں نے ۱۸۶۹ء میں اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے لندن کا سفر کیا، اور اس کی خاطر اپنا بہت سامال واثاثہ فروخت کر دیا، ان کی کتاب خطبات احمدیہ غالباً اس میدان میں عالم اسلام میں اس نوع کی پہلی کوشش تھی، جس کی اہمیت اور افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۰) انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے حاصل کی تھی، انہوں نے ۱۸۵۷ء کے رستخیز زمانہ میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا، اور انگریز اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ مسلمان دینی وسیاسی دونوں حیثیتوں سے ان کے اصل حریف ہیں، اس لئے ان کے غم وغصہ کا زیادہ تر رخ مسلمانوں ہی کی طرف تھا، اور ان کی مشنری سرگرمیوں کا میدان مسلمان ہی تھے۔

(۱۱) اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن ۱۸۴۹ء میں آگرہ سے، اردو میں تیسرا ایڈیشن ۱۸۵۰ء میں اور انگریزی ترجمہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔

(۱۲) اثبات حقانیت اسلام اور عیسائیت کی تنقید کے موضوع پر مولانا رحمت اللہ صاحب کی تین اور کتابیں ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں: ازالة الاوہام ، ازالة الشكوك اور اصح الاحاديث فى ابطال التثليث۔

(۱۳) ملاحظہ ہو مقدمہ اظہار الحق طبع حکومت قطر ۱۹۸۱ء۔

(۱۴) دار المصنفین کا یہ سیمینار فروری ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہو رہا تھا۔

(۱۵) ماخوذ از زعماء الاصلاح فى العصر الحديث از ڈاکٹر احمد امین ص ۱۴۰۔

(۱۶) مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی، کتاب کی پہلی جلد وان کریمر (VON KREMER) کی جرمن کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے۔

(۱۷) خود ان کے مداح وممدوح مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے بعض شاذ افکار وخیالات سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔

(۱۸) تاج کمپنی نے اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تھا، مولانا نے اس پر مفصل نظر ثانی فرمائی، اب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ اس کا دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔

(۱۹) قادیانیوں سے (جو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نبوت کے صراحت کے ساتھ قائل ہیں) سے الگ ہونے والی شاخ کے یہ صدر تھے، اس شاخ کا یہ عقیدہ ہے کہ مرزا صاحب چودھویں صدی کے مجدد اور مصلح اعظم تھے، اسی کے ساتھ وہ مسیح موعود تھے، یہاں تک وہ قادیانیوں سے متفق ہیں، عام مسلمان احمدیوں کو بھی غیر اسلامی اقلیت سمجھتے ہیں، پاکستان کی سرکاری قرارداد میں اس بات کی تصریح ہے، جماعت احمدیہ کے عقائد وخیالات معلوم کرنے کے لئے مصنف کی کتاب "قادیانیت ایک جائزہ ایک مطالعہ" کے باب "لاہوری شاخ"

کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(۲۰)اس کے دلچسپ نمونے ہماری کتاب "قادیانیت" کی تیسری فصل "لاہوری شاخ" میں دیکھے جاسکتے ہیں:۔
اس موقعہ پر اس علمی اور تاریخی حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم کے داعی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم سب سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے یہ راستہ کھولا۔ اور اپنی تفسیر قرآن "تفسیر احمدیہ" میں یہ خیالات ظاہر کئے، ان کے بعد آنے والوں نے عموماً انہیں کی خوشہ چینی کی اور ان کے مسلک کو اختیار کیا، اور پھر اکثر جیسا کہ ایسے رجحانات کا طبعی تقاضہ ہے ان سے بھی بہت آگے بڑھ گئے۔

(۲۱)اب وہ اہلسنت والجماعت اور جمہور مسلمین کے نمائندوں کے انتظام میں آگیا ہے۔

(۲۲)عالمگیر اور رنگ زیب کے حالات پر (جن کی ذات غیر مسلم مورخین کے اعتراضات والزامات کا عرصہ سے نشانہ بنی ہوئی ہے) ان کی فاضلانہ کتاب (AURANGZEB AND HIS AGE) ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکی ہے اور اس موضوع پر امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲۳)ان کی کتاب MUSLIM THOUGHT AND ITS SOURCE (فکر اسلامی اور اس کے سرچشمے) اپنے موضوع پر ایک ممتاز تصنیف ہے۔

(۲۴)کتاب کا ایک ہندی ترجمہ شائع ہو چکا ہے، دوسرا زیر ترتیب ہے۔

(۲۵)اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے کیا ہے۔

(۲۶)مجھ سے انگریزی کے ایک صاحبِ نظر اہل قلم نے کہا کہ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) کا انگریزی ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کی ایک کامیاب مثال ہے، شاید کسی غیر انگریزی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں اس سے بہتر ہوا ہو۔

(۲۷) یہ کتاب پہلی مرتبہ آسی پریس لکھنؤ سے بڑی تقطیع کے ۸۲ صفحات پر شائع ہوئی۔

(۲۸)دارالمصنفین کا قیام علامہ شبلی کے دل کی آرزو تھی، اور اس کا منصوبہ انہوں نے خود بنایا، اس کے لئے اعظم گڑھ میں اپنی مملوکہ جائداد وقف کی، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی، اس کا قیام ان کے تلمیذ رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں ان کی وفات (۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء) کے چندروز بعد ہی عمل میں آیا، اس کے پہلے صدر مولانا حمید الدین فراہی ناظم مولانا سید سلیمان ندوی اور مہتمم امور مولانا مسعود ندوی قرار پائے۔

(۲۹) یہ ترجمہ ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء و شیخ الجامعۃ العباسیۃ بہاولپور) نے کیا ہے، عرب ممالک میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۳۰) ندوۃ المصنفین کی اہم مطبوعات میں "ترجمان السنۃ" (۱ تا ۴) مؤلفہ مولانا بدر عالم میرٹھی، "تنزیل

ومدفون"، "مدینہ منورہ"، "قصص القرآن" مؤلفہ مولانا حفظ الرحمٰن "الرق فی الاسلام" اور "صدیق اکبر" مؤلفہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اور "تاریخ مشائخ چشت" مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

(۳۱) اس سلسلہ میں راقم سطور کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" ملاحظہ کی جائے جس کے عربی اور انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

(۳۲) پاکستان میں شائع ہونے والے مجلات ورسائل، کتابوں، فکری اور تحقیقی اداروں، اور علمی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ، اور وسیع مطالعہ ان غیر فطری اور مصنوعی رکاوٹوں کی بنا پر قدرے دشوار ہے، جو دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان حائل تھیں، اس لئے اختصار پر مجبور ہونا پڑا۔

(۳۳) ان کی انگریزی میں دو اہم کتابیں ہیں ایک (MANIFESTO OF ISLAM) دوسری (IDEOLOGY OF FUTURE)

(۳۴) نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "فاضل مؤلف نے جس خوبی سے اس مختصر رسالہ میں گجرات کی اسلامی تاریخ کے مختلف پہلو دکھائے ہیں، وہ فی الواقع مؤرخانہ وادیبانہ دونوں حیثیت سے قابل داد ہے، یہ مولویوں کے طبقہ کی ایک دل کش صدا ہے، جن کی نسبت جدید حالات بدمذاقی کا فیصلہ صادر کرچکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ جدید خیالات خود اپنے تاریخی مذاق کی خوبی کا ثبوت کب پیش کریں گے"۔ (یادایام مطبوعہ ۱۹۱۹ء مقدمہ ص ۲

(۳۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "حیات عبدالحی" مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ از ص ۳۱۴ تا ۳۴۷۔

(۳۶) جلد اول ص ۲۹۔

(۳۷) دائرۃ المعارف حیدر آباد سے اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

(۳۸) ہندوستان سے باہر طبقات وتراجم پر لکھی جانے والی تمام کتابیں، یا تو صدیوں یا علاقوں یا متعین طبقات (جیسے طبقۂ محدثین، طبقۂ فقہاء نحویین وغیرہ) کے ساتھ مخصوص ہیں، اس کے برخلاف یہ کتاب تمام قابل ذکر شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے، خواہ وہ کسی صدی، کسی علاقہ یا کسی علمی طبقہ سے متعلق ہوں۔

(۳۹) مصنف نے اس کا نام "معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف" رکھا تھا، دمشق کی رائل اکیڈمی (المجمع العلمی العربی) نے جب اس کی طباعت کا فیصلہ کیا تو اس کا نام "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" رکھ دیا کہ اس سے کتاب کے موضوع پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

(۴۰) کتاب کے مترجم مولوی ابو العرفان خاں ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء ہیں۔

(۴۱) اس کا نام بھی مصنف نے اس زمانہ کے مذاق کے مطابق "جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق" رکھا تھا، دائرۃ المعارف سے اس کی طباعت کے موقع پر اس کا زیادہ عام فہم نام تجویز کیا گیا جو موضوع پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

(۴۲) اردو ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، اور انگریزی ترجمہ سید محی الدین صاحب کے قلم سے ہے۔

(۴۳) دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سلسلۂ مطبوعات میں یہ کتاب مطبعہ سلفیہ قاہرہ سے ۱۳۴۴ھ۔ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی کتاب پر علامہ احمد تیمور، شیخ احمد الاسکندری، شیخ عبدالوہاب نجار، اور علامہ احمد محمد شاکر جیسے ادباء وقت و محققین لغت کی تقریظات ہیں۔

(۴۴) یہ کتاب مصر میں لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر کی طرف سے ۱۹۳۶ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۴۵) افسوس ہے کہ ان سطور کی تحریر کے بعد اور ترجمہ کے درمیان (حجازی تقویم کے اعتبار سے) ۲۸ ررجب اور ہندوستان کی رویئت کے لحاظ سے ۲۹ رجب ۱۴۰۲ھ (۲۴ مئی ۱۹۸۲ء) کو بروز دوشنبہ بعد عصر مدینہ منورہ میں ارتحال فرمایا اور اپنی تمنا اور دیرینہ آرزوں کے مطابق بقیع شریف میں آسودہ خاک ہوئے۔

(۴۶) اس کتاب کو مجلس علمی نے جس کے مراکز سملک ڈابھیل، کراچی، اور جوہانسبرگ میں ہیں، اور جسے مولانا محمد میاں سملکی نزیل جوہانسبرگ (م ۱۳۸۲ھ۔ ۱۹۶۲ء) نے قائم کیا تھا، بیروت سے شائع کیا۔

(۴۷) م ۱۹۸۱ء

(۴۸) دائرۃ المعارف کی چند اہم مطبوعات حسب ذیل ہیں، "مسند ابی داؤد الطیالسی"، "امام بیہقی" کی السنن الکبریٰ"، اور حاکم نیشاپوری کی "المستدرک" اور "معارفۃ علوم الحدیث"، ابن عبدالبر کی "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب"، امام ذہبی کی "تذکرۃ الحفاظ"، حافظ ابن حجر کی "تہذیب التہذیب"، امام بخاری کی "التاریخ الکبیر"، ابن الجوزی کی "المنتظم فی تاریخ الامم" اور بیرونی کی "تحقیق ماللہند"، ابن ماکولا کی "الاکمال"، ابو علی المرزوقی کی "الازمنۃ والامکنۃ۔

(۴۹) اصل کتاب۔ ۱۰ جلدوں میں ہے، مصنف کی زندگی میں اس کی تین جلدیں شائع ہوئیں۔

(۵۰) انہوں نے عبقریات کے عنوان سے آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین، اور بعض اکابر صحابہ کی سیرت اس انداز سے لکھی ہے کہ ان کی انسانی عظمت نمایاں ہو، یہ نفسیات انسانی اور فلسفۂ سیرت کا ایک خاص انداز نگارش ہے۔

(۵۱) ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی، مکتبۃ المثنیٰ اور دار احیاء التراث العربی سے شائع ہوئی۔

(۵۲) افسوس ہے یہ کام مکمل نہ ہوسکا، اس کتاب کی ۲۲ جلدیں شائع ہو سکی ہیں، کتاب کے ساتھ "بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی" بھی ہے، اخوان المسلمون کے پریس سے شائع ہوئی ہے۔

(۵۳) علامہ احمد محمد شاکر نے کتاب میں احادیث کی تخریج کی، احادیث کا نمبر شمار ذکر کیا، اور موضوعات کی

فہرست تیار کی، اور نہایت قیمتی حواشی لکھے، لیکن کتاب کی تکمیل سے پہلے وفات پاگئے، کتاب ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۵۴) صاحب مقالہ کو (مصنف سے ذاتی تعلقات کے باوجود) کتاب کے اس حصہ سے کھلا ہوا اختلاف ہے، جو خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی تنقید پر مشتمل ہے، نیز ان کے ان خیالات سے بھی کلیۃً اتفاق نہیں جن کا اظہار انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بارہ میں کیا ہے۔

(۵۵) ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی مجلہ "البعث الاسلامی" میں عزیزی مولوی سید واضح رشید ندوی سلمہ (استاد دار العلوم) کے مقالات کی کئی قسطیں "اسلامی بیداری کا ادب" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں، جن کا اسی موضوع سے تعلق ہے، (دیکھئے "البعث الاسلامی" شمارہ نمبر ۸، ۹، ۱۰ مجلد ۶) ۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء) یہ مضامین مستقل کتاب کی شکل میں بھی شائع ہونے والے ہیں۔

(۵۶) یہ "فی سراۃ غامد وزہران" اور "فی شمال عزب الجزیرۃ" کے مصنف ہیں اور "الموسوعۃ الجغرافیۃ لجزیرۃ العرب" میں مقالہ نگار، جس کی پندرہ جلدیں دار الیمامہ للبحث والترجمۃ والنشر، ریاض سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۵۷) جیسے "الصحاح ومدارس المعجمات العربیۃ" اور زنجانی کی "تہذیب الصحاح"، جوہری کی "الصحاح" اور ازہری کی "مقدمۃ تہذیب اللغۃ" کی تحقیق۔

(۵۸) جیسے "آثار المدینۃ المنورۃ" اور "مدینۃ جدہ"

(۵۹) اس کے دس اجزا شائع ہو چکے ہیں، جو "غزوۂ بدر"، غزوۂ احد"، "غزوۂ احزاب"، "غزوہ بنی قریظہ"، "صلح الحدیبیۃ"، غزوۂ خیبر"، "غزوہ موتہ"، "فتح مکہ"، "غزوہ حنین"، اور "غزوہ تبوک" پر مشتمل ہیں۔

(۶۰) یہ یونیورسٹیاں حسب ذیل ہیں "جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ"، ریاض "جامعۃ الریاض"، جامعۃ الملک عبد العزیز"، جدہ، جامعۃ ام القریٰ۔ مکہ معظمہ، الجامعۃ الاسلامیہ۔ مدینہ منورہ۔ جامعۃ البترول۔ ظہران۔

(۶۱) مکتبۃ المثنی بغداد سے شائع ہوئی اور پھر خانجی مصر سے ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

(۶۲) ان کی ایک کتاب "تاریخ الاسلام فی الہند" اور ایک "کفاح المسلمین فی تحریر الہند" کے نام سے ہے، جو ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کسی غیر ہندوستانی کے قلم سے سب سے بہتر کتاب ہے۔

(۶۳) دار الفکر العربی۔ مصر سے شائع ہوئی۔

(۶۴) دار الشروق جدہ سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔

(۶۵) ان کی اہم تصنیفات میں "مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ ومکارمہا" اور "دفاع عن الشریعۃ" کا شمار ہے۔

اقوامِ عالم کے درمیان اُمّتِ اسلامیہ کا حقیقی وزن

اور

دنیا میں اس کی کارگردگی کا اصلی میدان

یہ مقالہ دراصل عربی مین لکھا گیا تھا۔ جسے دوحہ (قطر) یونیورسیٹی کے تعلیمی اسٹاف اور تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک نشست میں ۱۳؍ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ کو پڑھا گیا تھا، اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا اردو ترجمہ اس کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقوامِ عالم کے درمیان اُمّتِ اسلامیہ کا حقیقی وزن
اور
دنیا میں اس کی کارگردگی کا اصلی میدان

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدرٍوَّ أَنتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا للّٰه لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ(سورۃ آل عمران ۔ ۱۲۳)اور یہ بات محقق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم بے سروسامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکر گزار رہو،

اس آیت کریمہ میں معرکہ بدر کا ذکر ہے، مختصر سی آیت ہے لیکن اس کے اندر ہمارے لئے بہت سامان عبرت ہے، یہ ایک ایسا سبق ہے جو ہمشہ ہمیشہ کے لئے ہماری فکر کو جلا بخشتا رہے گا اور عزائم کو سینوں میں بیدار رکھے گا، یہی نہیں بلکہ اس آیت میں ہماری حیثیت کا تعین بھی ہے، اقوام عالم میں ہمارا کیا کردار ہونا چاہئے، اس کی طرف واضح رہنمائی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے وہ حصے جن کو ہم عالم اسلام کہتے ہیں، جن میں حکومتیں بھی ہیں اور ریاستیں بھی، دولت کی ریل پیل بھی ہے، زندگی کی آسائشیں

بھی موجود ہیں، علم و فن کا بھی چرچا ہے، کتب خانے، مدرسے اور یونیورسیٹیاں بھی ہیں، زندگی کی سرگرمیوں کے تمام میدان موجود ہیں، یہ سب کے سب بلا کسی استثناء کے معرکہ بدر میں فتح و نصرت کا صدقہ ہیں، اگر خدانخواستہ اس جنگ میں کفار کی سازش کامیاب ہو جاتی ایسی سازش جس کا جال بڑی ذہانت اور فکری کاوش سے تیار کیا گیا تھا، اور قریش کے کفار نے اپنی ترکش کا ہر تیر نکال کر رکھ دیا تھا، اگر خدانخواستہ ان کی سازشیں کام کر جاتیں اور مسلمانوں کی شکست ہو جاتی تو آج عالم اسلامی کا وجود نہ ہوتا، نہ علمی سرگرمیاں ہوتیں، نہ حکومت و جہاں بانی کا کوئی خواب دیکھ سکتا، جب زندگی ہی سرے سے نہ ہوتی تو پھر زندگی کے مظاہر بھی نہ ہوتے، یہی تاریخ کی ٹھوس، ناقابل انکار اور پائدار حقیقت ہے۔

حضرات! آپ مجھے کہنے دیجئے کہ آج زمین کا ہر وہ چپہ، ہر شہر اور علاقہ جو مسلمانوں سے آباد ہے جس کو عالم اسلام میں شمار کرتے ہیں، یہاں تک کہ بر صغیر ہند، جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی، وسیع آبادیاں ہیں، اسی طرح مسلمانان مصر، مسلمانان شام، مسلمانان عراق، و ترکی اور وہ تمام مسلمان جن سے مشرق اقصیٰ، عالم عرب، مشرقی جنوبی ایشیا آباد ہے، اگرچہ ان کی ریاستیں جدا جدا ہیں اور ان کے مقامی مسائل و مشکلات متنوع ہیں، ان میں گروہ بندیاں بھی ہیں، اور مقامی رنگ روپ بھی علحدہ علحدہ ہیں اور ان میں بے شمار تہذیبیں خاندان اور مقامی رنگ بھی داخل ہیں یہ سب کے سب آج اس لئے مسلمان کہے جاتے ہیں کہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلانوں کو فتحیاب کر دیا تھا، آج جو کچھ ہے اسی جنگ بدر میں فتح یابی کا صدقہ اور اس کا پرتو ہے۔

اگر کہیں اس جنگ میں مسلمان ناکام ہو جاتے تو صاف سن لیجئے کہ عالم اسلامی نام کی کوئی چیز اس آسمان کے نیچے نہ دکھائی دیتی، اسلامی دعوت و تبلیغ کو دنیا

میں اپنی راہ نکالنے کا کوئی راستہ نہ ہوتا، دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت، ملکوں کو فتح کرنے کی قوت، اس کے نام پر حکومتیں بنانے کا حوصلہ، اداروں، مدرسوں اور کتب خانوں کی یہ چمک دمک، یہ سرگرمیاں اور نشاط و قوت کے مظاہر سب ناپید ہوتے، نہ اس قوم میں کوئی نادرۂ روزگا عالم و صاحب فن ہوتا نہ اولیاء و صالحین کی کوئی جماعت ہوتی اور نہ آوازۂ حق کہیں سنائی دیتا۔

لیکن آپ حضرات میں جن کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے، تاریخ و سیرت نبوی کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ اس معرکہ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے جب گزرتے ہیں تو ایک اور صرف ایک جملہ ان کی توجہات کا مرکز بن جاتا ہے وہ حیرت و عظمت کے جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو سرسری طور پر اس جملہ کو پڑھتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھ کر گزر جاتے ہیں، حالانکہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اس کو سرسری اور سطحی طور پر کوئی پڑھ کر گزر جائے، یہ جملہ حیران و ششدر کرنے والا جملہ ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ کا معائنہ فرمایا اور صحیح صورت حال کا جائزہ لیا اور کفار کی قوت، ان کے سر و سامان، جنگی ہتھیار تعداد کی کثرت، اور انتقام سے بھرے کفار کے تیور دیکھے تو آپ کو مسلمانوں کی تعداد اور سامان جنگ کی انتہائی قلت نظر آئی، جو لوگ مکہ سے اس عزم و جوش سے نکلے تھے کہ اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں گے، ان میں سے ایک ایک کی آنکھ میں خون اترا ہوا تھا، دوسری طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو کفار کی مہم کو ناکام بنانے کے لئے آئے تھے، جہاد فی سبیل اللہ جن کا مقصد اور آخرت جن کا مقصود تھی، دونوں فوجوں کے درمیان فرق معمولی نہیں غیر معمولی تھا، سامان جنگ اور جنگی تجربات اور تعداد

کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ مسلمان ان کفار کا مقابلہ کر سکتے، وہ ہزار کی تعداد میں تھے اور یہ صرف تین سو تیرہ، (۱) انبیاء کرام علیھم السلام باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر ہمیشہ بھروسہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین ان کا اصلی اثاثہ ہوتا ہے، پھر بھی ناموس فطرت اور دنیائے اسباب کی سنت سے بھی واقف ہوتے ہیں اس لئے وہ کبھی حقائق کا جائزہ لینے سے غافل نہیں رہتے۔

چنانچہ جب رسول ﷺ نے دونوں فریقوں کے درمیان اس درجہ نمایاں اور بھیانک فرق کو دیکھا اور سامان اور تعداد کی کثرت جو حملہ آور کفار کے قبضہ میں تھی اور اس کی قلت جو دفاعی مورچہ میں مسلمانوں کے پاس تھی دونوں کا موازنہ کیا تو ملاحظہ فرمایا کہ فرق معمولی نہیں ہے، ایسے موقع پر نظام کائنات اور سنت تکوینی کا تقاضہ تھا کہ آپ ظاہری اسباب سے صرفِ نظر نہ فرماتے لہذا آپ کو صاف نظر آگیا کہ مسلمانوں کی فتح صرف قوت کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتی، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے فریادرسی نہ ہو، ان کمزور اور نہتے مسلمانوں کی دستگیری عالم غیب سے نہ ہوتی تو کامیابی مشکل ہی نہیں محال ہے، واضح طور پر بالکل کھلی مدد کی ضرورت تھی جو تمام تصورات و تخمینات، اندازوں اور جائزوں سے ماوراء، خرق عادت اور معجزہ کی شکل میں سامنے آئے۔

کہاں ایک ہزار مسلح بکتر بند ماہرین جنگ اور کہاں ۳۱۳ مسلمان، جن میں بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ نوخیز نوعمر صاحبزادگان بھی تھے، آپ نے اس منظر کو دیکھ کر حالات کا جائزہ لینے میں کمی نہیں کی کیونکہ یہ آپ کے فرائض نبوت و قیادت میں داخل تھا، اس حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہو کر عرض کیا:۔

اللهم إن تهلك هذه العصابة لا تعبد۔ یعنی اے اللہ! اگر تو نے اس مختصر جماعت (جو مسلمانوں کی یہاں جمع ہے) کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہو گی۔

یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، کس کی مجال تھی کہ ایسی بات اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہے ؟ کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایسا ہو گا اور ایسا کیا تو یہ ہو گا، پھر پیغمبر بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر چنا ہوا، محبوب، باوقار، باوجاہت، ایسا رسول جس کو اللہ نے منتخب ہی اس لئے کیا تھا کہ اس کے پیغام اور لائے ہوئے دین کو قیامت تک باقی رکھے گا اور ہمیشہ اس کا ناصر ومددگار ہو گا وہ کہے، "اگر تو نے مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہو گی" یعنی اے اللہ! اگر تو نے اس جماعت کی شکست کرادی تو دنیا کا تو کوئی نقصان نہ ہو گا، انسانیت کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، دنیا کی حکومتیں اور دنیا کے ملک اسی طرح رہیں گے جس طرح آج ہیں، دنیا کے خزانوں میں کمی نہیں آئے گی، دنیا میں کمانے کھانے کے جو کام ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ہوتے رہیں گے، بڑے دانشور، حکمت ودانائی میں ممتاز افراد جس طرح ہوتے آئے ہیں اس طرح پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے، لیکن صرف ایک بات جو نہیں ہو گی وہ ہے خالص تیری ذات پاک کی عبادت، تیرے احکام کا دنیا میں نفاذ اور تیرے دین حنیف کی بقاء، یہ کام نہیں ہو گا اور سب کچھ ہو گا، کیوں کہ اپنی تعداد میں کمی اور دفاعی اسلحہ میں ناقص ہونے کے باوجود روئے زمین پر تنہا یہی جماعت ہے جو توحید کی داعی اور تیری عبادت گزار ہے، جس کا بھروسہ صرف تجھ پر اور جس کا اعتماد تیری ذات پاک پر ہے، جس کی عبادت صرف تیری ذات پاک کے لئے ہے اور جس کو یقین ہے کہ کائنات پر صرف تیرا تصرف ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے تو ہی قادر

مطلق، حاکم مطلق اور مالک الملک ہے عبادت وطاعت کا تنہا سزاوار ہے، صرف تیرے احکام اور صرف تیری شریعت کا یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر نافذ ہو اور بے چون و چرا اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

سیرت نبویؐ میں ان سطور کو پڑھنے والا اگر ہوشمند ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال سے واقف ہے اور اس کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی و بے نیازی کیا معنی رکھتی ہے، اس کی قادر و قاہر ذات جو ساری مخلوقات سے بے نیاز ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے جو غنی بھی ہے اور قوی بھی ہے، اس حقیقت کا ادارک رکھنے والا شخص جب رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ پڑھتا ہے اور وہ بھی ایسے نازک لمحات میں جو خوف وہراس سے پُر ہیں اور جب کہ سوائے الحاح وزاری اور اس کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں وہ حیران رہ جاتا ہے، ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور غنی ذات کو دیکھتا ہے دوسری طرف رسول برحق کی زبان پاک سے، ایسے الفاظ سنتا ہے جس کا مطلب یہ کہ اے اللہ! اگر تو نے اس مختصر گروہ کو ختم کردیا تو تیری حکمرانی باقی نہیں رہے گی، ایسے پُرہول لمحات میں یہ دعاء اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی، کیونکہ یہ بات جو رسول برحق ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی تھی وحی خداوندی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تھا اللہ حاضر و ناظر، غیب و موجود کو جاننے والا ہے، وہ مسلمانوں کی بے بسی، کمزوری، تعداد کی کمی اور اسلحہ کی قلت کو دیکھ رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ مقابلہ میں جو دشمن ہیں وہ کس درجہ اسلحہ سے لیس اور کتنی بڑی تعداد میں ہیں، اس عظیم تفاوت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے ہم کنار کیا۔

لہذا یہ بات آئینہ کی طرح روشن ہوکر ثابت ہوگئی کہ مسلمانوں کو باقی

صرف اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے وجود سے دعوت الی اللہ کا سلسلہ قائم رہے گا اور ان کی بقاو سربلندی کی صرف یہی شرط ہے، کہ وہ اس دعوت پر قائم رہیں، تاکہ خدائے عزوجل کی عبادت ہوتی رہے اور اس کی حکمت مطلقہ کو تسلیم کیا جائے، اور اس کی شریعت کے احکام دنیا پر نافذ ہوں، اور اگر مسلمانوں نے کہیں اپنی خصوصیت ضائع کردی تو مجھے صاف صاف کہنے دیجئے کہ خواہ جتنے مسلمان ہیں سب کے سب والیان ریاست اور ارباب حکومت بن جائیں (میں کسی ریاست یا صاحبِ ریاست کا حاسد یا بدخواہ نہیں ہوں بلکہ جتنی مسلم ریاستیں ہیں ان کے لئے دعاگو ہوں اور ان کی ترقی و خوش حالی کا متمنی ہوں) لیکن یہ کہتا ہوں کہ امت اسلامیہ نے اگر اپنا یہ امتیاز کھو دیا، وہ واحد امتیاز جو ان کے بقاء کا ضامن ہے اور جس کے صدقہ میں ان کو بحیثیت مسلم زندگی عطا کی گئی ہے یعنی اللہ کے دین کی دعوت اور صرف اس کی عبادت اور اس کے احکام کو بلا چون وچرا تسلیم کرنے کا امتیاز، اس کی شریعت اور احکام شریعت کو فرد اور سوسائٹی پر پوری طرح نافذ کرنے والی امت ہونے کا امتیاز، جو زندگی دینی تعلیمات و حکام کے مطابق ہو اس زندگی کو عام کرنے اور رائج کرنے کا عزم رکھنے کا امتیاز، اگر یہ امتیاز خدانخواستہ مفقود ہو گیا تو خواہ دنیا کی دولت ان کو مل جائے پھر بھی ان کے وجود وبقاء کی کوئی ضمانت نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ "اے اللہ! اگر تو نے ان مٹھی بھر تعداد رکھنے والے مسلمانوں کی غیبی مدد نہیں کی تو روئے زمین پر کوئی تیرا نام لینے والا نہیں رہے گا" یہ بات بلا شبہ صرف ایک پیغمبر برحق ہی کہہ سکتا ہے، جس پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہو اور جس کی عند اللہ حیثیت ہو، لہذا میں پوری صراحت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمان دعوت حق سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے

جو ان کے سپرد کی گئی ہے اور جس کی خاطر ان کو سر فراز کیا گیا ہے تو پھر دنیا میں ان کے حفظ و بقاء کی کوئی ضمانت نہیں لی جاسکتی، خواہ ان کے پاس فوجی طاقت ہو، عددی طاقت ہو، اقتصادی طاقت ہو، بہتر سے بہتر مواقع میسر ہوں اور جو بھی جاہ و حشمت ان کو ملی ہو سب بے کار اور سب بے سود، بے نفع ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت ان کی اسی صفت کی بنا پر کی تھی کہ "اگر یہ نہ رہے تو تیری عبادت نہ ہو گی" یوں سب کچھ ان کو مل سکتا ہے، یہ سب کچھ پا سکتے ہیں، حکومتیں ملتی رہیں گی، دولت پا سکتے ہیں، مگر امانت خداوندی یعنی دعوت الی اللہ جس سے صرف اللہ کی پرستش ہو اور اس کا پیغام سرمدی دنیا میں باقی رہے اور غلبہ و سطوت صرف اللہ کا رہے، اس کے احکام زمین پر جاری ہوں، زندگی کے ہر موڑ پر اس کے احکام کی پیروی ہو اور دینی تعلیمات تمام بدلتے ہوئے حالات میں رہنما ہوں، یہ نہیں ہوگا، اور جب یہ نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت و نوازش بے پایاں سے، امت محروم ہو جائے گی۔

لہٰذا وہ چیز جس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جس کے لئے ان کے اندر غیرت و حمیت ہونا چاہئے اور جس کو وہ اپنی جان سے، صحت سے،، اپنی دانائی و ہوشمندی سے زیادہ عزیز رکھیں اور جس کو دولت و حکومت پر ترجیح دیں، اپنی شہرت و ناموری کے پروپیگنڈے اور اپنی سیاسی تگ ودو سے زیادہ اہمیت دیں اور جذبۂ حکمرانی اور اپنے حدود سلطنت کو وسیع کرنے کی تمنائیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا داعی و مبلغ سمجھیں، علم توحید کو سر بلند اور اللہ کے دین کو سرسبز و شاداب رکھنے کی آرزو ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں پر غالب آجائے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، اللہ کی رضا اور اس کے احکام کے اجزاء کو ہر مقصد اور ہر نسبت پر قربان کرنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار کریں، ان کے بقاء کی

ضمانت اسی میں ہے کیوں کہ ان کا وجود ملی اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول فرمائی تھی اور مسلمانوں کو فتحیاب کرنے اور ان کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرمایا تھا تو گویا ان کی بقاء کو عبادت سے مشروط فرمادیا تھا، عبادت کا مفہوم صرف فرائض مقررہ کی ادائیگی نہیں بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور اس کی رضاجوئی اور خوشنودی کو سب پر مقدم رکھنا، اور دین کو وسیع تر آفاقی وعالمی پیمانہ پر پھیلانے کی سعی کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ لہذا اگر مسلمانوں کا رشتہ عبودیت کی زندگی سے منقطع ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا رشتہ زندگی سے منقطع ہو گیا، جس امر کے باعث ان کو فتح سے سرفراز کیا گیا تھا اور جسکی وجہ سے وہ باقی رکھے گئے تھے وہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ضمانت حیات بھی ختم ہو گئی اور ان کی حیثیت دنیا کی دوسری قوموں کی طرح رہ گئی کہ اگر وہ دنیا کے عام قانون حیات کے مطابق ترقی وخوشحالی کے کام کریں گے تو ترقی وخوش حالی ہو گی اور ادبار وزوال کی راہ پر چلیں گے تو ان کے نصیب میں ذلت وزوال آئے گا۔ بلکہ عام قانون کے مطابق جس قدر ذلت وادبار ہونا چاہئے اس سے زیادہ ذلت ورسوائی کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ دوسری قوموں کی بقاء و تحفظ کو کسی شرط سے مشروط نہیں کیا گیا تھا اور ان کے حق میں یہ آیت کریمہ صادق آئے گی :۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُبِكُمْ رَبِّي لَوْ لَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً (سورة الفرقان۔ ۷۷) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروانہ کرے گا، اگر تم عبادت نہ کرو گے سو تم (احکام الہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب (یہ جھوٹا سمجھنا تمہارے لئے) وبال جان ہو گا۔

مسلمانوں نے اس شرط کو پورا کیا اور اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کی لاج رکھی اور یاد رکھا کہ ان کو دشمن پر غالب و فتح مند کیا گیا تھا اور عین اس وقت فتح و نصرت دے کر ان کی مدد کی گئی تھی جب سامنے یہ نظر آرہا تھا کہ دشمن ان کو بدر کے میدان میں پیس کر رکھ دیں گے، ان کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیں گے، مگر ان کو مدد دے کر غالب کیا گیا اور روئے زمین پر باقی رکھا گیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا سلسلہ ان کے دم سے باقی رکھنا منظور تھا۔

وہ اس پیغام عبادت کو لے کر پھیل گئے، اس پیغام کو لیکر بادشاہوں کے پاس بھی گئے، عوام الناس کے پاس بھی، اسی پیغام کی خاطر انھوں نے ہجرت بھی کی اور جہاد بھی، اسی کے لئے انھوں نے جنگیں بھی لڑیں اور معاہدے بھی کئے، ان کے سامنے یہ حقیقت ہمیشہ جلوہ گر رہی کہ وہ اللہ کے فرستادہ اور اس کے حکم کے بندے ہیں اسلام کا جھنڈا انھوں نے چار دانگ عالم میں لہرایا، اور بجا طور پر یہ سمجھتے رہے کہ وہ خلقِ خدا کے مخلص خادم اور محسن ہیں، اللہ کے بندوں کو خواہشات کی غلامی سے نکالنے والے ہیں، جاہلیت کے رسم و رواج اور جاہلی سماج کے عائد کردہ ان بندھنوں سے ان کو آزاد کرانے والے ہیں جن بندھنوں کو وہ معیار ترقی سمجھ رہے تھے حالاں کہ وہ خواہشات اور رواج کے قیدی تھے جس طرح کوئی بھی قیدی پابند سلاسل ہوتا ہے، وہ تھے تو غلام مگر اپنے کو آقا سمجھ رہے تھے، ان کی زندگی رسم و رواج کے پنجروں میں ایک پرند کی طرح بند تھی، وہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، وہ کھانے پینے کے آداب بھی دوسروں سے مستعار لئے ہوئے تھے اور اپنی اس پسماندگی، ذلت و نامرادی کو عیش و کامرانی سمجھ رہے تھے ان کے سارے جاہ و حشم اور دولت و خوشحالی کے مظاہر کھوکھلے اور بے جان تھے، حقیقت یہ

کہ پنجرہ میں بند تھے، قفس تو قفس ہی ہے خواہ لوہے کا ہو یا سونے کا۔

انکی حق گوئی و بے باکی کی بے شمار مثالیں ہیں انھیں میں سے وہ مذاکرہ بھی ہے جو ایران کے فاتح مسلمان فوج کے ایک سپاہی اور فارس کے کمانڈرِان چیف "رستم" کے دربار میں پیش آیا۔

رستم نے حضرت سعدؓ سے درخواست کی کہ اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیں جس سے یہ معلوم کیا جائے کہ آپ کے اس حملہ کا مقصد کیا ہے؟ یہ واقعہ قادسیہ سے پہلے کا ہے، حضرت سعدؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر فارس کے سپہ سالار اعلیٰ (کمانڈرِان چیف) رستم کے پاس بھیج دیا، حضرت ربعی وہاں پہنچ گئے، رستم نے اپنا دربار بڑے شاہانہ کروفر سے سجا رکھا تھا، اعلیٰ درجہ کے نقشیں قالینیں بچھی ہوئی تھیں جن پر سونے اور موتیوں کی میناکاری تھی، ہر طرف ہیرے موتی اور لعل و یاقوت کی چمک دمک تھی، رستم کے سر پر جواہرات کا قیمتی تاج تھا، حضرت ربعیؓ وہاں پہنچتے ہیں، جسم پر ایک بھدے قسم کا چغہ ہے، ہاتھ میں تلوار اور ڈھال ،ایک معمولی سا چھوٹے قد کا گھوڑا (جس پر سوار ہیں اور اس پر سوار قصر شاہی میں داخل ہو گئے، نظریں نہ منقش در و دیوار پر ہیں اور نہ ہیرے جواہرات کی آرائش و نمائش پر، آگے بڑھ کر گھوڑے سے اترتے ہیں اور اس کو باندھتے ہیں اور اس شان استغناء سے بڑھتے ہیں کہ زرہ جسم پر ہے ،خود سر پر اور تلوار ہاتھ میں۔

دربار کے کسی چوبدار نے کہا: آگے بڑھنے سے پہلے اپنے اسلحہ اتار کر یہاں رکھ دو۔

حضرت ربعی نے کہا: میں (اپنے کسی کام سے) نہیں آیا ہوں، میں تم لوگوں کے بلانے پر آیا ہوں، جی چاہے مجھے اسی طرح جانے دو اور اگر منظور نہیں

ہے تو میں لوٹ جاتا ہوں۔

رستم نے کہا۔ اس کو آنے دو۔ آپ آگے بڑھے، ہاتھ میں تلوار تھی جو چھڑی کا کام دے رہی تھی۔ اس پر ٹیک لگاتے ہوئے چلے تو فرش قالین ایک دو جگہ سے اُدھڑ گئی،

رستم نے پوچھا: یہاں تم کس کام سے آئے ہو؟

جواب دیا:

ہم اٹھے ہیں کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی پر لگادیں ،دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کو وسعت عطا کریں، مذاہب کے پیدا کردہ مظالم سے نکال کر اسلام کے عدل کا راستہ دکھائیں، اللہ نے ہم کو مامور کیا ہے کہ اس کی مخلوق کا رخ اللہ کے دین کی طرف پھیر دیں، جس کو یہ راستہ پسند ہو اوراِس کو قبول کر لے تو اس سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے ہم لوٹ جائیں گے، اور جو انکار کرے گا اس سے ہم اس وقت تک برسرپیکار رہیں گے جب تک کہ اللہ کا وعدہ پورا نہ ہو جائے۔

فرمایا: انکار کرنے والوں سے جو جنگ میں مر جائے گا اس کے لئے جنت، اور زندہ رہ جائے اس کے لئے کامیابی وکامرانی۔

یہ تھی مختصر سی گفتگو (جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں مذاکرات کہا جاتا ہے) جس کا ذکر اسلامی غزوات اور دعوت اسلامی اور مسلمانوں کی تاریخ میں آتا ہے، لیکن عام طور پر لوگ اس سے سرسری طور پر گزر جاتے ہیں، تاریخ کے انبار میں یہ بات دب کر رہ گئی ہے، اس کی معنویت، گہرائی، قوت اور جرأت مندانہ انداز میں دعوت پیش کرنے کی روح جو ان چند جملوں پوشیدہ ہے اس کی طرف کم نگاہ جاتی ہے، عرب کے ایک بدوی علاقہ کا مسلمان سپاہی اپنے اندر کس قدر جوش و

جسارت اور حمیت وغیرت رکھتا تھا اور کس طرح دعوت اسلام کی حقیقت سے اس کی روح سرشار تھی، اس کی طرف عام طور پر لوگوں نے توجہ نہیں دی ہے۔

موجودہ زمانہ کی نوعیت اور مغربی ممالک کی نوعیت (جو اس وقت فکری و سیاسی، تمدنی اور معاشی امور میں دنیا کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں) اس زمانہ سے مختلف نہیں ہے جب کہ اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تھا اور جس وقت اسلام کے داعی پیغام حق لے کر دنیا میں پھیل گئے تھے اور اقوام عالم کو، ان کی سوسائٹیوں کو، ان کی حکومتوں کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔

ابھی میں نے جو حضرت ربعی بن عامرؓ کی مثال دی اور ان کے مذاکرات کو نقل کیا، جو ان کے اور رستم کے درمیان ہوئے تھے، وہ ایک ایمان افروز واقعہ ہے، غور کیجئے، کہاں ایک عرب کا بدوی سپاہی اور کہاں ایران کا کمانڈر اِن چیف، رستم جو شہنشاہ ایران کے بعد وہاں کی اس وقت کی بڑی شخصیت کا حامل تھا، اس کا جاہ و جلال، خدم و حشم، آرائش و نمائش کے وہ ساز و سامان جو نگاہوں کو خیرہ کردیں، دوسری طرف اس وقت کی دو عظیم طاقتیں، ساسانی اور رومانی، جس کے تحت بڑے بڑے شہر آباد تھے، لاتعداد سماجی و علمی معاشرے تھے، اَن گنت، معیار اور پیمانے تھے، رسوم و رواج، نظریات و افکار تھے اور سب اپنے عروج پر تھے اور یہی پوری دنیا پر عقلی و ذہنی حکمرانی کررہے تھے۔ تہذیب و تمدن کا رخ بنانے میں، اقتصادی و سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل میں، عقل و فکر پر اثر انداز ہونے میں انہی دونوں طاقتوں کا براہ راست دخل تھا، اور ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ فرق جو چھٹی صدی عیسوی کی مشرقی دنیا اور بیسویں صدی کی مغربی دنیا کے درمیان دیکھا جاتا ہے وہ ان دونوں میں مشرق و مغرب، کے زمینی و زمانی فرق

سے کم ہے زیادہ نہیں۔

آج آپ دیکھتے ہیں کہ جاہلیت (۲) (اپنے مکمل مفہوم میں) پورے مغرب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے، وہ مغرب جو اعلیٰ ثقافت اور تمدنی عروج کے نقطۂ کمال تک پہنچا ہوا ہے، جاہلیت کے تمام خصائص (جن کا مؤرخ ذکر کرتے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں) سب کا محور مادی منافع کا زیادہ سے زیادہ حصول، لذت اندوزی اور نفس پرستی اور جس طرح جس راستہ سے حاصل ہو (جو ایک قدیم یونانی تھیوری کا خلاصہ ہے) (۳) اسکو حاصل کرلینا پھر سیاسی واقتصادی نفوذ واختیارات پر قبضہ کرنا، اس کے مقابلہ میں جہاں مذہب کا ذکر آئے اس کو ایک انفرادی معاملہ قرار دینا، جو ایک خاص مقام (گرجوں) اور خاص اوقات (مذہبی تہواروں) میں منالیا جائے، اس نظام (جاہلیت) کا انسان سازی میں کوئی دخل نہیں ہے فرد وجماعت کے کردار، سیاسی ہوں یا اقتصادی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اگر زمانۂ ماضی کے شاہان تاجدار دنیا سے الگ تھلگ قید خانہ میں وقت گزارنے والے کی طرح زندگی گزار رہے تھے تو مغرب اس سے وسیع قید خانہ میں مقید ہے، شاہزادے اور والیان ریاست کے پنجروں سے زیادہ حسین اور خوشنما یہ پنجرے ہیں جن کے اندر اہل مغرب کی انسانیت زندگی بسر کررہی ہے، یہ قید خانہ یا پنجرہ نمائشی آداب (Etiquettes) اور مصنوعی وضع داریوں (Fashions) کی پابندی ہے جس کو بہت باریک بینی اور نوک پلک کے ساتھ برتا جاتا ہے، لباس رہائش اور نمائش کے وہ فرسودہ اور ازکار رفتہ رسم ورواج جن کو معاشرتی زندگی کا اہم جز سمجھ لیا گیا ہے اور اپنے بڑے لوگوں میں اس کو تلاش کرتے ہیں اور کم ہونے پر انگلی اٹھاتے ہیں، اس لحاظ سے جو ماقبل اسلام دو بڑی شاہنشاہیوں میں پائی

جاتی تھیں، زمانۂ جاہلیت (قبل اسلام) میں انسان بت پوجتا تھا، اس کے روایتی و آبائی صنم بھی تھے اور نئے نئے بنائے ہوئے بت بھی تھے اور موجودہ مغرب میں بھی آپ کو نظر آئے گا، لذت اندوزی اور نفس پرستی کا وہ اسی طرح غلام ہے جس طرح وہ لوگ پتھر کے صنم کو اپنا معبود اور اپنے آپ کو اس کا غلام سمجھتے تھے، لذت اندوزی کے وسائل پر اور ان کی ساری تگ ودو اسی محور پر گردش کرتی تھی، خود ان کا وجود ان کی خود کردہ پابندیوں کی وجہ سے ایسا تھا جیسے ایک شوخ ناز پرور پرند، یا کوئی معزز قیدی ہو، اور آج کا مرد فرنگ خواہ اس کی دولت کا کوئی ٹھکانا نہ ہو، حکومت وسیاست کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں ہو، وہ بھی سوسائٹیوں کی عائد کردہ پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے، حیثیت و معیار (STANDARS & VALUES) کے گھروندوں سے باہر سر نہیں نکال سکتا، خواہ کتنی بڑی شخصیت کا مالک ہے، حاصل یہ کہ دونوں، قدیم جاہلی انسان اور جدید مغربی انسان کی ضرورت ایک ہی تھی اور اب بھی ہے کہ تنگنائیوں سے اس کو نکال کر اس کو آزادی کی نعمت دی جائے لیکن اب کون ہے جو حضرت ربعی بن عامرؓ کی سنت انفرادی یا اجتماعی شکل میں زندہ کرے اور مغرب یا اہل مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو مخاطب کرے، وہ اہل مغرب جو آج مادی طاقتوں کے قارون بنے بیٹھے ہیں اور اپنی سیاسی و اقتصادی حکمرانی سے دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں، آج کون ہے جو ربعی بن عامر کی سی جرأت ایمانی رکھتا ہو جس نے ساسانی سلطنت کے نائب اعظم رُستم کو مخاطب کیا تھا، آج ضرورت ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اس درجہ کی بے باکی و صداقت شعاری کے ساتھ حمیت اسلامی اور غیرت ملی کے ساتھ یورپ کو حقانیت و صداقت کی دعوت دے اور کام (دعوت الی اللہ کا کام) جس میں داعی کی اپنی غرض شامل نہ ہو صرف

انسانیت کی بھلائی اور بہبود اس کا مطمح نظر ہو۔

یہ ذمہ داری امت اسلامیہ کی وراثت ہے، اس کا فریضہ ہے، ملت کے خاندان، مفکرین اور اہل قلم کی یہ ذمہ داری ہے، جہاں تک یورپ کا تعلق ہے اندر سے کھوکھلا اور آسمانی ہدایت سے محروم اپنے ہاتھ سے بنائی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس کی صحیح تصویر شاعر اسلام محمد اقبالؔ کے ان اشعار میں نظر آتی ہے۔ ؎

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں، تعلیمِ مساوات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ہے — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بھائیو! میں آپ سے کہتا ہوں، بلکہ ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر قبیلہ قریش کے وہ افراد جو جنگ بدر اور جنگ اُحد میں مارے گئے تھے مسلمانوں کے خلاف استغاثہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم نے تو خود بڑھ کر ان کے پیغمبر کو پیش کش کی تھی کہ وہ اگر دنیاوی ثروت و دولت چاہتے ہیں تو ہم ان کو دولت سے مالا مال کرنے کو تیار ہیں، اگر عیش و عشرت کی زندگی کی طلب ہے اس طرح کہ اپنی پسند سے جس بڑے سے بڑے خاندان میں چاہیں ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیں، اگر حکومت و سرداری کی تمنا ہے تو ہم سب مل کر ان کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیتے ہیں، مگر تمہارے پیغمبر نے کوئی بات قبول نہیں کی اور صاف انکار کر دیا اور یہ کہا کہ ہم اِس کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے ہیں لہذا آج کس طرح تم انہی چیزوں کے پیچھے مر رہے ہو، آج تمہیں سوائے عیش و عشرت اور لذت اندوزی کی زندگی کے کچھ نظر نہیں آتا نہ دعوت نہ جہاد۔

اللہ کی عبادت تو کی جاتی ہے مگر اس بات کی دعوت مفقود ہے کہ دین خالص سب کا سب اللہ کا ہو جائے اور اس کی شریعت واحکام کا نفاذ ہونے لگے، ہم نے تمہارے سامنے وہ سب کچھ پیش کیا جس کی دنیا کو طلب ہو سکتی ہے مگر آسودہ حالی، فارغ البالی اور عیش کوشی کی زندگی کو تمہارے نبی ﷺ نے قبول نہیں کیا، رد کر دیا اور کہا کہ ہم اس کام کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے ہیں، ہم اس لئے مبعوث کئے گئے ہیں کہ تمہارے سامنے دعوت توحید پیش کریں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ بتائیں، اسلام کو سربلند کریں، کیوں کہ اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے، ہم نے تم سے بے شک جنگ کی کیونکہ تم اسلام کی حکومت کرنا چاہتے تھے، تم اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے تم ہی وہ تھے جو کہتے تھے کہ عبادت صرف اللہ کی ہوگی، اللہ تعالیٰ کائنات پر تصرف کرنے والا ہے، وہی مدبر ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، اور ہم اس کا انکار کرتے تھے، لہذا ہمارے تمہارے درمیان معرکے ہوئے اور ہمارے بہت سے لوگ اس راہ میں ہلاک ہوئے۔

لیکن تم لوگ دنیا پر ٹوٹ پڑے اور جیسے آگ پر پروانے گرتے ہیں اسی طرح تم دنیا پر فدا ہو رہے ہو، تمہاری تمنا ہے کہ تم ناز و نعم میں زندگی گزارو، دولت کا مظاہرہ کرو، اور عیش و عشرت کا سامان جہاں بھی ملتا ہو وہ سب تمہارے قبضۂ قدرت میں آجائے، اب تم میں نہ تو اسلامی غیرت ہے نہ دینی حمیت اور نہ دین کی حفاظت اور اس کی وسعت کے لئے نہ کوئی جوش و ولولہ ہے تمہارے پیغمبر کے ساتھیوں کی جو زندگی تھی اس سے تم کو ادنیٰ درجہ کی بھی مناسبت نہیں رہ گئی۔

میں آپ سے معذرت خواہ ہوں، اور آپ سے پہلے میں اپنے ضمیر سے معذرت کرتا ہوں، اپنے اسلامی شعور اور احساس سے معذرت کرتا ہوں اور صاف

کہتا ہوں کہ بہت سے ملک اور شہر اور خاص طور پر وہ ملک، شہر جسمیں کوئی غیر مسلم جاتا ہے یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اور قوموں کے مزاج سے واقفیت رکھنے والا شخص جاتا ہے تو اس کو ماضی اور حال کے درمیان واضح فرق نظر آتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زندگی کا دھارا ہر جگہ یکساں طور پر چل رہا ہے، سوائے کسب معاش کے اس قوم کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے، جس طرح دنیا کی دوسری اقوام ہیں اسی طرح قوم مسلم بھی ہے، خواہشات اور غراض نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر یہ لوگ بھی وہ سب کچھ کرتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں، ان کو اس کی بھی حس نہیں رہتی کہ اپنے اور غیر کے درمیان تمیز کریں، مسلمانوں پر غیر مسلموں کو ترجیح دیں گے، تجارت وصنعت اور تجارتی مصالح اور نفع اندوزی کے سوا کوئی مطمح نظر نہیں ہے۔

میرے بھائیو! زندگی گزارنے کا جو طرز مسلمانوں میں رائج ہے وہ اسلام کے دعوتی پیغام سے کوئی میل نہیں کھاتا اور نہ رسول اکرم ﷺ کے ان مقاصد سے اس کا کوئی ربط ہے جس کے لئے آپ مبعوث کئے گئے تھے اور نہ ان مقاصد سے ان کی زندگی کو کوئی مناسبت ہے جس کے لئے آپ اور آپؐ کے ساتھی مدینہ منورہ سے بدر گئے تھے اور جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانیں دی تھیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نکتہ کو ہمیشہ نظروں کے سامنے رکھیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کی دعا قبول فرمائی تھی اور مسلمانوں کو جنگ بدر میں فتح سے ہمکنار کیا تھا، اللہ نے اپنے رسول کو سچا کر دکھایا کہ اگر یہ امت نہیں رہی تو روئے زمین پر اللہ کا عبادت گزار نہیں رہ جائے گا اور اس طرح مسلمانوں کو باقی رکھا اور مسلمانوں کو بے چارگی، تعداد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود ان کے دشمنوں (قریش) پر ان کو فتح ونصرت سے نواز دیا، اسی بنیاد پر اس وقت کے مسلمان زندگیاں گزار رہے

تھے، اور ایک مسلم معاشرہ صحیح معنوں میں وجود میں آیا، اور ایک اسلامی زندگی عہد نبویؐ، عہد خلافت راشدہ اور متعدد سلطنتیں طویل تاریخی زمانوں میں سایہ فگن رہی۔

لیکن افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے ان مقاصد اور اس روح، جذبات اور ان دینی و ایمانی محرکات عمل کا حصہ کھودیا، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اور ہر ایسے عرب و اسلامی ملک و شہر میں اسلامی زندگی کو سایہ فگن دیکھیں جو نگاہوں سے بھی نظر آتی ہو، تجربہ و عمل بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہو، اور ہر انسان اس زندگی کا لطف اور فائدہ اٹھاسکے، اس کے بڑے اجزاء اور مظاہر کیا ہیں؟ توحید پر استقامت اللہ اور اس کے کلام پر کامل ایمان، دنیا پر آخرت کو ترجیح اور اس پر اور اللہ کے خوف و خشیت پر ثبات و استقامت، اہل اسلام اور اہل ایمان کو ان عناصر اور جماعتوں پر ترجیح دینا جو اس دولت سے محروم ہیں (خواہ ان غیر مسلم معاون اور ہنر مندوں کی اعانت سے کتنا ہی فائدہ پہنچتا ہو) شریعت اسلامی پر، مکمل طریقہ پر عمل اور مرد ہوں یا خواتین ہر طبقہ کی اس پر استقامت، پھر دنیا کو (جس میں مغرب بھی شامل ہے) خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دینا اور اس کی کوشش کرنا کہ دنیا میں اللہ ہی کی حکومت اور فرمانبرداری کا رواج ہو۔

والحمد لله رب العالمين و صلى الله وسلم و بارك على سيدنا محمد و على آله و صحبه و تابعيه باحسان الىٰ يوم الدين.

(عربی سے ترجمہ۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی)

حواشی:۔ (۱) یہ روایت احمد البزاز و الطبرانی کی ہے، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے بھی یہی تعداد لکھی ہے۔ اور سیر و مغازی کے علماء مثلاً ابن اسحاق نے بھی اس کی توثیق کی ہے (ملاحظہ ہو ابن اسحاق ج ۱ / ۷ ص ۲۹۱) اور دوسری روایتیں بھی ہیں مگر سب میں تعداد یہی ہے یا اسکے لگ بھگ ہے۔ (۲) جاہلیت اس طرز زندگی یا اس معاشرہ کا نام ہے جو تعلیمات نبوت سے بے نیاز اور آسمانی ہدایت سے محروم ہو، اس کا اطلاق طرز زندگی، عقیدہ اور معاملات، خیر و شر کے معیار سب پر ہوتا ہے۔ (۳) ایک قدیم یونانی فلسفہ جس کو عربی میں "ابیقوریہ" لکھتے ہیں، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ لذت اندوزی اصل اور مقصد انسان ہے خواہ جس طرح ہو اور جہاں ملے

سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کے آئینہ میں

پیش نظر مضمون دراصل مفکرؒ اسلام کا ایک گراں قدر مقالہ ہے جو "فاران" کراچی کے سیرت نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ اور جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرتِ محمدی ﷺ دعاؤں کے آئینہ میں

کمالاتِ نبوی ﷺ کے دو شعبے

رسول ﷺ کی ذاتِ گرامی میں جو کمالات جمع تھے ان کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

عبدیتِ کاملہ و نبوّتِ جامعہ، دعا اور دعوت

عبدیت کا ظہور اور نتیجہ دعا ہے۔ اور نبوت کا مظہر دعوت ہے۔ یہ دونوں سیرت محمدی کے اہم نمایاں عنوان اور اس صحیفۂ اعجاز کے دو مستقل باب ہیں۔ دعوت پر سیرت محمدی کے ہر طالب علم اور ہر مصنف کی نظر پڑتی ہے۔ اس کی تفصیلات سے کتابیں لبریز ہیں اور اس کے آثار و نتائج تمام دنیا میں درخشاں و تاباں ہیں۔ دعوت جلوت کی چیز ہے اس لئے سب کو بے پردہ و بے نقاب نظر آئی۔ لیکن (میری کوتاہ نظر میں) اس حقیقت پر بہت کم لوگوں کی نظر پڑی کہ دعا کو سیرتِ

نبوی میں کیا مقام حاصل ہے، اور خود دعوت نبوی کی تاثیر و تسخیر میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہے، اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبدیت کے اس شعبے کو عروج وترقی کی کس حد تک پہنچایا، کس طرح آپؐ نے اس شعبہ کا (جو عبدیت وعبادت کے تمام شعبوں اور مظاہر کی طرح مردہ افسردہ ہو چکا تھا) احیاء اور اس کی تجدید فرمائی۔ پھر اس کی تکمیل اور تعمیم فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے۔

دورِ جاہلیت میں عبدومعبود کے رشتہ کا اضمحلال

جن لوگوں کی مذاہب وعقائد کی تاریخ پر گہری اور تفصیلی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں جو جاہلیت کے نام سے موسوم ہے عبد ومعبود کے تعلق میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا کہ دعا کا سرچشمہ (جو یقین اور محبت وخوف کے بغیر جاری نہیں ہو سکتا) اندر ہی اندر خشک ہو گیا تھا، عبد اپنے اور معبود کے متعلق اتنی غلط فہمیوں اور اتنی جہالتوں کا شکار تھا کہ اس کے اندر دعا کا جذبہ اور تقاضہ پیدا ہونا ہی مشکل تھا، دعا کے لئے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے جس سے دعا کی جائے۔ پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے، اور دینے کے لئے اس کے پاس سب کچھ ہے، پھر اس یقین کی کہ اس کے در کے سوا اور در نہیں، پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے اور محبت ورحمت، بخشش وعطاء اور احسان وانعام اس کی خاص صفت ہے، اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے، پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاج سر تاپا کشکول گدائی ہے۔ پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے، دنیا کی ہر چیز سے، یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے۔

صفات کی نفی کا اثر نفسِ انسانی پر

جاہلیت کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ان میں سے ہر یقین کتنا نایاب اور مضمحل ہو چکا تھا اور ان حقائق میں۔ سے ہر حقیقت کے بارے میں کتنے شبہات و حجابات اور کتنے توہمات اور مغالطے پیدا ہو چکے تھے ۔یونانی فلسفہ کو "واجب الوجود" یا "مبدأ اول" کی صفات سے جتنا گریز و انکار اور صفات کی نفی اور مجرد و بلا صفت ذات کے اثبات پر جتنا اصرار تھا اس کے بعد اس کے حلقہ اثر میں دعا والتجا کا کیا امکان باقی رہ جاتا تھا! جس ذات کے متعلق کسی صفت کا علم نہیں، بلکہ اس سے ہر صفت کمال کی نفی کی جارہی ہے۔اس سے سوال کرنے، مدد چاہنے کے کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں؟ جس کو کارخانہ قدرت میں کوئی دخل نہیں، جو "عقل اول" کو پیدا کر کے "معطل" ہو گیا۔ جس "واحد" سے ایک ہی "واحد" کا صدور ہو سکتا ہے۔(۱) اور وہ ہو چکا اس سے ہر دم اور ہر آن نئے نئے افعال و احکام کے صدور کی توقع کب حق بجانب ہو سکتی ہے۔

مشرکانہ عقائد خدا سے دعا کرنے سے مانع

اس کے مقابلہ میں مشرکانہ جاہلیت اور "وثنیت" نے صفات الٰہیہ میں سے تقریباً ہر صفت کو کسی نہ کسی مخلوق کی طرف منسوب کر رکھا تھا، کوئی احیاء پر قادر تھا، کسی کے ہاتھ میں رزق تھا۔ کسی کا علم محیط اور ہمہ گیر تھا اور ہر "غیب" اس کے لئے "شہود" تھا، کسی کے لئے زمان و مکان کے حجابات اٹھ چکے تھے اور وہ اپنے پرستاروں کی ہر جگہ اور بیک وقت سب کی مدد کر سکتا تھا اور ہر جگہ پہنچ سکتا تھا و قس علیٰ ہذا۔ایسی حالت میں "الٰہ واحد" کی طرف رجوع کرنے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا کیا امکان تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ نظر سے اوجھل ہو اور مقامی آلہہ نظر کے سامنے اور دسترس کے اندر ہوں، اسی کے ساتھ اس کو بھی ذہن میں

(۱) یہ قدیم یونانی فلسفہ کے عقائد و مسلمات ہیں۔

رکھئے کہ جاہلیت کے اس دور میں صفات وافعالِ الٰہیہ کاذکر و تذکرہ بھی مفقود اور ان کا علم صحیح تقریبا معدوم ہو چکا تھا اور (الٰھه کثیرہ) کی کارسازیوں کی داستانوں سے مجلسیں معمور اور قلب و دماغ مسحور تھا۔ ایسی حالت میں وہ "ذہنی کیفیت" بالکل قدرتی اور طبعی تھی جس کا قرآن مجید نے نقشہ کھینچا ہے کہ :

وَإِذَا ذُكِرَ اللهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (الزمر۔ ع ٦) اور جب کہ ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل نفرت کرتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو فوراً خوش ہو جاتے ہیں۔

یونانی فلسفہ اور مشرکانہ جاہلیت کا اثر

بہر حال یونانی فلسفہ نے (اس مسلک کی بنا پر جو اس نے صفات کے بارے میں اختیار کیا تھا) دعاء والتجا کا دروازہ ہی بند کر دیا تھا، اور مشرکانہ جاہلیت نے (صفات الٰہیہ کو مخلوقات کی طرف منسوب کر کے) دعاء والتجاء کا رخ خدا سے موڑ کر بندوں کی طرف تبدیل کر دیا تھا۔ دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ براہ راست خدا سے طلب وسوال اور دعاء والتجا کا رواج ہی تقریبا ختم ہو گیا تھا۔ زمانۂ بعثت میں پورے پورے ملک اور وسیع علاقوں میں ایسے چند آدمی بھی ملنا مشکل تھے جن کو خدا سے دعاء کرنے کی عادت اور اس کا سلیقہ ہو اور جو اس سے تسکین حاصل کرتے ہوں، اور اسی کی دعوت دیتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر احسان

محمد رسول اللہ ﷺ (اروا حنا ونفوسنا فداہ) نے محروم و محجوب انسانیت کو دوبارہ دعاء کی دولت عطا فرمائی، بندگی کی بلکہ زندگی کی لذت اور عزت

عطا فرمائی۔ اس مطرود انسانیت کو پھر اذنِ باریابی ملا اور آدم کا بھاگا ہوا فرزند پھر اپنے خالق ومالک کے آستانے کی طرف یہ کہتا ہوا واپس ہوا۔

بندہ آمد بدرت بگریختہ
آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

دعا سے محرومی کا ایک سبب

دعاء سے محرومی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کا یہ غلط تخیل تھا کہ خدا ہم سے بہت دور ہے۔ ہماری آواز وہاں کہاں پہنچ سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمایا اور یہ مژدہ سنایا کہ:۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقر. ۲۳)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں نزدیک ہوں، دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔

حقیقی نافع وضار

دوسرا غلط عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی نافع وضرر کا مالک اور انسانوں کی امداد واعانت پر قادر ہے، اس عقیدہ نے دعاء واستعانت کو "**حقیقی نافع وضار**" سے ہٹا کر خیالی معاونوں اور دادرسوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور عالم شرک وبت پرستی کا شکار تھا، رسول اللہ ﷺ نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ اس فرمان کا اعلان کیا، جس میں آپ ہی کو خطاب تھا:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. وَلَا تَدْعُ مِنْ

دُوْنِ اللّٰهِ مَالاَ یَنفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ . فَإنْ فَعَلتَ فَإنَّکَ مِنَ الظَّالِمِیْن. إنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰهُ بِضُرٍ فَلَا کَاشِفَ لَه إلاَّهُوَ . وَإنْ یُّرِدْکَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الغَفُورُ الرَّحِیْم .(یونس ع ۱۱) کہہ دو، اے لوگو! تمہیں میرے دین میں شک ہے تو اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، میں انکی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، جو تمہیں وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ ایمان والوں میں رہوں اور یہ بھی کہ یکسو ہو کر دین کی طرف رخ کئے رہوں اور مشرکین میں نہ ہوں، اور اللہ کے سوا کسی چیز کو نہ پکاروں جو نہ تیرا بھلا کرے اور نہ بُرا، پھر اگر تو نے ایسا کیا تو بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچاتا ہے تو کوئی اس کے فضل کو پھیرنے والا نہیں، اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

دُعا کی رفعتِ شان

پھر آپؐ نے صرف اسی کو واضح نہیں کیا کہ بندہ اپنے مالک سے دعاء کرسکتا ہے اور وہ اس کی سنتا ہے، اور اس کی مدد کرسکتا ہے بلکہ آپ نے ثابت کیا کہ خدا کو دعاء مطلوب ہے اور وہ اس سے خوش اور راضی ہوتا ہے، بلکہ دعاء نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے، دعاء بندگی کا بہت واضح اور مؤثر مظاہرہ ہے اور عدم دعا بندگی سے گریز و استکبار و سرکشی کی علامت ہے، آپؐ کے اس اعلان نے دعا کا پایہ کہیں سے کہیں پہنچادیا اور اس کو بندگی کے فعل اضطراری کے درجہ سے اعلیٰ عبادت اور قرب کے مقام تک پہنچادیا۔

وقال ربکم أدعونی أستجب لکم إن الذین یستکبرون عن عبادتی

سیدخلون جهنم داخرین(المؤمنون. ع ٦) اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعاء قبول کروں گا، بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں عنقریب وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء نہ کرنا محض محرومی کا باعث نہیں، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا بھی باعث ہے حدیث کے الفاظ ہیں:من لم یسئل الله یغضب علیه، جو اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

پھر آپؐ نے اسی پر اکتفا نہیں کیابلکہ دعاء کو مغز عبادت قرار دیا، الدعاء مخّ العبادة، دعا کو رحمت و برکت کے دروازے کی کلید قرار دیا گیا اور فرمایا گیا، من فتح له منكم باب الدعاء فتحت له أبواب الرحمة.

جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے۔

اس طرح دعا کا شعبہ جس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، عبادات اور معابد بھی اس کے نور سے خالی ہو چکے تھے اور جاہلیت کے سالک و مرتاض اور عباد و زہاد بھی اس دولت سے محروم تھے، دوبارہ زندہ اور تازہ ہوا اور یہ دولت اتنی عام ہوئی کہ :ے

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

اَدعیہ ماثورہ مستقل دلائل نبوت

نبوت محمدیؐ کی تجدید اور اس کا عملِ تکمیل اسی پر ختم نہیں ہوتا کہ آپ نے ہمیں دعا کرنا بھی سکھایا، آپ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے ان جواہرات سے مالا مال کیا، جن کی نظیر اپنی آبداری و درخشانی میں

صحف سماوی کے بعد مل نہیں سکتی، آپ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعاء کی جن سے زیادہ مؤثر اور بلیغ الفاظ، جن سے زیادہ موزوں و مناسب الفاظ انسان نہیں لاسکتا، یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں، ان کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ وہ پیغمبر کا یقین ہے "عبد کامل" کا نیاز ہے۔ محبوب رب العالمین کا اعتماد وناز ہے۔ فطرتِ نبوت کی معصومیت وسادگی ہے، دل دردمند و قلبِ مضطرب کی بے تکلفی وبے ساختگی ہے، صاحب غرض وحاجت مند کا اصرار واضطراب بھی ہے اور باگاہِ الوہیت کے ادب شناس کی احتیاط بھی، دل کی جراحت اور درد کی کسک بھی ہے اور چارہ ساز کی چارہ سازی اور دل نوازی کا یقین وسرور بھی، درد کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کا اعلان بھی کہ ع

در دہا دادی و درمانی ہنوز

دعاؤں کی ادبی قدر وقیمت

یہ دعائیں اپنی روحانی ومعنوی قدر قیمت کے علاوہ اعلیٰ ادبی قدر وقیمت کی حامل ہیں اور دنیا کے ادبی ذخیرے کے وہ نوادر اور شہ پارے ہیں، جن کی نظیر انسانی لٹریچر میں نہیں مل سکتی، بہت سے ناقدین ادب نے نجی خطوط کو اس وجہ سے ادب میں اعلیٰ مقام دیا ہے کہ وہ بیساختہ اور تکلفات سے دور ہوتے ہیں اور ان میں دلی جذبات کی بے تکلف ترجمانی ہوتی ہے، لیکن ان کو معلوم نہیں کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

ادب کی ایک صنف اور بھی ہے، جس میں خطوط سے زیادہ بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے جس میں سارے حجابات اور اصطلاحات اٹھ جاتے ہیں جس میں صاحب کلام اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زبان اس کے دل کی حقیقی

ترجمان بن جاتی ہے، جب متکلم داد و تحسین سے بے پرواہ ہوتا ہے، سامعین کی خاطر بات نہیں کرتا بلکہ اپنے دل کے تقاضے سے گویا ہوتا ہے، ادب عالی کی یہ صنف "دعاء یا مناجات" ہے۔

سیپارۂ دل

ادب کا ایک اہم عنصر (جس کو اکثر ناقدین فن نے نظر انداز کیا ہے، اور جو ادب میں حقیقی روح اور طاقت پیدا کرتا ہے اور اس کو بقائے دوام بخشا ہے) صداقت اور خلوص ہے، اس عنصر کی جیسی نمود "**دعا و مناجات**" میں پائی جاتی ہے ادب کی کسی اور صنف میں نہیں پائی جاسکتی پھر جب صاحب دعاء صاحبِ درد بھی ہو اور اس کو اپنے دردِ دل کے اظہار پر اعلیٰ درجہ کی قدرت بھی ہو تو پھر اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ ادب کا معجزہ بن جاتے ہیں، اور وہ الفاظ نہیں ہوتے بلکہ دل کے ٹکڑے اور آنکھ کے آنسو ہوتے ہیں اور وہ صدیوں تک ہزاروں انسانوں کو تڑپاتے رہتے ہیں پھر جب ان مطالب کو ادا کرنے والی زبان وہ ہو جو وحی کی گذرگاہ اور فصاحت و بلاغت کی بادشاہ ہو، تو پھر ان کی تاثیر و اعجاز کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

طائف کی دعا

حدیث و سیرت کے دفتر میں آنحضرت ﷺ کی جو دعائیں منقول ہیں، ان پر نظر ڈالئے! کیا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اپنی بے بسی و کمزوری کا نقشہ کھینچنے کے لئے، اپنا فقر و احتیاج بیان کرنے کے لئے اور دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے اس سے زیادہ جامع الفاظ لا سکتا ہے، ایک بار سفرِ طائف کا نقشہ سامنے لائیے اور مسافر طائف کے شکستہ دل اور خون آلود پاؤں پر نظر ڈالئے، پھر غربت و

مظلومیت کی اس فضا میں ان الفاظ کو پڑھیے :

اَللّٰهُم إلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوتِي وَ قُلةَ حِيْلَتِي وَهُوانِيْ عَلَى النَّاسِ رب المُسْتَضْعفِيْنَ إِلىٰ مَنْ تكلنِي إِلىٰ بعيدٍ يتَجَهمُنِي أَو إِلىٰ عَدوّ ملكته أمرى إن لم يكن بك عليّ غضب فلا أبالي غير أن عافيتك هي أوسع لي أعوذ بنور وجهك الذى أشرقت له الظلمات وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة من أن يحل بي غضبك أو ينزل عليّ سخطك لك العتبى حتى ترضىٰ ولا حول ولا قوّة الاَّ بك (كنز العمال)

الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں، تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے کیا بیگانہ ترش رو کے، یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے، اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں، لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے، میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری رضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔

کیا کبھی جب آپ کو ایسا وقت پیش آئے اور آپ کے دل کی کیفیت بھی یہی ہو تو آپ ان سے بہتر اور ان سے زیادہ مؤثر الفاظ لا سکتے ہیں، یا آپ کو دنیا کے ادبی ذخیرے میں اپنے دل کی ترجمانی کے لئے اس سے بہتر لفظ مل سکتے ہیں۔

عرفات کی دعا

اسی طرح میدان عرفات کا تصور کیجئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کفن بر دوش انسانوں کا مجمع ہے، لبیک کی صداؤں اور حجاج کی دعاؤں سے فضا گونج رہی ہے، خدا کی شان بے نیازی اور عظمت و جبروت کا نقشہ سامنے ہے، انسانوں کے اس جنگل میں ایک برہنہ احرام پوش ایسا بھی ہے (فداہ ابی و امی) جس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کا بار ہے، جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت و جلال کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر جاننے والے سے زیادہ انسانوں کی درماندگی، بے حقیقی اور بے بسی سے واقف ہے، اس پُر تاثیر اور پُر ہیبت فضا میں اس کی آواز بلند ہوتی ہے اور سننے والے سنتے ہیں:

اللهم إنك تسمع كلامي وترى مكاني و تعلم سرّي و علانيتي لا يخفىٰ عليك شئي من أمري ، وأنا البائس الفقير المستغيث المستجير ، الوجد المشفق ، المقرّ المعترف بذنبي أسئلك مسئلة المسكين ، وأبتهل إليك ابتهال المذنب الذليل و أدعوك دعاء الخائف الضرير ودعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته وذلّ لك جسمه ورغم لك انفه اللهم لاتجعلني بدعائك شقياً وكن لي رؤفاً رّحيماً ، يا خير المسئو لين ويا خير المعطين. (کنزالعمال عن ابن عباسؓ) اے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گناہ گار ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں، جیسے خوف زدہ، آفت رسیدہ طلب کرتا

ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے اللہ! تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا، اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر، اور سب دینے والوں سے اچھے۔

کیا خدا کی کبریائی و عظمت اور اپنی ناتوانی و بے نوائی، فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لئے اور رحمت خداوندی کو جوش میں لانے کے لئے ان سے زیادہ پُر اثر، پُر خلوص اور دلنشیں الفاظ انسان کے کلام میں مل سکتے ہیں اور اپنے دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں، آج بھی ان کو ادا کرتے ہوئے دل امنڈ آتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور رحمتِ خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے، رحمۃ للعالمین ﷺ پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں کہ ایسی پُر کیف اور اثر آفریں دعا امت کو سکھا گئے اور "بابِ رحمت" پر اس طرح دستک دینا بتا گئے: **اللھم صل وسلم علیه وعلی عترته بعدد کل معلوم لك**

بندگی و بے چارگی کا اظہار

سب جانتے ہیں کہ ایک قوی اور غنی ذات، قادر مطلق، سلطانِ برحق، مالک الملک کو اپنی طرف کھینچنے، متوجہ کرنے اور اس کی رحمت کے لئے اپنی عجز و درماندگی اور اپنی بندگی و بیچارگی کے زیادہ سے زیادہ اور مؤثر سے مؤثر اظہار کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس اعتراف کی کہ ہم خاندانی و نسلی غلام، مملوک اور اس درِ دولت اور آستانۂ شاہی کے قدیمی نمک خوار و پروردۂ نعمت ہیں۔ جان و مال ہر چیز

کے آپ مالک ہیں، کوئی چیز آپ کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں، ایسی حالت میں آپ ہی رحم نہ فرمائیں گے اور آپ ہی خبر نہ لیں گے تو کون لے گا۔ دیکھئے کسی دعا کے لئے اس سے بہتر تمہید اور مقصد کی کشائش کے لئے اس سے بہتر کلید کیا ہو سکتی ہے؟

اللهم إنی عبدك وابن عبدك وابن امتك ناصيتي بيدك ماض فی حكمك عدل فی قضائك أسئلك بكل اسم هو لك سميت به نفسك أو انزلته في كتابك أو علمته احداً من خلقك أو استاثرت به فی علم الغيب عندك أن تجعل القرآن العظيم ربيع قلبی ونور بصری وجلاء حزنی وذهاب همی

(طبرانی عن ابن مسعود) اے اللہ! میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں تیرے بندے کا اور بیٹا ہوں تیری بندی کا، ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں، نافذ ہے میرے بارے میں تیرا حکم اور عین عدل ہے میرے باب میں تیرا فیصلہ، میں تجھے ہر اسم کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذات کو موصوف کیا یا اس کو اپنی ذات میں اتارا ہے یا اسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے یا اپنے پاس اسے غیب ہی میں رہنے دیا ہے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار بنا دے اور میری آنکھ کا نور اور میرے غم کی کشائش اور میری تشویش کا دفعیہ۔

انسانی ضروریات کی جامع نمائندگی

انسان کی ضروریات بے انتہا ہیں، ان میں انتخاب نہایت مشکل۔ ان سب کا سمیٹنا ناممکن۔ ایسی حالت میں انسان اپنی کیا ضروریات بیان کرے، کیا نہ کرے۔ ہم اپنے ہی حال پر غور کریں کہ اگر عرضِ مدعا کا موقع آئے تو ہمیں کیسی پریشانی پیش آئے اور بعد میں کیسی کیسی حسرت ہو کہ ع

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن دیکھئے پیغمبر انسانیت ﷺ نے انسانیت کی (بشرطیکہ وہ فطرتِ صحیحہ پر ہو) اور انسانی ضروریات کی کیسی جامع نمائندگی کی ہے :

لا اله الا الله الحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم والحمد لله رب العالمين أسئلك موجبات رحمتك وعزائم مغفرتك والغنيمة من كل بر و السلامة من كل اثم لا تدع لي ذنبا الا غفرته ولا هما الا فرجته ولا حاجة هي لك رضى الا قضيتها يا ارحم الرحمين (ترمذی ابن ماجه)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ حلیم و کریم ہے پاکی ہے اللہ کی جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ میں تجھ سے وہ اعمال و خصائل مانگتا ہوں جو تیری رحمت کو واجب کرنے والی ہیں اور مغفرت کے یقینی اسباب اور ہر نیکی کی لوٹ اور ہر معصیت سے حفاظت، کوئی گناہ نہ چھوڑ جسے تو بخش نہ دے، نہ کوئی تشویش جسے تو دور نہ فرمادے، نہ کوئی ایسی ضرورت جو تیری مرضی کے مطابق ہے جس کو پورا نہ فرمائے، اے ارحم الراحمین۔

ایک دوسری دعا میں فرماتے ہیں :

اللهم أصلح لي ديني الذي هو عصمة امري وأصلح لي دنياى التي فيها معاشي وأصلح لي آخرتي التي فيها معادى واجعل الحياة زيادة لي في كل خير واجعل الموت راحة لي من كل شر. (مسلم عن ابی هريرة)

اے اللہ! میرا دین درست رکھ جو میرے حق میں بچاؤ ہے اور میری دنیا درست رکھ جس میں میری معاش ہے اور میری آخرت درست رکھ جہاں مجھے لوٹنا ہے اور زندگی کو میرے حق میں ہر بھلائی میں ترقی اور موت کو میرے حق میں ہر برائی سے

امن بنادے۔

غیر فانی عیش اور غیر مختتم مسرت

انسان لطف و مسرت کا کتنا حریص ہے، لیکن اس کی نگاہ محدود اور کوتاہ، وہ فانی لذت کا جویا اور ختم ہو جانے والی مسرت کا طالب ہے، آپ دعا فرماتے ہیں۔ اور دعاء ہی دعا میں اس نکتہ کی تعلیم دے جاتے ہیں کہ اصل مانگنے کی چیز غیر فانی عیش اور غیر مختتم مسرت ہے اور اصل مطلوب شے دوسری زندگی کی راحت اور دیدار الٰہی کی لذت ہے۔

اللهم إني أسئلك نعيما لا ينفد وقرة عين لا تنقطع و أسئلك الرضاء بالقضاء وبرد العيش بعد الموت ولذة النظر الى وجهك والشوق إلى لقائك. (مستدرك عن عمار بن ياسر) اے اللہ! میں تجھ سے ایسی نعمت مانگتا ہوں جو ختم نہ ہو اور ایسی آنکھوں کی ٹھنڈک جو جاتی نہ رہے اور میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرے حکم (تکوینی) پر رضا مند رہنا اور موت کے بعد خوش عیشی اور تیرے دیدار کی لذت اور تیری دید کا شوق۔

دعاؤں میں اخلاقی حقیقتیں اور نفسیاتی نکتے

ایمان کی دولت کے بعد اخلاق حسنہ بڑی نعمت ہیں، جس نے اپنے متعلق خبر دی ہے کہ :**بعثت لاتمم مكارم الاخلاق**۔ میری بعثت کی (ایک اہم غرض) مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ وہ مکارم اخلاق کی اہمیت کیسے محسوس نہ کرے گا اور اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر اس کی نظر کیسے نہ ہو گی؟ ماثور دعاؤں کا ایک بڑا حصہ اخلاق و صفاتِ حسنہ سے متعلق ہے۔ اور ان دعاؤں میں ایسی اخلاقی حقیقتیں اور ایسے نفسیاتی نکتے بیان کئے گئے ہیں جو علماء اخلاق و علم النفس کے لئے مستقل

موضوع مطالعہ ہیں۔

پہلے تو آپ کی ایک جامع دعا پڑھیے، پھر مختلف اخلاقِ انسانی پر ادعیۂ ماثورہ کا مطالعہ کیجیے، تہجد کی ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں :

اللهم اهدني لأحسن الاعمال والاخلاق ولا يهدى لا حسنها إلا أنت وقني سىء الأعما ل وسيىء الأخلاق لا يقى سيئها إلا أنت .(النسائى عن جابرؓ) اے اللہ! مجھے بہترین اعمال اور بہترین اخلاق کی توفیق ور ہنمائی فرما، بہترین اعمال واخلاق کی تو ہی رہنمائی فرما سکتا ہے اور مجھے برے اعمال واخلاق سے تو ہی بچا سکتا ہے۔

آئینہ دیکھ کر انسان کو اپنے اعضاء کے تناسب اور "احسنِ تقویم" کی صداقت کا احساس ہوتا ہے۔اس موقع پر بھی اخلاق کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے اور حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کی دعا کی تعلیم دی گئی ہے کہ ان دونوں کی جامعیت کے ساتھ انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ آئینہ دیکھ کر ارشاد ہوتا ہے :

الحمد لله ،اللهم كما حسنت خَلقي فحسن خُلقي (مسند احمد عن ام سلمةؓ) اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور تعریف ہے، اے اللہ! تو نے میری صورت اچھی بنائی تو میری سیرت بھی اچھی کر دے۔

کامل زندگی اور "حیات طیبہ" کی تکمیل ایمان، صحت اور حسن اخلاق کے مجموعہ سے ہوتی ہے۔ایک دعا میں ارشاد ہوتا ہے :

اللهم إنى أسئلك صحة فى ايمان وإيمانا فى حسن خلق. (مستدرك حاكم) اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں تندرستی ایمان کے ساتھ اور ایمان حسن اخلاق کے ساتھ۔

ایک دوسری دعا میں ہے :

وأسئلك لسانا صادقا وقلبا سليما وخلقا مستقيما. (ترمذی) تجھ سے مانگتا ہوں سچی زبان اور قلب سلیم اور اخلاق صحیح۔

چند اخلاقی باریکیاں

اخلاق کی ان عمومی اور اجمالی دعاؤں کے ساتھ بعض ایسے محاسن اخلاق کی دعا کی گئی ہے (اور اس کے ذریعہ امت کو ان کی اہمیت واہتمام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے) جو بڑے لطیف اور باریک ہیں اور کمال اخلاق کے لئے معیار کا درجہ رکھتے ہیں، تکمیل اخلاق اور کمال انسانیت وشرافت و تقویٰ کی ایک علامت یہ ہے کہ خدا کے عاجز ومسکین بندوں سے محبت ہو۔ اہل دولت وقوت کی توقیر اور ان سے محبت کرنے والے تو عام ہیں، مگر فقراء ومساکین سے محبت کرنے والے بہت کمیاب ہیں۔ یہ اخلاق کا اعلیٰ درجہ ہے اور محض توفیق الٰہی پر منحصر ہے، ایک دعا میں ارشاد ہوتا ہے :

اللهم إنى أسئلك فعل الخيرات وترك المنكرات وحب المساكين (مستدرك حاكم) اے اللہ! میں تجھ سے توفیق چاہتا ہوں، نیکیوں کے کرنے کی اور برائیوں کے چھوڑنے کی اور غریبوں کے ساتھ محبت کی۔

دنیا میں رواج دوسروں کو چھوٹا اور اپنے کو بڑا سمجھنے کا ہے اس مرض سے صرف وہی برگزیدہ نفوس بچ سکتے ہیں، جن کا تزکیہ ہو چکا ہو اور ان پر فضل الٰہی ہو، اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بہت کم نفوس اس خود پرستی وخود بینی سے بچتے ہیں۔ ؎

ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

اس کے لئے اہتمام سے دعا کی ضرورت ہے کہ یہ مرض مشکل سے نظر آتا ہے اور مشکل سے اس سے چھٹکارا ملتا ہے۔ سید المخلصینؐ خود اپنے حق میں اس طرح دعا فرماتے ہیں اور گویا امت کو تعلیم دیتے ہیں :

اللهم اجعلني صبورا واجعلني شكورا واجعلني في عيني صغيرا وفي أعين الناس كبيرا . (كنزالاعمال عن بريدةؓ) اے اللہ! مجھے بڑا صبر کرنے والا بنادے اور مجھے بڑا شکر کرنے والا بنادے اور مجھے میری نظر میں چھوٹا بنادے اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنادے۔

ظاہر وباطن کی مطابقت اور دونوں کا جمال واصلاح نعمت خداوندی اور وہ دولت خاص ہے جس کے لئے اہتمام سے دعا کی ضرورت ہے، معلمؐ اخلاق فرماتے ہیں :

اللهم اجعل سريرتي خيرا من علانيتي واجعل علانيتي صالحة. (ترمذی) اے میرے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر کردے اور میرے ظاہر کو صالح بنادے۔

اس کی مزید تفصیل اس دعا میں ملاحظہ فرمائیے :

اللهم طهر قلبي من النفاق وعملي من الرياء ولساني من الكذب، وعيني من الخيانة ، فإنك تعلم خائنة الأعين وما تخفي الصدور. (كنزالعمال) اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک کردے، میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے، تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

دلوں کی ترجمانی

پیغمبرؑ انسانیت نے دعا میں انسانوں کی طرف سے انسانی ضروریات کی بھی ایسی مکمل نیابت کی ہے کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہر زمان و مکان میں ان دعاؤں میں اپنے دل کی ترجمانی، اپنے خیالات کی نمائندگی اور اپنے اطمینان کا سامان ملے گا اور بہت سی وہ ضرورتیں ملیں گی، جن کی طرف آسانی سے ہر ایک انسان کا ذہن جانا مشکل ہے، مثال کے طور پر حسب ذیل دعا پڑھئے:

اللهم إني أعوذبك من منكرات الأخلاق والأعمال والأهواء والأدواء نعوذ بك من شرما استعاذ منه نبيك محمد ﷺ ومن جار السوء في دارالمقامة فإن جار البادية يتحول، وغلبة العدو وشماتة الأعداء ومن الجوع فإنه بئس الضجيع ومن الخيانة فإنها بئست البطانة، وأن نرجع على أعقابنا أو نفتن عن ديننا، ومن الفتن ما ظهر منها وما بطن ومن يوم السوء ومن ليلة السوء ومن ساعة السوء ومن صاحب السوء. (ترمذی)

اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال اور نفسیاتی خواہشوں اور بیماریوں سے اور ہم تیری پناہ میں آتے ہیں ہر اس چیز سے جس سے تیرے نبی محمد ﷺ نے پناہ مانگی ہے اور مستقل قیام گاہ میں بُرے پڑوسی سے (اس لئے کہ سفر کا ساتھی تو چل ہی دیتا ہے) اور دشمن کے غلبہ سے اور دشمنوں کے طعنہ سے اور بھوک سے کہ وہ بُری ہمخواب ہے اور خیانت سے کہ وہ بُری ہمراز ہے اور اس سے کہ ہم پچھلے پیروں پر لوٹ جائیں یا فتنہ میں پڑکر دین سے الگ ہو جائیں اور سارے فتنوں سے جو ظاہری ہوں یا باطنی اور بُرے دن سے اور بُری رات سے اور بُری گھڑی سے اور بُرے ساتھی سے۔

کبر سنی میں فراخ روزی

رزق کس کو مطلوب نہیں، مگر کتنے آدمیوں کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ فراخ روزی کی سب سے زیادہ ضرورت عمر کے اس مرحلے میں ہے جب مشکلات و تنگی کا تحمل کم، محنت اور کسبِ معاش کی قوت مفقود اور قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور قدرتی طور پر راحت و فراخ دستی کی طلب زیادہ ہوتی ہے، معلمؐ حکمت نے کیا حکمت کی بات فرمائی:

اللهم اجعل اوسع رزقك عليّ عند كبر سني وانقطاع عمري. (مستدرك عن عائشةؓ) اے اللہ! میری سب سے زیادہ کشادہ روزی میرے بڑھاپے اور میرے خاتمہ کے وقت کر۔

عمر کے آخری حصہ کی بہتری وکامیابی

صرف رزق ہی پر اکتفا نہیں، عمر کا یہ آخری حصہ ہر اعتبار سے بہتر اور کامیاب تر ہونا چاہئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واجعل خير عمري آخره وخير عملي خواتيمه وخير ايامي يوم القاك فيه (طبرانی) میری عمر کا بہترین اس کا آخری حصہ کرنا اور میرا بہترین عمل میرا آخر ترین عمل کرنا اور میرا بہترین دن وہ کرنا جس میں تجھ سے ملوں۔

غیر متوقع نعمت کی دعا اور ناگہاں مصیبت سے پناہ

نعمت و مسرت بڑی مسرت کی چیز ہے لیکن جو نعمت و مسرت بے سان و گمان اور اچانک ملے اس کی مسرت ہی کچھ اور ہے، اسی طرح مصیبت اگر ایک بار پناہ مانگنے کی چیز ہے، تو جو مصیبت اچانک اور ناگہاں پیش آئے وہ سو بار پناہ مانگنے کی چیز ہے، جن لوگوں کو کبھی اس سے سابقہ پڑا ہے وہ اس کی چوٹ کو جانتے ہیں، لیکن کتنے آدمیوں کو اس سے پناہ مانگنے کا خیال اور توفیق ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

اس حقیقت کو بھی اپنی جامع ومانع دعاؤں میں فراموش نہیں فرمایا۔اول الذکر کی دعا کی اور ثانی الذکر سے پناہ مانگی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

اللهم إنی أسئلك من فجاة الخير واعوذبك من فجاة الشر. (طبرانی)

اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں بھلائی غیر متوقع اور ناگہاں برائی سے تیری پناہ۔

راحت کے بعد کلفت سے پناہ

اسی طرح عیش وفراخی اور خوشی وخرمی کے بعد فقر فاقہ اور تنگ دستی وپریشان حالی، پناہ مانگنے کی چیز اور ایک بڑا ابتلاء ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اہتمام کے ساتھ اس سے پناہ مانگی۔

اللهم إنی اعوذ بك من زوال نعمتك وتحول عافيتك وفجاة نقمتك. (مسلم) اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں تیری نعمت کے چھٹ جانے سے اور تیری سلامتی کے ہٹ جانے سے اور تیرے انتقام کی ناگہانی سے۔

ناکارہ عمر سے پناہ

درازی عمر ہمیشہ سے انسانوں کی خواہش رہی ہے اور لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے اس کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی عمر کہ قویٰ جواب دے جائیں اور انسان مفلوج، معذور اور دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ جائے۔ اللہ سے پناہ مانگنے کی چیز ہے، ارشاد ہوتا ہے :

اللهم إنی أعوذبك من العجز والكسل والجبن والهرم ومن أن ارد إلى أرذل العمر . اے اللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کم ہمتی سے، سستی سے اور بزدلی سے اور انتہائی کبر سنی سے اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں۔

نفس حریص اور علم غیر نافع سے پناہ

لوگ دولت ورزق کو منتہی سمجھتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ نفسِ حریص کے ساتھ دولت ورزق کی بڑی سے بڑی مقدار ناکافی ہے۔ وہ نفس جو کبھی قانع و آسودہ نہ ہو۔ انسان اور تمام دنیا کے لئے ایک بلا ہے۔ حکیم ربانی نے اس سے پناہ مانگی ہے اور ہمیں اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔ اسی طرح علم جو انسان میں خشیت و تقوی نہ پیدا کرے اور لوگ اس سے کچھ فیض نہ پائیں، نیز وہ دل بیباک بھی جو خدا کے خوف سے خالی ہو، پناہ مانگنے کی چیزیں ہیں کہ انھوں نے انسان کے ساتھ وہ کیا، جو دشمن بھی نہیں کرتا، ایک ہی دعا میں ان کو جمع فرمایا جاتا ہے :۔

اللهم إني اعوذبك من قلب لا يخشع ودعاء لا يسمع ومن نفس لا تشبع ومن علم لا ينفع اعوذبك من هولاء الأربع. (ترمذی ونسائی)

اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ایسے دل سے جو ڈرنا نہ جانے، اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے اور ایسے نفس سے جو آسودہ ہونا نہ جانے، اور ایسے علم سے جو نفع نہ دے، میں تجھ سے ان چاروں (بلاؤں) سے پناہ چاہتا ہوں۔

زندگی کی بنیادی ضرورتیں

انسان کی بنیادی اور واقعی ضرورتوں میں جیسے فراخ روزی ہے، ویسے ہی وسیع گھر ہے۔ کسی زمانہ میں بھی اس کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ اور اس زمانہ میں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور وہ زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظر کے سامنے ہے کہ اصل مسئلہ گھر کا وسیع ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ گھر کا کافی ہونا اور اس میں وسعت محسوس کرنا ہے اور اگر وسعت کا احساس نہیں ہے تو وہ وسیع سے وسیع گھر طبع حوصلہ مند کے لئے تنگ اور ناکافی معلوم ہوگا، اور یہی احساس حقارت وعدم کفایت اس زمانہ میں تمدن اور اقتصادی نظام کے لئے

ایک لاینحل مسئلہ بن گیا ہے۔ پیغمبر حکیمؐ فراخ روزی اور وسیع گھر کے بجائے اس کی دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق میں فراخی اور گھر میں وسعت عطا فرمائے۔ دونوں میں جو فرق ہے وہ نگاہِ نکتہ شناس سے مخفی نہ ہوگا۔

ارشاد ہے:

اللهم اغفرلی ذنبی ووسع لی فی داری وبارك لی فی رزقی. (نسائی)

اے اللہ! مجھے میرے گناہ بخش دے اور مجھے میرے گھر میں وسعت دے اور مجھے میرے رزق میں برکت دے۔

مسافر کی ضروریات اور احساسات کی ترجمانی

سفر زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مسلمان کا کوئی اہم قدم اور اہم حرکت بھی دعا اور خیر طلبی سے خالی نہیں ہونی چاہئے، سفر تو ایسا اقدام ہے جس کے لئے بہت زیادہ خیر طلبی اور دعا کی ضرورت ہے۔ مسافر گھر اور گھر والوں کو چھوڑتا ہے، طویل سفر، نئے مقامات اور نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک مدت تک اپنے گھر اور گھر والوں سے جدا رہتا ہے۔ اس کا دل فکروں اور تمناؤں سے معمور ہوتا ہے، پیچھے کی فکر، آگے کی تمنا، سفر کا اہتمام، راستہ کا تکان، منزل کی دوری، مقاصد کی فکر اس کے دل ودماغ کو مشغولی رکھتی ہے۔ ان میں سے ہر ہر مرحلہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی اعانت اور حفاظت کی ضرورت ہے۔ دیکھئے اس مختصر سی دعا میں کس طرح ان سب ضروریات واحساسات کی نمائندگی کی گئی ہے، بڑے غور وفکر اور اعلیٰ ذہانت سے بھی اس سے زیادہ جامع دعا ترتیب دینی مشکل ہے۔

اللهم إنا نسئلك فی سفرنا هذا البر والتقوی ومن العمل ما ترضیٰ، اللهم هون علینا سفرنا هذا واطو عنا بعد الأرض اللهم أنت الصاحب فی

السفر والخليفة فى الأهل اللهم إنى اعوذ بك من وعثاء السفر وكآبه المنظر وسوء المنقلب فى الأهل والمال . (مسلم وترمذی) اے اللہ! ہم تجھ سے اپنے سفر میں نیکی اور تقویٰ اور تیری خوشنودی کے کام چاہتے ہیں۔اے اللہ! ہم پر یہ سفر آسان کردے اور زمین کا فاصلہ طے کردے۔اے اللہ! تو سفر میں رفیق اور گھر والوں میں نائب ہے۔اے اللہ! میں سفر کی مشقت، ناگوار منظر اور مال واہل میں بُری واپسی سے پناہ چاہتا ہوں۔

لیکن صرف سفر ہی اہتمام اور دعا کا مستحق نہیں، جس نئی بستی میں انسان داخل ہو، وہاں کی خیر طلب کرنے کی ضرورت ہے حدیث میں آتا ہے کہ آپ جب کبھی کسی نئی بستی میں داخل ہوتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے :اللهم بارك لنا فيها پھر فرماتے اللهم ارزقنا جناها (اے اللہ! ہمیں اس کا رزق عطا فرما) مسافر کو۔(اور جب مسافر داعی اور صاحب پیغام بھی ہو) خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ اس کو بستی کے سب رہنے والوں کی محبت حاصل ہو تاکہ وہ پوری راحت پائے اور اس کا پیغام دین واعتقاد کی رو سے انہی کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دینی چاہیئے جو اہل صلاح اور اہل دین ہوں۔اسی لئے اسی دعا میں فرمایا گیا:

وحببنا إلى أهلها وحبب صالحى أهلها إلينا . (طبرانی) اے اللہ! ہمیں اس کے رہنے والوں کی نگاہ میں محبوب کردے اور اس کے باشندوں میں سے جو نیک لوگ ہوں ان کو ہماری نگاہ میں محبوب بنادے۔

نئے دن اور نئی رات کی دعا

صرف سفر یا کوئی اہم منزل ہی اس کی مستحق نہیں کہ مومن اس کے لئے

دعا کرے اور اپنے مالک سے خیر طلب کرے، زندگی کا ہر نیا دن اور ہر نئی رات اس کی مستحق ہے کہ بندہ اس دن کی خیر طلب کرے اور اس دن یا رات کے شر سے پناہ مانگے اور اس کی دعا کرے کہ اس دن یا رات کی برکتوں اور نورانیتوں اور کامیابیوں سے اس کو وافر حصہ ملے اور اس کی شہادت دے کہ ملک اللہ کا ہے۔ ہر تغیر اور ہر تجدد کے موقع پر اس حقیقت کا استحضار کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ شام کو یہ دعا فرماتے تھے:

أمسينا وأمسى الملك لله والحمد لله لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئى قدير ورب أسئلك خير ما فى هذه الليلة وخير ما بعد ها واعوذبك من شر ما فى هذه الليلة وشر ما بعدها، رب اعوَذبك من الكسل وسوء الكبر ، رب اعوذبك من عذاب فى النار وعذاب فى القبر. (جمع الفوائد) یہ شام اس حالت میں ہو رہی ہے کہ ہم اور یہ ساری کائنات اللہ کی سلطنت ہے۔ سب تعریف اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی سلطنت ہے اسی کی تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، میرے پروردگار! میں تجھ سے اس رات اور اس کے بعد کی رات کی خیر طلب کرتا ہوں اور اس رات اور اس کے بعد کی رات کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، پروردگار! تیری پناہ، سستی سے اور کبر سنی کی برائی سے، تیری پناہ جہنم کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے۔

اسی طرح صبح کو الفاظ کے تغیر کے ساتھ فرماتے:

اصبحنا واصبح الملك لله الخ.

ایک دوسری حدیث میں صبح کے وقت ان الفاظ کی تعلیم دی گئی ہے:

اصبحنا وأصبح الملك لله رب العالمين اللهم إني أسئلك خير هذا اليوم فتحه ونصره ونوره وبركته وهدٰه واعوذبك من شر ما فيه ومن شر ما بعده . صبح اس حالت میں ہوئی کہ ہم اور سارا عالم اللہ کی سلطنت ہے، اے اللہ! میں تجھ سے اس دن کی خیر و فتح و نصرت، نور و برکت و ہدایت مانگتا ہوں اور اس دن کے شر اور اس کے بعد کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

شرنفس سے پناہ

لیکن سب سے زیادہ ڈرنے اور پناہ مانگنے کی چیز اپنے نفس کا شر ہے، دنیا میں بڑی بڑی تباہیاں انسان ہی کے شر سے آتی ہیں اور دین و دنیا کا نقصان اسی "**شرِ نفس**" کا نتیجہ ہے، آپ نے بارہا اس سے پناہ مانگی ہے۔

صبح کی دعاؤں میں ہے:

اللهم فاطر السمٰوٰت والارض عالم الغيب والشهادة أنت رب كل شيءٍ والملائكة يشسهدون إنك لاإله إلاّ أنت فأنا نعوذ بك من شرّأنفسنا ومن شرّ الشيطان الرجيم وشركه وأن نقترف سوءً أو نجرّه إلىٰ مسلم. (جمع الفوائد) اے اللہ! آسمانوں و زمینوں کے خالق غیب و شہود کے جاننے والے! تو ہر چیز کا مالک ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، ہم تجھ سے اپنے نفس کی برائی سے اور شیطان رجیم کے شر اور اسکی شرکت سے پناہ چاہتے ہیں اور اس سے کہ ہم اپنے حق میں کسی شر کا ارتکاب کریں یا کسی مسلمان تک پہنچائیں۔

ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں:

اللهم قني شرّ نفسي واعزم لي على رشد أمري. (ترمذی) اے اللہ! مجھے

میرے نفس کی بُرائی سے محفوظ رکھ اور مجھے میرے امور کے اصلاح کی ہمت دے۔

ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں:

یا حیّ یا قیوم برحمتك أستغيث أصلح لی شأنی كله ولا تكلنی الیٰ نفسی طرفةعین. اے حیّ اے قیوم! میں تیری رحمت کے واسطے سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے سارے حال کو درست کر دے اور مجھے ایک لحہ کیلئے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔

خشیتِ الٰہی اور یقین کی دعا

اس شر اور معصیت سے پناہ اور حفاظت کیلئے سب سے بڑا حصار خشیت الٰہی ہے، اسی طرح مصائب کے اثر کو کم کرنے والی چیز صرف یقین ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا:

اللهم اقسم لنا من خشيتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك ومن طاعتك ما تبلّغنا به جنتك ومن اليقين ما تهوّن به علينا مصائب الدنيا. اے اللہ! ہمیں اپنی خشیت سے اتنا حصہ دے کہ ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی طاعت سے اتنا حصہ کہ تو ہمیں اس کے ذریعہ سے جنت میں پہنچادے اور یقین سے اتنا حصہ کہ اس سے تو ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان کر دے۔

شرور و معاصی کا سرچشمہ اور اس سے پناہ

ان شرور و معاصی کا سرچشمہ اور ان کا ایک اہم اور قوی سبب دنیا کی محبت اور اس کا مقصود اعظم ہوتا ہے، حب الدنيا رأس كل خطيئة مزاج و مذاق نبویؐ

یہ ہے کہ اللھم لاعیش الاّ عیش الآخرة (اے اللہ! زندگی تو آخرت کی ہی زندگی ہے)وإنّ الدار الآخرة لهي الحيوان.

اسی دعا کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

ولا تجعل الدنيا أكبر همنا ولا مبلغ علمنا ولا غاية رغبتنا ولا تسلّط علينا من لا يرحمنا. اور دنیا کو نہ ہمارا مقصود اعظم بنا، نہ ہماری معلومات کی انتہا اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر نامہربان ہو۔

محبتِ الٰہی اصل علاج ہے

دین کو جو چیز آسان، مرغوب و محبوب بناتی ہے، معصیتوں سے طبعی نفرت پیدا کرتی ہے، دنیا کی محبت کو ریشہ ریشہ سے نکالتی اور اس کی بڑی سے بڑی عظمت کو دل و نگاہ سے گراتی، بڑے بڑے امتحانوں میں قدم کو جماتی اور دل کو تھامتی ہے، وہ حقیقی محبت الٰہی ہے، جس کا دل اس محبت کا آشنا ہو گیا، اس کے دل کو نہ کوئی جلال مرعوب کر سکا، نہ کوئی جمال مسحور کر سکا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

ضابطہ کا تعلق یا قانونی اطاعت اس محبت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا کہ ضابطہ چور دروازے بھی پیدا کر لیتا ہے، تاویلیں اور قانونی موشگافیاں بھی جانتا ہے، اکتاتا بھی ہے، تھک بھی جاتا ہے، لیکن محبت تاویل سے نا آشنا اور تکان اکتاہٹ سے بیگانہ ہے کہ وہ زخم بھی ہے اور مرہم بھی، راہ بھی ہے اور منزل بھی۔

عاشقاں را خستگئی راہ نیست!
عشق خود رہ است وہم خود منزل است

محبت الٰہی کی دعائیں

سرور کائنات ﷺ نے بڑے اہتمام سے اس محبت الٰہی کی دعا فرمائی ہے،

ایک دعا کے الفاظ ہیں :۔

اللهم اجعل حبك أحب إليّ من نفسي و أهلي ومن الماء البارد.
(ترمذی) اے اللہ! اپنی محبت مجھے پیاری کردے میری جان سے اور میرے گھر والوں سے اور سرد پانی سے بڑھ کر۔ ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں :

اللهم اجعل حبك أحب الأ شياء إليّ واجعل خشيتك أخوف الأ شياء عندى و اقطع عنى حاجات الدنيا بالشوق إلى لقائك واذا أقررت عين أهل الدنيا من دنيا هم فاقرر عيني من عبادتك. (کنزالاعمال) اے اللہ! اپنی محبت کو میرے لئے تمام چیزوں سے محبوب تر اور اپنے ڈر کو میرے لئے تمام چیزوں سے خوفناک تر بنادے اور مجھے اپنی ملاقات کا شوق دے کر دنیا کی حاجتیں مجھ سے قطع کردے اور جہاں تو نے دنیا کی آنکھیں ان کی دنیا سے ٹھنڈی کر رکھی ہیں، میری آنکھ اپنی عبادت سے ٹھنڈی رکھ۔

ایک اور دعا کے الفاظ ہیں :

اللهم ارزقني حبك و حب من ينفعني حبه عندك اللهم فكما رزقتني مما أحب فاجعله قوّة لي فيما تحب ، اللهم وما زويت عني مما أحب فاجعله فراغاً لي فيما تحب. (ترمذی) اے اللہ! مجھے اپنی محبت نصیب کر اور اس شخص کی بھی محبت جس کی محبت تیرے نزدیک میرے حق میں نافع ہو، یااللہ! جس طرح تو نے مجھے وہ دیا جو مجھے پسند ہے اسے میرا معین بھی اس کام میں بنادے جو مجھے پسند ہے، اے اللہ! تو نے جو دور رکھا ہے مجھ سے ان چیزوں میں سے جو مجھ کو پسند ہیں

تواسے میرے حق میں ان چیزوں کے لئے موجب فراغ بنادے جو تجھے پسند ہیں۔

اعانت وعنایتِ الٰہی کی دعا

لیکن یہ محبت، یہ اطاعت، یہ توفیق عبادت، یہ ذکر و شکر کی دولت سب اس کی عنایت واعانت پر منحصر ہے، اس لئے محبوبِ خدا نے اپنے ایک محبوب صحابی کو پر محبت الفاظ میں تاکید فرمائی :

یا معاذ واللہ إنی لأحبك أوصيك يا معاذ لا تدعنّ فی دبر کل صلاۃ أن تقول اللھم أعنی علی ذکر ك وشكرك وحسن عبادتك. اے معاذ! واللہ مجھے تم سے محبت ہے، میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ دعا کسی نماز میں ترک نہ ہو کہ اے اللہ! میری اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت پر مدد فرما۔

قلبِ سلیم کی شہادت

یہ ہیں حدیث کی وہ دعائیں، جن میں نبوت کا نور و یقین، انبیاء کا علم و حکمت اور اس معرفت و محبت کی پوری تجلیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت اور سید الانبیاء ﷺ کا امتیاز خاص ہے، جس طرح چہرۂ نبویؐ پر نظر پڑتے ہی عبداللہ بن سلام کی طبع سلیم نے شہادت دی تھی واللہ ھذا لیس بو جه کذّاب (خدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا) اسی طرح ان دعاؤں کو پڑھ کر قلب سلیم شہادت دیتا ہے کہ یہ نبیٔ معصوم کے سوا کسی کا کلام نہیں ہو سکتا۔

عارف رومیؒ نے دونوں کے متعلق شہادت دی ہے،

درد دل ہر کس کہ دانش راہ مزہ است
رود آوازِ پیمبر معجزہ است

کمال نبوت اور علوم نبوت کی معرفت و شناخت کے لئے جس طرح

سیرت کے ابواب اور اعمال واخلاق وعبادات ہیں، اسی طرح ایک دلیل نبوت اور معجزۂ نبویؐ یہ ادعیہ ماثورہ ہیں۔

کتنی خوش قسمت ہے وہ امت جس کو نبوت کی وراثت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے طفیل میں دین، دنیا کا خزانہ اور غیب کی نعمتوں اور دولتوں کی یہ کنجیاں ملیں، اور کتنی بد قسمتی اور پست ہمتی ہے اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆ ☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

انسانیت کے محسنِ اعظم ﷺ

اور

شریف ومتمدن دنیا کا اخلاقی فرض

اس انگریزی مقالہ کا اصل
اردو متن جو ۲۲؍اگست ۱۹۸۹ء کو
اسلامک اسٹڈیز سنٹر آکسفورڈ یونیورسٹی
انگلینڈ میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت کے محسنِ اعظمؐ

اور

شریف ومتمدن دنیا کا اخلاقی فرض

حضرات! یہ دنیا جس میں آپ رہ بس رہے ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنے عقیدہ، ذوق، صلاحیت اور وسائل وامکانات کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں، اور اپنے ہم وطنوں (اور اس سے آگے بڑھ کر) اپنے ہمعصروں کے ساتھ مہذب اور شریفانہ اور پر سکون اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں، اسی کے ساتھ تعلیمی وتدریسی، تصنیفی وتحقیقی، تجرباتی اور اکتشافاتی میدان میں بھی اپنے اپنے درجہ اور حوصلہ کے مطابق حصہ لیتے ہیں، اور اس زندگی اور اس کے ماحول کو اس سے بہتر، اس سے زیادہ محفوظ پُر امن، اس سے زیادہ خوشگوار وپُر سکون، اور اس سے زیادہ ترقی یافتہ ومعیاری بنانے کی اُمنگ اور خواہش رکھتے ہیں، یہ دنیا اور یہ کرۂ ارض جس پر ہم رہتے بستے ہیں، ہمیشہ سے ایسا معتدل، پُر سکون، سنجیدہ وباوقار، مُتحمل وروادار، فکری وتعمیری خدمات انجام دینے، اپنے اپنے عقیدہ ومسلک کے مطابق

زندگی گزارنے، ایک دوسرے کا احترام واعتراف کرنے اور بقائے باہم (CO-EX-ISTENCE) کے لئے ہمیشہ تیار نہیں تھا۔

اس زمین پر بسنے والی نسلِ انسانی کئی بار خودکشی اور خود سوزی کے لئے تیار اور کمربستہ پائی گئی، اس دنیا کی تاریخ میں کئی دور ایسے گزرے ہیں کہ اس نسل انسانی نے زندہ اور باقی رہنے کا استحقاق کھودیا، اور اس نے باشعور اور باضمیر انسانوں کے بجائے غیر ذی عقل جانوروں اور خونخوار و آدم خور درندوں کی شکل اختیار کرلی، تہذیب وتمدن، علم وہنر، اخلاق واقدار، نظام وقانون، اصول وضوابط، سب پر ایک احتضار (عالمِ سکرات) کی کیفیت طاری ہوگئی۔

سب جانتے ہیں کہ تاریخ کی تدوین کا کام بہت دیر سے شروع ہوا، اور **"ماقبل تاریخ"** کا دور **"مابعد تاریخ"** کے دور سے کہیں زیادہ طویل اور وسیع گزرا ہے، پھر زوالِ آدمیت اور دورِ وحشت کی داستان کچھ ایسی خوشگوار اور قابل فخر بھی نہیں تھی کہ اس کو پیش کرنے میں مصنفین ومؤرخین اپنی صلاحیتیں صرف کریں، اس لئے ہمیں بڑے بڑے طویل وقفوں کے بعد انسانی معاشرہ، تہذیب وتمدن، اور حکومتوں اور نظامہائے مملکت کے زوال کے بارے میں تاریخی شہادتیں تاریخ عالم کے صفحات پر بکھری ہوئی ملتی ہیں، اور ان کا سلسلہ زیادہ تر پانچویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، ان میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

مشہور انگریز مصنف H.G. WELLS ساسانی اور بازنطینی حکومتوں کے ذکر میں اس عہد کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے :-

"سائنس اور سیاست دونوں، ان برسرِ پیکار اور زوال

پذیر حکومتوں میں موت کی نیند سو چکے تھے، اتھنس -ATH
ENS کے متاخرین فلسفیوں نے اپنی تباہی تک (جو اس پر مسلط کردی گئی تھی) عہد قدیم کے ادبی سرمایہ کو اگرچہ بغیر سوچے سمجھے مگر بے انتہا عقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا تھا، لیکن اب دنیا میں انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جو عہد قدیم کے شرفاء کی طرح جری اور آزاد خیالی کا حامی ہوتا، اور قُدماء کی تحریروں کی طرح تلاش و تحقیق یا جرأت مندانہ اظہارِ خیال کا داعی ہوتا۔

اس طبقہ کے ختم ہونے کی خاص وجہ سیاسی و سماجی افراتفری تھی، لیکن ایک وجہ اور بھی تھی، جس کے باعث اس عہد میں ذہن انسانی کند اور بنجر ہو چکا تھا، ایران اور باز نطینہ دونوں ملکوں میں عدم رواداری کا دور دورہ تھا، دونوں حکومتیں ایک نئے انداز کی مذہبی حکومتیں تھیں جس میں آزادانہ اظہار خیال پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے"۔(۱)

باز نطینی شہنشاہی پر ایرانی شہنشاہی کے حملے اور باز نطیوں کی فتح کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں سماجی و اخلاقی پستی پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف لکھتا ہے :۔

"اگر کوئی سیاسی پیش گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیر اقتدار آجائے گا،

مغربی یورپ میں نہ کوئی نظم تھا نہ اتحاد، باز نطینی اور ایرانی حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تُلی ہوئی تھیں، ہندوستان بھی منقسم اور تباہ حال تھا"۔(۲)

رابرٹ بری فالٹ ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:۔

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی، اس دور کی وحشت وبربریت، زمانہ قدیم کی وحشت وبربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی، جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے، اور اس پر زوال کی مُہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ وبار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا، جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دوردورہ تھا"۔(۳)

قدیم مذاہب نے جس تہذیب کو پروان چڑھایا تھا، اس کے زوال کے بارے میں جے۔ایچ ڈینی سن J.H. DENISON لکھتا ہے:۔

"پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں مہذب دنیا افراتفری کے دہانہ پر کھڑی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چار ہزار سال کی مدت میں جس تہذیب نے بال وپر نکالے تھے وہ منتشر ہونے والی ہے، اور انسان پھر اسی بربریت کی جانب لوٹنے

والا ہے، جس میں ہر قبیلہ اور فرقہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائے اور امن واماں معدوم ہو جائے۔۔۔ہُما نے قبائلی نظام کی توانائی ختم ہو چکی تھی۔۔۔ عیسائیت نے جو روایات قائم کی تھیں وہ اتحاد اور نظم کے بجائے تفرقہ اور تباہی کی جانب لے جارہی تھیں، یہ زمانہ المناک تھا، تہذیب جو ایک تناور درخت کی طرح ساری دنیا کو اپنے سایہ میں لئے ہوئی تھی، اور جس کی شاخیں علم وفن اور ادب کے زرّیں پھل دے چکی تھیں بربادی کے قریب تھی، اس گھن لگ چکا تھا"۔(۴)

نسلِ انسانی اور تہذیب وتمدن کی اس جاں کنی کے عالم میں جزیرۃ العرب میں خدا نے ایک انسان کو پیدا کیا اور نوعِ انسانی کو نہ صرف بچانے بلکہ انسانیت کے اس اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچانے کا دُشوار ترین اور نازک ترین کام سُپرد کیا، جو موّرخوں کے وسیع تجربے اور شاعروں کے بلند تخیل سے بھی فزوں تر تھا، اور اگر اس کے لئے ناقابلِ انکار تاریخی شہادتیں اور تواتر نہ ہوتا تو اس کا یقین کرنا بھی مشکل تھا، یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی جو چھٹی صدی مسیحی میں ظہور میں آئی، آپ کا پہلا کام یہ تھا کہ آپؐ نے اس تلوار کو جو نوعِ انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی، اور کوئی گھڑی تھی کہ اس کے سر پر گر کر اس کا کام تمام کردے، ہٹالیا، اور اسکو وہ تحفے عطا کئے جنہوں نے اس کو نئی زندگی، نیا حوصلہ، نئی طاقت، نئی عزت اور نئی منزلِ سفر عطا کی، اور ان کی برکت سے انسانیت، تہذیب وتمدن، علم وفن، روحانیت واخلاص، اور تعمیر انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا، انہوں نے انسانی معاشرہ کو ایک بے بہا دولت عطا کی، جس پر انسانیت کی خیر وبرکت اور تمدن کی تعمیر

وترقی کا دارومدار اور قیمتی سرمایہ ہے، بھلائی سے محبت اور برائی سے نفرت کا مقدس ترین جذبہ، اور شرک کی قوتوں اور اس کے مرکز کو پاش پاش کرنے اور خیر کی توسیع وترقی کے لئے قربانیاں دینے کا مبارک عزم، انسان کی تمام ترقیات، سربلندیوں اور ناقابلِ فراموش کارناموں کا اصل اور اساسی سبب یہی مقدس جذبہ اور مبارک عزم ہے کیونکہ تمام اسباب ووسائل، سازوسامان اور تجربہ وتحقیق کے ادارے، انسان کے عزم وارادہ کے تابع ہیں، انہوں نے قساوت وبہیمت کو رحمت ورأفت اور شرافت وانسانیت میں بدل دیا، انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیمات کی اشاعت کی، اس کے لئے مسلسل ومتواتر جدوجہد جاری رکھی، عیش وآرام کی پرواہ نہیں کی، عزت ووقار کا خیال نہیں کیا، حتی کہ اپنے جسم وجان کی بھی فکر نہیں کی۔

اس مسلسل وجاں کاہ محنت ومشقت کے نتیجہ میں انسانیت سے عاری، حیوانوں اور پھاڑ کھانے والے درندوں میں، ایسے نیک نفس لوگ پیدا ہوئے، جن کے انفاس سے دنیا مُعطر ہوگئی، جن کے حسن وجمال سے انسانیت کی تاریخ میں دل کشی ورعنائی آگئی، جو رفعت ومنزلت میں فرشتوں سے بھی آگے نکل گئے، تباہ وبرباد ہونے والی انسانیت کو نئی زندگی مل گئی، عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگیا، کمزوروں میں طاقت والوں سے اپنا حق وصول کرنے کی ہمت وطاقت پیدا ہوئی، بھیڑیوں نے بکریوں کی گلہ بانی کی، فضاؤں میں رحم وکرم کی خنکی چھاگئی، اُلفت ومحبت کی خوشبو پھیل گئی، سعادت کا بازار گرم ہوگیا، دنیا میں جنت کی دکانیں سج گئیں، ایمان ویقین کی عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں، انسانی نفوس ہوا وہوس کی گرفت سے آزاد ہوگئے، قلوب بھلائیوں کی طرف ایسے کھنچنے لگے جیسے مقناطیس کی طرف لوہے کے ٹکڑے۔

ہم اختصار اور انتخاب کے طور پر ان چند بنیادی اور قیمتی عطیوں کا ذکر کریں گے، جن کا نوعِ انسانی کی رہنمائی، صلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار رہا ہے، اور جنہوں نے ایک زندہ اور درخشندہ دنیا کی تخلیق و تشکیل کی ہے، جو کہنہ اور زوال پذیر دنیا سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔

وہ عطیات GIFTS درجِ ذیل ہیں :۔

ا۔ صاف اور واضح عقیدۂ توحید۔

۲۔ انسانی وحدت و مساوات کا تصور۔

۳۔ انسانیت کے شرف اور انسان کی عزت و بلندی کا اعلان۔

۴۔ عورت کی حیثیتِ عرفی کی بحالی، اور اس کے حقوق کی بازیابی۔

۵۔ ناامیدی اور بدفالی کی تردید، اور نفسیاتِ انسانی میں حوصلہ مندی اور اعتماد و افتخار کی آفرینش۔

۶۔ دین و دنیا کا اجتماع اور حریف و بر سر جنگ انسانی طبقات کی وحدت۔

۷۔ دین و علم کے درمیان مقدس دائمی رشتہ کا قیام و استحکام، اور ایک کی قسمت کو دوسرے کی قسمت سے وابستہ کر دینا، علم کی تکریم و تعظیم اور اسے بامقصد، مفید اور خدارسی کا ذریعہ بنانے کی سعی محمود۔

۸۔ عقل سے دینی معاملات میں بھی کام لینے، فائدہ اٹھانے، اور انفس و آفاق میں غور و فکر کی ترغیب۔

۹۔ اُمت اسلامیہ کو دنیا کی نگرانی و رہنمائی، انفرادی و اجتماعی اخلاق و رجحانات کے احتساب، دنیا میں انصاف کے قیام اور شہادتِ حق کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرنا۔

۱۰۔ عالم گیر اعتقادی و تہذیبی وحدت کا قیام۔

اب ہم اپنی طرف سے زیادہ کہنے اور تشریح کرنے کے بجائے چند مستند مغربی مفکرین و مصنفین اور ادباء مورخین کے تأثرات واعترافات پیش کرتے ہیں، اس مہذب دنیا کی جن چند چیزوں سے آبرو قائم ہے، اور جن کی بدولت تہذیب، تاریخ، اخلاقیات اور ادب و شاعری تک کی قدر و قیمت باقی ہے، وہ ناقابلِ انکار حقائق وواقعات کا اظہار واعتراف، جوہر و کمال کی قدردانی، اور محسنوں کا تشکر اور احسان مندی ہے، اور جس دن ہماری یہ دنیا، ہماری ادبیات، ہمارا اخلاقی نظام اور ہماری ادبی صلاحیت اور اظہار خیال کی آزادی اس شریفانہ عُنصر سے محروم اور عاری ہو جائے گی، اس دنیا میں رہنے اور بسنے کی لذت و عزت جاتی رہے گی، اور دنیا چوپایوں اور درندوں کی ایک بستی بن جائے گی، جہاں سوائے پیٹ بھر لینے، اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل اور ہوا و ہوس کے سوا کوئی مُحرک طاقت نہیں ہو گی، اور جہاں استاد و شاگرد، لینے والے اور دینے والے، مُعالج و مریض، (حتی کہ مادر و پدر و فرزند) کے درمیان رشتہ، اور مُحافظ و رہزن کے فرق کا احساس بھی جاتا رہے گا۔

اسی فطری جذبہ احسان مندی کے بارے میں "**انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس**" کے مقالہ نگار ولیم، ایچ، ڈیوڈسن WILLIAM H. DAVIDSON کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک فطری اور عالم گیر انسانی جوہر ہے، جس کو ہر زمانہ میں زندہ رہنا چاہئے۔

مقالہ نگار لکھتا ہے :۔

"بقول تھامسن براؤن THOMAS

BROWN جذبۂ تشکر محبت کے اس فرحت بخش جذبہ کا نام ہے جو ہم کسی دوسرے سے فائدہ پہنچنے پر محسوس کرتے ہیں، یہ احساس بذاتِ خود اس منفعت کا ایک جزء ہے جس سے ہم مُستفید ہوتے ہیں۔

احسان مندی کسی مہربانی کا ردِ عمل ہے، جو پورے خُلوص اور انبساط کے ساتھ واقع ہوتا ہے، یہ ردِ عمل فوری اور فطری ہوتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ فطرتِ انسانی کی تشکیل کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ انسانوں کے درمیان محبت ویگانگت اس کی بُنیادی صفت ہے، اور نفرت ودشمنی (اپنی تمام علامتوں کے ساتھ) غیر فطری اور مُخرّب اخلاق ہے"۔(۵)

اس اخلاقی پستی، دنائتِ طبع، ضمیر کے مردہ و مفلوج ہونے اور شرافتِ انسانی کے آخری اثر سے محروم ہوجانے کا سب سے بڑا مظہر، مذہبی پیشواؤں، معمارانِ انسانیت، اور محسنینِ عالم کی نہ صرف احسان فراموشی، بلکہ ان کے بارے میں وہ زبان واُسلوب اختیار کرنا ہے جو پست سے پست انسانوں کے بارے میں بھی روا نہیں ہے، اور جس سے نہ صرف ان کے کروڑوں ماننے والوں اور ان پر جان قربان کرنے والوں کے دل ودماغ مجروح ہوتے ہیں بلکہ حقائق کا بھی خون ہوتا ہے اور دیکھنے والی آنکھوں میں خاک جھونکی جاتی ہے، کسی شریف معاشرہ اور کسی مہذب ملک کو بھی ایسے دنی الطبع، ضمیر فروش، احسان فراموش اور غیر مہذب انسانوں کو برداشت نہیں کرنا چاہئے۔

اس کے مقابلہ میں ہم اس مغربی دنیا کے (جہاں ہم اپنے خیالات پیش کر

رہے ہیں) چند ترقی یافتہ اور مثالی ملکوں کے منصف مزاج، حقیقت پسند اور بلند پایہ مصنفین اور ادیبوں کے تأثرات اور خیالات پیش کرتے ہیں۔

فرانس کا مشہور ادیب لیمر ٹائن LAMARTINE نبوتِ محمدی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"کسی بھی انسان نے کبھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لئے اتنا رفیع الشان مقصد منتخب نہیں کیا، اس لئے کہ یہ مقصد انسان کی طاقت سے باہر تھا، توہمات اور خوش اعتقادیوں کو جو انسان کی طاقت سے باہر تھا، توہمات اور خوش اعتقادیوں کو جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان حجاب بن گئی تھیں، زیروزبر کرنا، انسان کو خدا کے حوالہ کرنا، اور خدا کی چوکھٹ پر انسان کو لانا، اس زمانہ کی اصنام پرستی کے مادی خداؤں کی جگہ خدائے واحد کے پاکیزہ اور عقلی تصور کو ازسرِ نوبحال کرنا، یہ تھا وہ عظیم مقصد۔۔۔ کسی انسان نے کبھی بھی ایسے عظیم الشان کام کا جو کسی صورت سے انسانی طاقتوں کے بس کا نہ تھا، اتنے کمزور ذرائع کے ساتھ بیڑا نہیں اٹھایا۔

خدا کی توحید کا ایسے دور میں اعلان کرنا، جب کہ دُنیا لاتعداد ضمنی خداؤں کی پرستش کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی، بذاتِ خود ایک قوی معجزہ تھا، محمدؐ کی زبان سے جیسے ہی اس عقیدہ کا اعلان ہوا، بتوں کے تمام قدیم معبدوں میں خاک اُڑنے لگی، اور ایک تہائی دنیا ایمانی حرارت سے لبریز

ہوگئی"۔(۶)

جان ولیم ڈریپر JOHN WILLIAM DRAPER یورپ کی ذہنی و علمی تاریخ کے ضمن میں لکھتا ہے :۔

"۵۶۹ء میں جسٹی نین JUSTINIAN کی موت کے چار سال بعد سر زمین عرب کے شہر مکہ میں وہ شخص پیدا ہوا جس نے نسلِ انسانی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا"۔(۷)

وہ مزید لکھتا ہے :۔

"محمد ﷺ میں وہ صفات جمع ہو گئی تھیں، جنہوں نے ایک سے زائد بار سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔ انہوں نے مابعد الطبیعات کے بیکار مباحث میں پڑنے کے بجائے لافانی صداقتوں پر زور دیا، اور اپنے آپ کو صفائی ستھرائی، سنجیدگی، روزے اور نماز کے ذریعہ لوگوں کی سماجی ترقی کے لئے وقف کر دیا"۔(۸)

اس صدی کا عظیم مفکر و مؤرخ ٹائن بی TOYNBEE لکھتا ہے :۔

"مسلمانوں میں نسلی امتیاز کا مکمل خاتمہ اسلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے، موجودہ دنیا کی جو حالت ہے اس میں اسلام کی اس خصوصیت کی تبلیغ واشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے"۔(۹)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دو سو سال قبل تھامس کارلائل (THOMAS CARLYL) نے تمام پیغمبروں میں محمد ﷺ کو اپنا ہیرو منتخب کیا تھا، اور اب

بیسویں صدی کے اخیر میں امریکہ کے مائکل ایچ ہارٹ .MICHAEL H) (HART نے ان لوگوں کی فہرست میں جو تاریخ عالم میں انسانیت پر سب سے زیادہ اثرانداز ہوئے ہیں، آپ کا ہی نام سر فہرست رکھا ہے۔ (۱۰)

محمد رسول اللہ ﷺ کے متبعین اور آپؐ کی پیدا اور تربیت کی ہوئی امت کے پوری نسل انسانی پر جو ناقابلِ فراموش احسانات ہیں، اور اس تہذیب و تمدن کے بقاوارتقاء کے عمل میں اس کا جو عظیم الشان کردار رہا ہے اس کو مختصراً اہم دو ناقابلِ انکار تاریخی واقعات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اچانک دنیا کے متمدن ممالک، تہذیب و تمدن، علم و ثقافت، اخلاق وانسانیت اور وسیع ترین اور عمیق ترین اثرات رکھنے والے دو مذہبوں اسلام اور عیسائیت، ان کے پیروؤں، اور ان کی قائم کی ہوئی وسیع، ترقی یافتہ اور زرخیز سلطنتوں اور خود انسانیت کے مستقبل کو ایک ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جو ماضی کی سب کوششوں پر پانی پھیر دینے والی، حال کے حسن و جمال اور فضل و کمال پر خط نسخ پھیر دینے والی اور مستقبل کے تمام روشن امکانات کو مشکوک و مدہم بنادینے والی تھی، یہ نیم وحشی تاتاریوں اور منگولوں (۱۱) کا اپنے غیر معمولی اور عبقری GENIUS قائد چنگیز خاں (تموچن) کی قیادت میں متمدن مغربی و شمالی دنیا پر اچانک حملہ تھا، جو ۶۱۶ھ ۱۲۱۹ء سے شروع ہوا، اس حملہ کی ہولناکی، ہوش رُبائی، اور اس کے دنیا کے پورے تہذیبی و تمدنی، دینی و علمی، عقلی و فکری، تعمیری و صنعتی ورثہ کو برباد کردینے کی صلاحیت اور اس کے آثار وامکانات کے ظاہر ہوجانے کا اندازہ ان چند اقتباسات سے ہوگا جو ہم چنگیز خاں کے مستند مؤرخ ہیر

لڈلیمب HAROLD LAMB کی کتاب GENGHIS KHAN. سے پیش کرتے ہیں :۔

"اس کے راستہ میں جو شہر آتے اکثر حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے، دریاؤں کے رُخ بدل جاتے، صحراء کے صحراء سراسیمہ اور لبِ مرگ پناہ گزینوں سے بھر جاتے، اور اس کے گزر جانے کے بعد ان علاقوں میں جو کبھی آباد تھے، بھیڑیوں اور کرگسوں کے سوا کوئی زندہ مخلوق باقی نہ بچتی"۔(۱۲)

"عیسائی دنیا بھی چنگیز خاں کی موت(۱۳) کے بعد منگولوں کی اگلی پُشت کے مقابلہ میں اتنی ہی سراسیمہ وحیران تھی، جب کہ خونخوار مغل شہسوار مغربی یورپ کو روندتے پھرتے تھے، پولینڈ کا شاہ بولسلاس اور ہنگری کا بادشاہ بیلا ہزیمت کھا کے جنگ کے میدانوں سے بھاگے تھے اور سائی لیسا کا ڈیوک ہنری اپنے تیوتانی شہسواروں کے ساتھ لڑتا ہوا لیگ نز(۱۴) LIEGNITZ میں مارا گیا تھا(۱۵)"۔

"یہ ایک ایسی جنگ تھی جو ہر حد سے متجاوز تھی، اس حد تک جیسی دوسری عالم گیر جنگ، یہ بغیر منافرت کے بنی نوع انسان کا قتل عام تھا جس کا مقصد محض انسانوں کو فنا کرنا تھا"۔(۱۶)

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ منگولوں کو روک

سکیں، دشت وصحراء کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے، پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، وبائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا، کسی قسم کے خطروں کا انہیں خوف نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی"۔ (۱۷)

"اس کی فتوحات کا زیادہ تر اس کے دشمن مؤرخوں نے ذکر کیا ہے، تہذیب وتمدن پر اس کا حملہ اس قدر ہولناک اور تباہ کن تھا کہ نصف کرۂ ارض میں پھر نئے سرے سے ابتداء کرنی پڑی، پریسٹر جان کی حکومت اور ختا، قراختائی، خوارزم اور اس کے مرنے کے بعد، بغداد، روس اور پولینڈ کی سلطنتیں نیست ونابود ہو گئیں، جب یہ ناقابلِ شکست وحشی کسی قوم کو فتح کرتا تو اور سب لڑائیاں خود بخود ختم ہو جاتیں، حالات کی پوری رفتار چاہے وہ پہلے اچھی ہوتی یا بری، بالکل بدل جاتی اور مغلوں کی فتح کے بعد جو لوگ باقی بچتے ان کے درمیان عرصہ تک امن قائم رہتا"۔ (۱۸)

کیمبرج کی "**تاریخ عہد وسطی**" کے مصنفوں نے منگولوں کے اس لرزہ خیز حملہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"تاریخِ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا اور اس کے پوتے قوبیلائی خاں پر ختم

ہو گیا، جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور بسیط سلطنت نے
تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع کر دیئے، ایسی
طاقت پھر کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی"۔(۱۹)

یہ حملہ اور اس کی دہشت ترکستان وایران وعراق تک محدود نہ تھی یورپ کے دور دراز ملکوں تک پھیل چکی تھی، جہاں ان نیم وحشی تاتاریوں کا پہنچنا ایک بعید از قیاس بات تھی، گبن GIBBON اپنی مشہور کتاب **"تاریخ انحطاط وسقوط روما"** (THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھتا ہے :۔

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری
طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہو گئی کہ وہ ان کے
خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے
کے لئے نہیں نکلے"۔(۲۰)

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کو ایک تودۂ خاک بنادیا، شہر کی آبادی میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمر قند کو خاک سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، یہی حشر عالمِ اسلام کے نامی گرامی شہروں کا ہوا، اس کا پورا امکان تھا اور یورپ کی اخلاقی حالت، سیاسی انتشار وابتری، اور معاشرہ کی وہ خرابی (جس کا ہم نے حقیقت پسند اور حقیقت نگار مغربی مصنفین کے حوالہ سے اوپر ذکر کیا ہے) اس کی دعوت دیتے تھے، اور اس کے لئے فضا ہموار کرتے تھے کہ عالمِ اسلام کی آخری متحدہ طاقت خوارزم شاہی سلطنت کو نیست و نابود کرنے اور عالمِ اسلام کے مرکزی آباد اور گلزار شہروں کو کھنڈر بنانے کے بعد تاتاری مسیحی

مغرب کا رخ کریں اور اس کا بھی وہی حشر ہو جو اسلامی مشرق کا ہوا۔
ایچ جی ولز (.H.G.WELLS) کا قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ،
"اگر کوئی سیاسی پیشین گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیرِ اقتدار آجائے گا۔" (۲۱)

ہیرالڈلیمب (HAROLD LAMB) لکھتا ہے :۔

(چنگیز خاں) کی جہاں آشوبی و غارتگری نے تمدن کو ایسا سخت صدمہ پہنچایا کہ نصف دنیا میں تہذیب و شائستگی کو مر کر از سر نو جنم لینا پڑا...... خوارزم کی سلطنت ،بغداد کی خلافت، روس کی مملکت اور کچھ دنوں کے لئے پولینڈ (پولار) کی حکومتیں مٹ گئیں"۔ (۲۲)

وہ مزید لکھتا ہے :۔

"جس وقت مغلوں نے دھاوا کیا تو جرمن فوجیں اور پولینڈ کی فوجیں مغلوں کے حملہ کی تاب نہ لا سکیں اور مغلوں نے ان کو تقریباً نیست و نابود کر دیا"۔ (۲۳)

لیکن دفعتاً معجزہ کی طرح ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے تاریخ کا رُخ ہی بدل دیا، اور متمدن دنیا کو اطمینان کا سانس لینے ہی کا نہیں بلکہ تمدن و تہذیب، قوت و استحکام اور ترقی و خوشحالی اور علم و فکر کی خدمت کا نیا سفر شروع کرنے کا موقع دیا، وہ یہ کہ یہ ناقابلِ تسخیر فاتح قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادّی و سیاسی طاقت کھو چکا تھا۔ اور جس کے

پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت، و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی ڈبلو آرنالڈ (T.W. ARNOLD) اپنی مشہور کتاب **"دعوتِ اسلام"** PREACHING OF ISLAM میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"لیکن اسلام اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے
پھر اٹھا، اور واعظینِ اسلام نے انہیں وحشی مغلوں کو جنہوں نے
مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا"۔ (۲۴)

جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کے نام دنیا کو معلوم ہیں مگر ان کا یہ کارنامہ تاریخ عالم کے کسی تعمیری، اصلاحی، یا انقلابی کارنامہ سے کم نہیں، ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر، نہ صرف مسیحی مغرب بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انہوں نے دنیا کو وحشت و بربریت اور ایک بے یقینی اور سراسیمگی کی عالم گیر کیفیت سے نکال کر، نظم و انضباط، علم دوستی و علم پروری، جوہر شناسی اور فضل و کمال کی قدر دانی کی فضا میں منتقل کر دیا، اور علم و فکر، تصنیف و تالف، تدریس و تعلیم، فن و ادب نے ایک معتدل فضا اور فضل و کمال اور محنت و جگر کاوی کی قدر کرنے والوں کے سایہ میں نئے سرے سے اپنا سفر شروع کیا۔

چنگیز خاں کی سلطنت اس کے انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت تیزی کے ساتھ شروع ہو گئی، اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ واثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر تقریباً ساری تاتاری

قوم مسلمان ہو گئی (۲۵)۔

اسلام کی اس اشاعت کا فرض انجام دینے والوں اور بزرگوں اور کارپرداز ان حکومت کے واقعات کا جن کی اخلاقی بلندی، دل آویزی، ذاتی کردار اور خلوص وروحانیت کے اثر سے یہ خون آشام اور جنگجو تاتاری اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوئے، آج بھی دلوں کو تڑپاتے اور روحوں کو گرمادیتے ہیں۔ (۲۶)

تاتاری من حیث القوم نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے، ان میں متعدد مصنف اور دانشور اور ادیب وشاعر بھی ہوئے۔

تاتاریوں کا قبولِ اسلام جس سے ان کا مزاج، ذوق ورُجحان اور انسانیت وتمدن کے بارے میں نقطۂ نظر بدلا، صرف اسلامی مشرق پر ہی احسان نہیں ہے، بلکہ مسیحی مغرب اور ہندوستان کے تحتِ براعظم SUB-CONTINENT پر بھی احسان عظیم ہے، جس پر اسی ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں انہوں نے بیس تیس بار حملے کیے، مگر ترکی النسل مسلمان سلاطین نے جن میں سلطان علاء الدین خلجی (م ۷۱۶ھ۔ ۱۳۱۶ء) اور اس کا فوجی قائد، الملک الغازی غیاث الدین تغلق شاہ (م ۷۲۵ھ۔ ۱۳۲۴ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ہر بار ان کو پسپا کر دیا، اور اس طرح یہ قدیم زرخیز ملک اور اس کا تہذیبی وعلمی ورثہ اور خود وہاں کے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندو مذہب (اپنی ساری شاخوں کے ساتھ) تاتاریوں کی غارت گری سے محفوظ رہے۔

عالمِ انسانیت اور بالخصوص مغرب پر (جس کو مستقبل قریب میں اہم اور انقلاب انگیز علمی اکتشافات، ایجادات واختراعات اور زندگی اور باہمی واقفیت کو سہل

بنانے والے وسائل و آلات کا دریافت کرنے والا، اور دنیا کے دسترس میں دینے والا ملک بنا تھا) اُمت مسلمہ کا یہ کارنامہ (تاتاری قوم کی نفسیاتی تبدیلی) ایک حفاظتی اور انتظامی نوعیت کا کارنامہ اور احسان تھا۔

اس کے بالمقابل اس کا ایک دوسرا کارنامہ یورپ کو علم و فکر کے نئے سرچشموں سے نہ صرف متعارف کرنا، بلکہ ان سے مستفید کرنا تھا، جس نے یورپ کی قرون مظلمہ DARK AGE میں اس کو نئی روشنی دکھائی اور اس نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کے لئے راہ ہموار کی، جس نے نہ صرف یورپ کی دنیا بدل دی بلکہ پوری دنیا کو نئے حقائق و معلومات سے آشنا کیا، اور تجربی علم SCIENCE کا وہ دور شروع ہوا جس نے اس دنیا کی کایا پلٹ دی، یہ اندلس (MUSLIM SPAIN) جس کے راستہ سے یورپ میں قدیم علمی ترکہ (فلسفہ وحکمت، ریاضی وطب) منتقل ہوا، اس نے مغرب کو جو سب سے بڑا علمی تحفہ دیا وہ حقیقت پسندی اور منطق استقرائی (INDUCTIVE LOGIC) کا تحفہ تھا، اور جس نے قیاس واستخراج (DEDUCTIVE LOGIC) کی جگہ لی، جس نے مغرب کے طریق فکر ہی کو بدل دیا، اور اس کے نتیجہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کو نہ صرف ترقی کرنے کا موقع ملا بلکہ حقیقت میں ان کا وجود عمل میں آیا، مغرب کی ساری مفید تحقیقات، سائنس کے تجربات اور تسخیر کائنات کی جزئی و محدود کامیابیاں اور زندگی کے سفر کی مشکلات کا کسی حد تک ازالہ اسی "**منطق استقرائی**" کا نتیجہ ہے، جس سے یورپ نا آشنا تھا، اور جو اس کو آزاد خیال اور جرأت مند محققین کے مطابق مسلمان اسپین کے ذریعہ حاصل ہوا، مشہور فرانسیسی فاضل اور مؤرخ GUSTAVE LEBON لکھتا ہے :۔

"لوگ تجربہ اور معائنہ (منطق استقرائی) کو جدید
علمی تحقیقات میں بنیاد کا درجہ دیتے ہیں FRANCIS
BACON کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا اعتراف کیا جائے کہ یہ پورا طریقہ
اور نظام فکر عربوں کی دین ہے"۔(۲۷)

رابرٹ بری فالٹ (ROBERT BRIFFAULT) اپنی کتاب "تعمیر انسانیت" (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے :۔

"یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں
ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو اور اس کی ایسی نمایاں
یادگاریں نہ ہوں، جنھوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے"۔(۲۸)

دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"صرف طبعی علوم ہی (جن میں اندلسی عربوں کا
احسان مسلم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار
نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم
الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتداء اسی
وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب وتمدن کی پہلی
کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوتی ہیں"۔(۲۹)

یورپ کی دینی تاریخ اور عیسائی کلیسا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے پاپائی نظام کے مصلحین اور اس کے بانیوں پر اسلام کے ذہنی وفکری اثرات کا کچھ اندازہ

کر سکتے ہیں۔

سولھویں صدی مسیحی میں برپا ہونے والی لوتھر (LUTHER) کی تحریک اصلاح میں بھی اسلامی تعلیمات کا انعکاس ملتا ہے جیسے کسی شیشہ میں دور کی روشنی کی شعائیں نظر آتی ہیں، اسی طرح قرون متوسطہ کی قدامت پرستی اور کلیسائی جبر کے خلاف تحریکوں سے یہ روشنی چھن چھن کر نظر آتی ہے۔(۳۰)

حضرات! ان دونوں انقلاب انگیز احسانات کا اخلاقی اور انسانی تقاضہ ہے، کہ ان کے حقیقی سرچشمہ کی عظمت اور احسان کا اعتراف کیا جائے، اور اس کے بارے میں کسی تقریب وعنوان سے جب کبھی اظہارِ خیال کیا جائے یا اس کا علمی وتاریخی جائزہ لیا جائے، تو اس میں ہم ان اخلاقی قدروں کی پابندی کریں جو ہزاروں برس سے دنیا کی مختلف قوموں، تہذیبوں اور فلسفوں میں قابلِ احترام چلی آرہی ہیں، اور اس میں ہم کبھی ثقاہت ومتانت، توازن واعتدال اور انصاف وحق پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں، اس کی تعلیم تمام مذہبی صحیفوں، اخلاقی تعلیمات اور بلند مرتبہ مؤرخین وناقدین کے کردار وعمل نے دی ہے اور اس پر مذاہب واقوام ہی نہیں بلکہ علم ودانش کے تبادلہ اور باہم استفادہ کا عمل قائم ہے، اور جس کے بغیر علمی وادبی کاوشیں اور تنقید وتبصرہ کا باوقار کام ایک سنجیدہ اور تعمیری عمل کے بجائے فحش ناول نویسی، ہزلیات اور دشنام طرازی میں تبدیل ہو جائے گا، اور اس سے وہ منفی، انتشار انگیز اور نفرت خیز نتائج رونما ہوں گے جن سے علم وادب ہزار بار پناہ مانگتے ہیں، اور ان سے قوموں، ملکوں کے باہمی تعلقات پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

یہ ایک سطحی اور عامیانہ خیال ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا فرد کی آزادی کو سلب کر لینے اور جبر واستبداد (COERCION)

کے عمل کے مرادف ہے، اور وہ کسی آزاد ملک کے آئین ودستور کو معطل کردینے، یاناقابل عمل بنادینے کے ہم معنی ہے، اظہار خیال کی ایسی آزادی جو تمام اخلاقی حدود کو پار کرجائے، انسانیت کے جلیل القدر محسنین ومعماروں اور پیشوایانِ مذاہب کے بارے میں وہ مبتذل اور سوقیانہ (OBSCENE) زبان واسلوب اختیار کرنے پر آمادہ کرے، جو ہزلیات وطنزیات اور ناول نگاری کے لئے کسی حدتک جائز قرار دیا جاسکتاہے، جس سے تاریخی حقائق ومسلمات کا خون ہو، اور ان قابل صداحترام مذہبی پیشواؤں اور پیغمبروں کے کروڑوں ماننے والوں کے دل زخمی ہوں، اور ملکوں اور معاشروں کے مختلف عناصر اور اجزائے ترکیبی کے تعلقات پر اثر پڑے، ایک ایسا مجرمانہ فعل ہے، جس کی کسی مہذب، امن پسند اور بقائے باہم "CO-EXIS-TENCE) کے اصول پر عمل کرنے والے ملک میں اجازت نہیں دی جاسکتی، خود متعدد مغربی مفکرین اور بلند مرتبہ دانشوروں نے اظہارِ خیال کی آزادی کو غیر محدود اور غیر مقید ماننے سے انکار کیاہے، اور ایسی غیر محدود آزادی اظہارِ خیال کے ان سنگین نتائج کی طرف اشارہ کیاہے، جو اظہار خیال کی آزادی کو سلب کرلینے سے بھی زیادہ مضر اور خطرناک ہیں، یہاں پر صرف دو بیانات پر اکتفا کیا جاتاہے کہ ایسے اقتباسات اور شہادتیں ایک مقالہ سے زیادہ ایک مستقل کتاب کی طالب ہیں :۔

"سنسر شپ یا شخصی اخلاقیات کے متعلق قوانین کو شخصی آزادی پر ناقابلِ برداشت پابندی سمجھ کر احتجاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلے سے یہ تصور کرلیتے ہیں کہ جن آزادیوں پر یہ قوانین پابندی عائد کرتے ہیں، وہ ایک بہتر (یا کسی بھی) معاشرہ میں انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے

ہیں، اس کے بر عکس ان قوانین کے دفاع کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضرورتیں لازمی نہیں ہیں، یا یہ کہ ان ضرورتوں کا حصول ان اقدار کو قربان کئے بغیر ممکن نہیں ہے جو شخصی آزادی سے اعلیٰ تر اور انسان کی عمیق ترین ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ یہ وہ اعلیٰ اقدار ہیں جو محض داخلی نہیں بلکہ معروضی حیثیت رکھتی ہیں۔

کسی شخص یا کچھ لوگوں کی آزادی کی حد کیا ہونا چاہئے اس موازنہ پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اور دوسرے اقدار مثلاً برابری، انصاف، مسرت، تحفظ یا امن عامہ کے تقاضے کیا ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ غیر محدود نہیں ہو سکتی"۔(۳۱)

سینٹیر بلیک اسٹونBLACKSTONE کی وہ تقریر جو امریکہ میں آزادی اظہارِ خیال کے قانون کے بنیاد تصور کی جاتی ہے، اس میں اس نے کہا تھا کہ :۔

"ہر آزاد شخص کو بلا شبہ یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ عوام کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر سکے، اس پر پابندی لگانا پریس کی آزادی کو ختم کرنا ہے، لیکن اگر وہ ایسی بات چھاپتا ہے جو نامناسب، شر انگیز یا غیر قانونی ہو تو اسے اپنی اس جسارت کی ذمہ داری قبول کرنی ہو گی، پریس کو محتسب کی قدغن کے ماتحت کرنا آزادیِ ضمیر کو ایک ایسے شخص کے ذاتی رُجحان پر چھوڑنا ہو گا جسے علم، مذہب اور حکومت کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کن اور غلطی سے مبرا مان لیا گیا ہو، لیکن خطرناک اور مجرمانہ تحریریں جنہیں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ مقدمہ کے بعد

نقصان وہ سمجھا جائے اس پر سزا دینا امن وامان ، حکومت اور مذہب کی بقا کے لئے ضروری ہے، کیونکہ انہیں پر شہری آزادی کی بنیادیں قائم ہیں، اس طرح افراد کا ضمیر تو آزاد ہے لیکن اس کے غلط استعمال پر سزا دینا تعزیراتی قانون کا مقصد ہے"۔(۳۲)

حضرات! ہم اس مضمون کو علامہ اقبالؔ کی ایک نظم پر ختم کرتے ہیں، جس سے نہ صرف کانوں کا بلکہ دلوں اور روحوں کا ذائقہ بھی تبدیل ہوگا بلکہ ان احسانات اور فتوحات کا استحضار بھی ہو جائے گا، جو بعثتِ محمدی اور ذاتِ رسالت پناہ سے وجود میں آئیں اور جن کی مثال مذاہب واصلاحات کی تاریخ اور ناموران عالم کی زندگی میں نہیں ملتی۔

اقبالؔ کہتے ہیں

ازدمِ سیراب آں اُمی لقب — لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست — یعنی امروزِ امم ازدوشِ اوست
اودلے در پیکر آدم نہاد — اونقاب ازطلعت آدم کشاد
ہر خدا وند کہن را اوشکست — ہر کہن شاخ ازنم اوغنچہ بست
گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین — حیدرؓ وصدیقؓ وفاروقؓ و حسینؓ
سطوت بانگ صلوٰۃ اندر نبرد — قراءت الصافات اندر نبرد
تیغ ایوبی نگاہ بایزید — گنجہائے ہردور عالم راکلید
عقل ودل رامستی ازیک جام مے — اختلاط ذکر وفکر روم ورے
علم وحکمت ، شرع ودیں نظم امور — اندرون سینہ دل ہانا صبور
حسن عالم سوزالحمر اور تاج — آنکہ از قدوسیاں گیر دخراج
ایں ہمہ یک لحظہ ازاوقات اوست — یک تجلی ازتجلیات اوست
ظاہر ش ایں جلوہ ہائے دل فروز — باطنش ازعار فان پنہاں ہنوز

اس اُمی لقب نبیؐ کی خوش انفاسی کے فیض سے صحرائے عرب کے ریگزاروں میں گل ولالہ کی بہار آگئی۔

آزادی کا جذبہ آپ ہی کی آغوش مبارک کا پروردہ ہے، اور اس طرح گویا اقوامِ عالم کی موجودہ ترقیاں آپؐ کے عظیم الشان ماضی کا ثمر اور نتیجہ ہیں۔

انسان کے پیکر خاکی میں آپؐ نے دھڑکتا ہوا دل رکھ دیا اور صحیح معنوں میں انسان کی صلاحیتوں سے پردہ اٹھایا اور اس کے جوہر ذاتی کو آشکار کیا۔

آپ ﷺ نے تمام ہی خدایانِ کہن کو شکست فاش دی اور آپ ﷺ کے فیض سے مرجھائی ہوئی شاخوں پر برگ وبار آنے لگے۔

بدر وحُنین کی گرمیٔ ہنگامہ آپ ہی کے جوش وخروش کے دم سے تھی، اور حضرت صدیقؓ وفاروقؓ، حیدر کرارؓ اور شہید عالی مقام حضرت حسینؓ کی انقلابی شخصیتیں آپ ﷺ ہی کی ہمہ صفت ذات کی تجلیاں تھیں۔

حالتِ جنگ میں بلند ہونے والی اذان کی سطوت وہیبت اور تلاوت الصافات کی لذت وحلاوت آپ ﷺ ہی کی دی ہوئی ہے۔

صلاح الدین ایوبی کی شمشیر آبدار اور بایزید بسطامی کی نگاہِ حقیقت میں دو عالم کے خزانوں کی کلید ثابت ہوئیں۔

ساقیٔ کوثر کے ایک جام سے عقل ودل دونوں ہی مست وسرشار ہو گئے، اور آپ ﷺ کی تربیت گاہ میں رومی کا ذکر اور رازی کی فکر فلک پیما ہم آہنگ ہو گئی۔

علم وحکمت، دین وشریعت، انتظامِ سلطنت اور دنیا کے اندر پھیلی ہوئی روحانی طلب وتلاش اور سینوں میں دلوں کی بے قراری۔

الحمراء اور تاج محل کا وہ حسن عالم سوز و دل افروز جو فرشتوں سے بھی خراجِ عقیدت لے لیتا ہے۔

یہ سب کارنامے آپ ﷺ کے اوقات عزو گراں مایہ کے ایک مختصر لمحے، اور آپ ﷺ کی بیشمار تجلیات میں سے ایک تجلی اور جھلک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ ﷺ کے فیض ظاہری کے اثرات ان جلوہ ہائے دل افروز کی شکل میں تو ظاہر ہو گئے، لیکن آپ ﷺ کے وجود مبارک کا باطنی پہلو عارفان کامل کی نگاہ سے اب بھی پوشیدہ ہے۔

حواشی:۔

(۱) H.G. WELLS, A SHORT HISTORY OF THE WORLD, (LONDON. 1924), PP. 140.41

(۲) A SHORT HISTORY OF THE WORLD (LONDON. 1924), P. 144.

(۳) ROBERT BRIFFAULT, THE MAKING OF HUMANITY, (LONDON. 1919) P. 164

(۴) DENISON, J.H., EMOTION AS THE BASIS OF CIVILAZATION, (LONDON.1928), P. 265

(۵) ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS, EDIN-BURG.1913, VOL, 6, P. 391

(۶) لیمر ٹائن LAMARTINE ہسٹری ڈی لاٹرکی ج ۲ ص ۲۷۶۔۲۷۷ پیرس (۱۸۵۴ء) (HIS-TOIRE DE LA TURQUIE, PARIS.1854, VOL 2, PP. 276.277)

(۷) JOHN WILLIAM DRAPER. A HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF THE EUROPE, LONDON-1875,VOL, 1, P. 229

(۸) IBID, P. 330

(۹) THYNBEE, A. J. CIVILIZATION ON TRIAL, NEW YORK- 1948, P. 205

(۱۰) HART, MICHAEL. H, THE 100-A RANKING OF THE MOST IN-FLUENTIAL PERSON IN HISTORY, NEW YORK, 1978, P.26

(۱۱) مغربی مصنفین اور انگریز لکھنے والے تاتاریوں کو عام طور پر MONGOLS کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

(۱۲) HAROLD LAMB, GENGHIS KHAN, (LONDON-1928), P.11-12.

(۱۳) ۱۲۴۳ء (۱۴) لیگ نز LIEGNITZ جرمنی کی مشرقی سرحد کے قریب واقع ضلع وروکلا (WRO-CLAW) پولینڈ میں وروکلا شہر کے قریب بستی ہے، اس کا نیا نام لگینکا (LEGNICA) ہے

(۱۵) GENGHIS KHAN, OP. CIT, P. 12

(۱۶) GENGHIS KHAN, OP. CIT, P. 166

(۱۷) IBID, P. 210 (۱۸) IBID, P. 206

(۱۹) GENGHIS KHAN, OP. CIT, P. 210

(۲۰) EDWARD GIBBON, THE DECLINE AND FALL OF THE RAO-MAN EMPIRE, VOL. III, NEW YORK. N.D. P. 634.

(۲۱) A SHORT HISTORY OF THE WORL, OP. CIT, P. 144.

(۲۲) GENGHIS KHAN, OP. CIT, P. 206

(۲۳) IBID, p. 231

(۲۴) T.W. ARNOLD, THE PREACHING OF ISLAM, LONDON-1935 P.227

(۲۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون نگار کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول ص ۳۲۲۔۳۳۴ بعنوان "تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام"۔

(۲۶) ان کے بعض نمونے پروفیسر آرنلڈ کی کتاب PREACHING OF ISLAM اور صاحبِ مقالہ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۲۷) تمدن عرب از گستاولی بان ترجمہ از فرنچ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ص ۴۰۰، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء۔

(۲۸) ROBERT BRIFFAULT. THE MAKING OF HUMANITY. (LONDON-1919), P. 190

(۲۹) IBID, P. 202

(۳۰) ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مارٹن لوتھر پر مقالہ۔

(۳۱) ISAIH BERLIN IN MODERN POLITICAL THOUGHT. (ed) WILLIAM EBENSTEIN. NEW DELHI, 1974, PP. 87-88

(۳۲) ماخوذ از ایچ۔ایم۔سیروائی H.M. SEERVAI ہندوستان کا دستوری قانون CONSTITU-TIONAL LAW OF INDIA ممبئی ۱۹۸۳ء، جلد اول ص ۴۹۲

عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ

ایک تاریخی مطالعہ و جائزہ

ایک انتباہ

مذکورہ بالا عنوان پر ایک گراں قدر مقالہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ

ایک تاریخی مطالعہ وجائزہ

ایک انتباہ

عربوں کا انتخاب اور اسکی حکمت

اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اولین قیادت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اقوامِ عالم میں عربوں کو منتخب فرمایا اور جس طرح بنی اسرائیل کے لئے فرمایا گیا تھا "ولقداخترنٰھم علی علمٍ علی العالمین." (الدخان . ۲۳) اور بے شک ہم نے اپنے علم کی بناپر اقوامِ عالم میں سے ان کا انتخاب کیا اسی طرح نبی عربی محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے ارشاد ہوا "اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَہٗ." (الانعام. ۱۲۵) اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کے سپرد کرے اپنی پیغامبری۔

اس انتخاب کے وجوہ اور اسباب کیا تھے، اور وہ کیا صفات وخصوصیات تھیں جن کی بناپر عربوں کو یہ شرف بخشا گیا، یہ عرصہ سے محققین اور اہلِ نظر کا موضوع چلا آرہا ہے، (۱) اور حق یہ ہے کہ دورِ اوّل کے عربوں نے اسلام کے

مزاج کو سمجھنے، اس کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقہ پر اخذ کرنے، اس کے خلاف ہر چیز سے بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرنے، اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے بے مثال جوش اور بے نظیر قربانی، اسکی روح اور اس کی نفسیات کی حفاظت میں غیر معمولی احتیاط اور امانت داری اور عقلوں کو مطمئن کرنے اور قلوب کو مسخر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیوں سے اس انتخاب کے لئے اپنی اہلیت اور استحقاق کو پوری طرح ثابت کر دیا۔

عرب اور اسلام کا لافانی رشتہ اور اسکے انتظامات

اللہ تعالیٰ نے عربوں اور اسلام کے درمیان ایک غیر قانونی رشتہ قائم کر دیا اور ہر ایک کے مستقبل کو دوسرے سے وابستہ فرمادیا، اب عربوں کو اسلام کے سوا کسی اور چیز سے عزت و سرفرازی حاصل نہیں ہوسکتی، اور اسلام اپنی صحیح شکل وصورت، اور پورے اعتدال و توازن کے ساتھ اسی وقت تک ظاہر ہوا جب تک عرب اس دعوت کے حامل اور علَم بردار رہے۔

عربوں اور اسلام کے درمیان اس رشتہ کی اُستواری اور پائیداری کا رسول اللہ ﷺ کو بہت خیال اور اہتمام تھا، آپ نے جزیرۃ العرب کو اسی مقصد سے اس کا ابدی مرکز اور پایۂ تخت بنایا اور اس بات کی پوری فکر کی کہ وہاں امن وسکون کی فضا برقرار رہے اور وہ مضبوطی کے ساتھ اس راستہ پر قائم رہیں، اس لئے کہ دارالسلطنت اور مرکزِ قیادت کو ہمیشہ انتشار، بے یقینی اور کش مکش سے پاک رہنا چاہئے، اس کے لئے آپ ﷺ نے بہت سے دور رس احکام دیئے، اپنے اصحابِ کرام سے اس کے لئے عہد و پیمان لئے اور بہت سی حکیمانہ وصیتیں فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ

رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت یہ فرمائی تھی کہ "لایجتمع لجزیرۃ العرب دینان "جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں۔(مسند احمد و طبرانی)

تحریکِ قومیت کے قائد عیسائی فضلاء

عربوں میں قومیت کی تحریک کے اوّلین قائد و علم بردار بعض مسیحی فضلاء تھے، جن کا ترکوں سے عقیدہ و مذہب اور اُخوتِ اسلامی کا کوئی رشتہ نہ تھا، وہ اس مغربی ثقافت کے حامل تھے، جس کی بنیاد ہی قومی عظمت و قوم پرستی کے جذبہ پر ہے، اس وقت اس تحریک کے لیڈر ڈاکٹر فارس نمر، شیخ ابراہیم الیازجی اور استاذ نجیب العاذوری لبنانی عیسائی تھے۔

قومیت کے مغربی مفہوم کی عربوں میں مقبولیت

اس کے بعد قومیت کے اس مغربی مفہوم کا زمانہ آیا جو ایک مستقل فکر اور فلسفہ ہے، اور اس میں وہ ساری حمیت و حرارت اور شعائر و مقدسات پائے جاتے ہیں، جو مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

لبنانی مسلمان فاضل علی ناصر الدین اپنی مقبول عام کتاب **"قضیۃُ العرب"** میں لکھتے ہیں :۔

> "عربوں کا مسئلہ ایک مومن، آزاد فطرت، عاقل، شریف، صالح، صاف دل، خوددار اور بلند نظر عرب کے نزدیک ایمان کے مسئلہ سے کم نہیں، وطن پر ایمان وطن کے لئے ٹھیک اسی طرح جس طرح اللہ پر ایمان اللہ کے لئے ہو سکتا ہے، اور بس"۔

عربوں کے مسئلہ اور اس کے مقاصد و مضمرات کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"وہ (یعنی عربی قومیت) جہالت، افلاس، بیماری، ظلم وناانصافی اور ہر قسم کی بے عنوانی اور عصبیتِ عربیہ کے سوا ہر عصبیت کا مقابلہ کرے گی جو دین وسیاست کی تفریق کی قائل ہے، وہ اہلِ دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے گی، ایک عرب کے لئے اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ وہ جہاں بھی ہو دو چیزوں کے لئے پورا تعصب برتے، ایک اپنی قومیت کے لئے، ایک حق وصداقت کے لئے"۔

یہی مصنف "**العروبہ**" یعنی عربیت کی تشریح کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے:۔

"قومیتِ عربیہ پر راسخ ایمان رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک "عروبۃ" بجائے خود ایک دین ہے، اس لئے کہ وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے اس دنیا میں موجود ہے، اگرچہ وہ آسمانی مذاہب کے اخلاق ومعاملات اور فضائل کا خود بھی حامل وداعی ہے"۔

یہی بات عمر فاخوری نے عرصہ ہوا اپنی کتاب "**کیف ینہض العرب؟**" (عرب کیسے ترقی کر سکتے ہیں؟) میں کہی تھی:۔

"عرب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ عربیت اور عربی اصول ان کا مذہب نہ بن جائے گا، اور وہ اس کے لئے اتنے غیرت مند، حساس اور پُر جوش نہ ہوں گے جتنے مسلمان نبی کریمؐ کے قرآن مجید کے لئے، عیسائی اور کیتھولک

رحم دل مسیحؑ کی انجیل کے لئے، پروٹسٹنٹ لوتھر کی اصلاحی تعلیمات کے لئے، اور فرانس کے انقلابی روسو کے جمہوری اصولوں کے لئے ہیں، اور اس کے لئے ایسا تعصب نہ برتیں گے جس کا مظاہرہ سینٹ پیٹر کی دعوت پر صلیبیوں نے کیا تھا"۔

عرب قومیت کی تحریک، مشرقِ وسطیٰ کے عیسائیوں کی گہری سازش

درحقیقت عرب مسلمان مشرقِ وسطیٰ کی اس چھوٹی سی مگر زیرک، ہوشمند، غیر مسلم اقلیت کی سازش کا شکار ہوئے ہیں، جس کا مستقبل صرف عربی قومیت کی بقا و ترقی سے وابستہ ہے اور جو صرف اسی راستہ سے عالمِ عربی کی قیادت حاصل کر سکتی ہے، اور اس کو اس عالمِ اسلام سے منقطع کر سکتی ہے، جس کا اس اقلیت کے ساتھ دینی عقائد اور تاریخ کا کوئی رشتہ نہیں ہے، اس بات کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ میشیل عفلق (۲) جو عیسائی ہیں، بعث پارٹی کے سربراہ اور مشرقِ وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کی تحریک کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر مانے جاتے ہیں۔

غیر مسلم مُفکّرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے، اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا ہے، اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے (جو احساس برتری کے نشہ سے سرشار ہے) جو کشش پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگا، جو میشیل عفلق کی کتاب **"فی سبیل البعث"** (۳) سے اخذ کئے گئے ہیں، جس کو اس تحریک و دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہوگا:۔

"اسلام کو فتح یاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جد و جہد اور خود اپنے وجود اور دنیا کے باہمی تجربات اور امتحانات کے نتیجہ میں اور بہت سی آزمائشوں اور تکلیفوں، امید و ناامیدی، اور کامیابی و ناکامی کے بعد حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہو، اور وہ ایمان تجربہ سے ملا ہو، زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے، اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا، اور اس کے معنی تھے، عربیت کی تجدید و تکمیل۔

اس لئے وہ معنی جس کو اس اہم تاریخی دور میں اور ترقی و تغیر کے اس اہم تاریخی دور میں اسلام آشکارا کر رہا ہے، یہ ہے کہ ساری قوتیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں"۔

صدر صدام حسین کا تعلق شروع سے مشہور قوم پرست عرب تحریک "**البعثُ العربی**" سے رہا ہے، جس کے صدر شامی عیسائی پروفیسر میشیل عفلق مذکور تھے، جنہوں نے زندگی کے آخری دن عراق ہی میں گزارے اور حال میں ان کا انتقال ہوا، اس تحریک کا آغاز ۱۹۴۳ء سے ہوا، اور ۱۹۴۷ء میں وہ ارتقاء اور عروج کے مرحلہ پر پہونچی، اس تحریک کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ ہے کہ "عرب بذات خود ایک وحدت (اکائی) ہیں، ان کے درمیان جو دینی، اعتقادی، ثقافتی، اور سیاسی امتیازات ہیں، وہ سب مصنوعی اور عارضی ہیں، جو عرب احساسِ قومیت کی بیداری کے بعد خود بخود زائل ہو جائیں گے، اس تحریک و جماعت کا نعرہ

اور دستور العمل ہے کہ "العرب أمة واحدة ذات رسالة خالدة" (عرب ایک مستقل واحد اُمت ہیں، جو ایک دائمی پیغام رکھتے ہیں) یہ تحریک عربوں کو ما قبل اسلام دور (جاہلیت عربیہ) کی طرف لے جانا چاہتی ہے، جب نہ اُن کے پاس نیا دین آیا تھا، اور نہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ نیا پیغام اور شریعت ان کو ملی تھی، یہ تحریک دورِ جاہلیت کے سورماؤں اور ان مشہور شخصیتوں کو اپنا ہیرو سمجھتی ہے، جن کا عربی جاہلی شاعری اور تاریخ میں عظمت کے ساتھ نام آیا ہے، اور وہ ان پر فخر کرنے اور ان کے نام کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتی ہے، اس کے ارکان نے اسلام سے مستغنی ہو کر اپنی زندگی کے لئے ایک نیا اصول اور فلسفۂ حیات وضع کیا ہے، جو آزاد قومیتِ عربیہ اور سیاسی ومادّی اغراض سے میل کھاتا ہے، اس کے پورے دستور میں کہیں اسلام کا نام نہیں آیا، اہلِ نظر اور واقفینِ حال کے نزدیک یہ صلیبی مسیحی تحریک کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ اور عربوں کا رشتہ اسلام سے کاٹنے کی ایک گہری سازش ہے، جس کے اثرات شام کے جیسے شاندار اسلامی تاریخ رکھنے والے ملک میں حافظ الأسد کی موجودہ حکومت کے زیر سایہ (جس کا بعث پارٹی ہی سے تعلق ہے) دیکھے جاسکتے ہیں، جہاں بے تکلف مسجدیں گرائی گئیں، اہلِ دین اور اہلِ علم کو ملک چھوڑ کر باہر جانا پڑا اور اسلام پسند تحریکوں اور جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی، اور اسی کے آثار کویت میں بھی نمایاں ہونے لگے ہیں، اور اسی کا خطرہ ہر اس ملک میں ہے، جو خدانخواستہ اس کے زیر اقتدار ہو جائے۔

میشیل عفلق اپنی مشہور کتاب "**نضالُ البعث**" میں رقم طراز ہیں:۔

> "عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے اور اس کے
> فرزندان کے درمیان تمام اختلافات وامتیازات سطحی اور بے

اصل ہیں، جو عربی وجدان کی بیداری کے ساتھ خود بخود زائل ہو جائیں گے۔

عرب قوم ایک ابدی پیغام کی حامل ہے جو تاریخ کے مختلف مرحلوں میں بدلتی ہوئی اور پختگی حاصل کرتی ہوئی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اور انسانی اقدار کی تجدید، بنی نوع انسان کی ترقی کی ہمت افزائی، اور اقوامِ عالم میں تعاون و ہم آہنگی کی ہمت افزائی کرتا ہے"۔(۴)

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک عرب قوم ہیں، لیکن بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اُمت اسلام کی وجہ سے تخلیق کی گئی ہے، اس سے تو پسماندہ دینی رجعت پرستی کی منطق کو تقویت ملے گی، اور اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی دینی جماعت کی تشکیل کریں، حالانکہ ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے، بلکہ شاہراہِ حیات کی تبدیلی اور نئی تعمیر میں عرب سوشلسٹ پارٹی کا اصل طریقہ ہے"۔(۵)

عرب قومیت کی مخالفت کا اصل سبب اور محرک

یہ اندیشہ اور خلش جو بے بنیاد نہیں ہے، اور جس کی معقولیت کا ثبوت اوپر کے اقتباسات اور تحریری نمونوں سے ہوا، ان لوگوں کو قومیتِ عربیہ کی تحریک کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے، جو ان تغیرات اور اس کے دوررس نتائج اور اثرات پر نظر رکھتے ہیں، اور جو عربوں کو دعوتِ اسلامی کا راس المال اور بلادِ عربیہ کو اسلام کا اوّلین سرچشمہ اور آخری پناہ گاہ سمجھتے ہیں، اور قومیت کے اس مغربی مفہوم سے واقف

ہیں، جو حقیقت میں دین کا حریف ورقیب، اور الحاد و بے دینی کا پیش خیمہ ہے، وہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں، اور قدیم ایرانی شاعر کے الفاظ میں پکار اٹھتے ہیں۔ ؎

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی؟

ان سب قومی تحریکوں کے مقابلہ میں کسی عرب قوم پرستی کی تحریک زیادہ خطرناک اور زیادہ سنگین نتائج کی حامل اس لئے ہے کہ وہ ان کو قدیم جاہلیت کے احترام اور اپنے اجداد و اسلاف کی تعظیم و تکریم کی طرف لے جاسکتی ہے، یا کم سے کم اس کی نفرت اور حقارت کو کم کر سکتی ہے، جس کو قرآن نے کفر کے ایک معیاری دور کے طور پر پیش کیا ہے، اور جس کی قباحت اور اس کے ساتھ نفرت کو مختلف طریقوں سے اُبھارا ہے۔

قرآن مجید جب کسی عمل، طرزِ فکر اور اخلاقی خرابی کی شناعت و قباحت، اس کا عیب و عار اور ناپسندیدہ ہونا بیان کرنا چاہتا ہے تو اس کی نسبت زمانۂ جاہلیت (عہد ما قبل اسلام کی طرف کرتا ہے، یہاں پر اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

يظنّون با لله غير الحق ظن الجاهلية. (سورة آل عمران ١٥٤).

اللہ کے ساتھ خلاف واقع خیالات کر رہے تھے جو کہ محض حماقت کا خیال تھا۔

افحكم الجاهلية يبغون. (سورة المائدة. ٥٠). کیا یہ زمانۂ جاہلیت کے حکم کے خواہش مند ہیں ؟۔

ولاتبرجن تبرج الجاهلية الاولىٰ. (سورة الاحزاب. ٣٣) . اور جس طرح (پہلے) جاہلیت (کے دنوں) میں اظہار تجمل کرتی تھیں، اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔

اِذجعل الذین کفروا فی قُلوبهم الحمیة حمیة الجاهلیة (سورة الفتح. ۲۶) . جب کہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی۔

اس طرح ان صنادیدِ کفر سے بھی نفرت کم ہونے کا اندیشہ ہے جو براہ راست آنحضرت ﷺ کے مقابلہ میں اور دعوتِ اسلامی کی مخالفت میں میدان میں آئے اور اس کا نتیجہ زوالِ ایمان اور ایک طرح کے ارتداد کے سوا اور کچھ نہیں، چنانچہ ادھر کچھ عرصہ سے عرب قوم پرستوں میں یہ رُجحان پیدا ہوتا جارہا ہے کہ مسلمان مؤرخوں نے جاہلیت کو ضرورت سے زیادہ بدنام کیا ہے، اس کی طرف سے مُدافعت اور اس کی حمایت کا جذبہ کچھ کچھ پیدا ہو چلا ہے، بعض عرب ملکوں کی وزارتِ تعلیم وتربیت میں اور ان کے تصنیفی حلقوں میں یہ تحریک بھی چل رہی ہے کہ جاہلیت اور العصر الجاهلی کے بجائے عرب قدیم یاما قبل اسلام کی اصطلاح چلائی جائے، اگر عرب قوم پرستی کی تحریک اسی طرح اپنے ارتقاء کے منازل طے کرتی رہی اور کوئی ردّ عمل نہ ہوا تو وہ دن بھی کچھ دور نہیں کہ ابو جہل اور ابو لہب کی طرف سے مدافعت اور وکالت شروع ہو جائے، اور بعض قومی کارناموں اور اعلیٰ عربی صفات کی بناء پر ان کو قومی ہیرو یا عظمائے عرب میں شمار کیا جائے۔

صحیح حدیث میں ایمان کی علامت بتائی گئی تھی کہ کفر کی طرف واپس جانے سے اس طرح بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور اس طرح وحشت اور انقباض طاری ہو، جیسے آگ میں ڈالے جانے کے تصور سے۔(۶)

قوم پرستی کی ان تحریکوں سے اور قوم پرست غیر مسلم (مسیحی) رہنماؤں، ادیبوں اور مصنفین کے اثر سے کفر اور اہلِ کفر سے نفرت برابر کم ہوتی جارہی ہے،

اس کی جگہ ان غیر عرب مسلمان ملکوں اور اقوام کی نفرت جگہ لے رہی ہے جو اس قوم پرستی کی مخالف ہیں، یا کسی دوسرے بلاک میں ہیں، قبرص میں صدر ناصر کی مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں مسیحی یونانیوں سے ہمدردی اور ان کی فوجی امداد نیز بعض ان افریقی حکومتوں کی تائید نے جنھوں نے بڑی سفاکی کے ساتھ اپنی مسلم رعایا کو قتل کیا، اور ان کی نسل کشی کی، اسکو نمایاں طریقہ پر ثابت کردیا ہے۔

ان روشن وجوہ و دلائل کی بناء پر جو اب خطرے اور اندیشے نہیں رہے، بلکہ واقعات اور حقائق بن گئے، اہلِ علم اور اہلِ فکر کو قومیتِ عربیہ کی تائید یا اس کے کسی قائد کے بارے میں کلمۂ خیر کہنے سے احتیاط کرنی چاہئے، اور اگر ضرورت ہو تو اس کی تردید اور اس پر تنبیہ کر کے اپنا وہ منصبی فریضہ ادا کرنا چاہئے جو دین و شریعت کی رُو سے ان پر عائد ہوتا ہے۔

ماضی میں اسلام سے عربوں کا رشتہ توڑنے کی کوششیں اور ان کی ناکامی

ا۔ عربوں کے اسلام سے رشتہ توڑنے کی اور ان کی جاہلیتِ اولیٰ کی طرف واپس کرنے کی کوششیں اور سازشیں تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں، پورے جزیرۃ العرب کا (جو اپنی بہت سی کمزوریوں اور اعتقادی و اخلاقی خرابیوں کے ساتھ بڑی قوتِ ارادی، قوتِ عمل اور سپہ گری کے صفات کا حامل تھا) ایک ایسے دین کا قائل وحامل بن جانا جو توحید خالص کا داعی، انسانوں کی ادھاد ھند غلامی (خواہ وہ دنیوی حکام ہوں، دینی پیشوا ہوں، یا مذہب کے خاندانی اجارہ دار) قُرب وجوار کے تمام ملکوں اور حکومتوں کے لئے ایک بڑا چیلنج اور خطرہ کا نشان تھا۔

ایسی حالت میں کہ سرور کائنات ﷺ کو دنیا سے رحلت فرمائے ہوئے

زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، خود جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ میں ارتداد اور اسلام کے ایک رُکن عظیم زکوٰۃ کی فرضیت کا یا بیت المال کو حوالگی کا انکار، اسی کے ساتھ مُدّعیانِ نبوت (۷) کا ظہور، ایک ایسے دین کے لئے جس کو دنیا میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے، ایک ایسی آزمائش تھی، جس کی نظیر مذاہب وادیان کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، بہت سے مؤرخین نے اس فتنہ کی خطرناکی اس کی پُر آشوبی، اور اس کے اندر کام کرنے والی طاقتوں اور اس کے داخلی وخارجی روابط کا پورا جائزہ نہیں لیا، اب بعض معاصر مؤرخوں اور تحقیقی کام کرنے والوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس فتنہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کی دلچسپی اور ان کی رہنمائی وسرپرستی شامل تھی، انھوں نے دیکھا کہ وہ اتنے عرصہ تک جزیرۃ العرب پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکے، لیکن اسلام سارے جزیرۂ پر چھا گیا، اور وہاں کا دین وایمان بن گیا، جس سے آس پاس کی بازنطینی اور ساسانی سلطنت کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے، انھوں نے اس **"فتنۂ ارتداد"** کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی اور اسکی ہمت افزائی کی۔ (۸)

لیکن یہ انتظامِ خداوندی اور اس دین کو باقی رکھنے اور دنیا میں پھیلنے کے فیصلہ کا کرشمہ تھا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ نے اولین خلیفۂ رسول صدیق اکبر حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب فرمایا، جن کی مثال (جہاں تک ادیان ومذاہب کی تاریخ محفوظ ہے) کسی دین ومذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی، اور نہ کسی دوسرے پیغمبر کے (اللہ کا درود وسلام سب پر ہو) ایسے جانشین کا سُراغ ملتا ہے، انھوں نے اس کے مقابلہ میں جس عزیمت وقوت کا اظہار فرمایا اور جس ثبات واستقامت کا ثبوت دیا اس کی پوری نمائندگی انکا یہ فقرہ کرتا ہے جو ایک پوری کتاب کی قائم مقامی اور ان

کی نفسیات کی آئینہ داری کرتا ہے، انہوں نے فرمایا "اینقص الدین و انا حی" (کیا ایسا ممکن ہے کہ میں زندہ ہوں اور دین میں کتر بیونت کی جائے؟) انہوں نے اس فتنہ کا قلع قمع کر دیا، اور جزیرۃ العرب اور امت عربیہ اس اعتقادی، عملی، اور فکری وحدت کی طرف واپس آگئی، جو عہد رسالت میں تھی، اور یہ فتنہ اور اس کی تاریخ ایک فسانۂ پارینہ بن گئی، حضرت ابو ہریرہؓ نے اس حقیقت کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، ابو الاعرج حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:۔

"اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر حضرت ابو بکرؓ خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی"۔

اس بات کو انہوں نے دوبارہ سہ بارہ دُہرایا۔(۹)

۲۔ فتنۂ ارتداد کے بعد جزیرۃ العرب اور اس سے متصل اسلامی ملک اور مقاماتِ مقدسہ کے لئے کوئی خطرہ، کوئی منصوبہ اور سازش اور کوئی عملی اقدام، صلیبی حملہ اور فلسطین و بیت المقدس پر مغربی ملکوں اور طاقتوں کی یورش اور اقتدار سے بڑھ کر نظر نہیں آتا، جو پانچویں صدی ہجری کے آخر ۴۹۰ھ سے شروع ہو کر چھٹی صدی کے آخر (۵۸۳ھ۔۱۱۸۷ء) میں ختم ہوا، تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس یورش اور اقدام کا جس میں پورا یورپ اور مسیحی دنیا شریک تھی، نشانہ، صرف مسجد اقصیٰ پر قبضہ اور فلسطین پر اقتدار ہی نہیں تھا، اس کا نشانہ جزیرۃ العرب، حرمین شریفین بھی تھے، اور اس جنگ کے قائدین کی زبان سے مدینۂ طیبہ اور مدفنِ رسول ﷺ کے بارے میں ایسی نیتوں اور ارادوں کا اظہار ہوتا تھا، جن کو کوئی مسلمان قلم نقل بھی نہیں کر سکتا، پھر فلسطین اور شام اور آس پاس کے ملکوں کا

وہ حال تھا کہ وہ اس متحدہ مغربی اقدام اور صلیبی حملے کا مقابلہ کرنے کی لیاقت نہیں رکھتے تھے، مشہور انگریز مؤرخ اسٹینڈ لے لین پول لکھتا ہے :۔

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پُرانی لکڑی میں پچڑ ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اُڑا دیں گے"۔(۱۰)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مقابلہ کرنے اور نہ صرف شام و فلسطین بلکہ جزیرۃ العرب کو اس وحشیانہ حملہ کا مقابلہ کرنے اور ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنانے کے لئے الملک العادل نورالدین زنگی سلطانِ شام کو کھڑا کیا، اور انہوں نے تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس کی بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھا، اور اس خدمتِ عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانا، انہوں نے اپنے حملوں سے تمام مسیحی ریاستوں پر دھاک بٹھا دی، اور مصر کو صلیبیوں کے اقتدار سے نکال کر عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا۔

لیکن بیت المقدس کی بازیابی اور صلیبیوں کو مکمل شکست دینے کی سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، سلطان نورالدین نے ۵۶۹ھ ۱۱۷۴ء کو انتقال کیا، اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس عظیم و مقدس مُہم کا چارج لیا، سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱) کی ذات آنحضرت ﷺ کا مستقل مُعجزہ، اور اسلام کی صداقت وابدیت کی روشن دلیل ہے، اور وہ اس کا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس کا شکر گذار ہو، اور اسکے لئے دعا کرے، وہ گویا اسی کام کے لئے پیدا ہوا تھا، اس کو جہاد کا عشق تھا، وہ اس کے لئے سب سے بڑی لذّتِ عیش،

اور اس کے روح کی غذا تھی، اس کی دینی حمیت اپنے عروج کو پہونچی ہوئی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب حطین کی فیصلہ کن جنگ کے بعد (جو ۵۸۳ھ ـ ۱۱۸۷ء) کو ہوئی تھی، مفتوح سلاطینِ یورپ اور قائدین اس کے سامنے لائے گئے، اس نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور خاطر کی، لیکن ریجی نالڈ خیمے میں داخل ہوا تو سلطان نے اس سے کہا کہ "سُن میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی، ایک مرتبہ تو اس وقت جبکہ تو نے مکہ ومدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکہ اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا"۔(۱۲) یہ کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور کہا کہ "لو میں محمد ﷺ کا انتقام لیتا ہوں" اور اس کی گردن اڑادی، اس پر موجودہ بادشاہ اور قائدین لرز گئے، اس نے ان سے کہا بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، لیکن اس نے حد سے تجاوز کیا تھا، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا۔(۱۳)

قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ "سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں تھے"۔(۱۴)

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ وغضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما اور مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر فریڈرک، ریچرڈ شیر دل، شاہان انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریلیا، برگنڈی، فلانڈر کے ڈیوک اور نائٹ اپنی آہن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کررہے تھے، آخر پانچ برس کی مسلسل

خونریز اور خوں آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوح شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگین تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، (اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا) اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، وہ اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور نہ صرف شام و فلسطین اور جزیرۃ العرب بلکہ عالمِ اسلام کو صلیبیوں (CRUSADERS) کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲۷ / صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار اور فرزند دنیا سے رخصت ہوا، وہ ایک درویش سیرت سلطان، عابد و زاہد اور سر تاپا مجاہد تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے اتنا مال بھی نہیں چھوڑا تھا کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جا سکے، کفن کا انتظام اس کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا، (۱۵) زکوٰۃ اس پر کبھی فرض نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس نے اتنا کبھی پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو۔ (۱۶)

حقیقت میں جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ ہی نہیں کسی اسلامی ملک پر صلیبی، صہیونی اور کسی عسکری، فکری، لادینی حملے کا مقابلہ کرنے، مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ، مسجد اقصیٰ کو واپس لینے اور اسلامی اقتدار و اقدار کا عہدِ زرّیں کے بازگشت کے لئے ایسی ہی سیرت و کردار، ایسے ہی عزم و جرأت، اور ایسے ہی ایمانی طاقت کی ضرورت ہے، اور آج عالمِ عربی میں اسی کا فقدان ہے، اور عالمِ اسلامی کو اسی کی ضرورت ہے۔ **وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا.**

۳۔ جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ کے لئے تاریخ اسلام اور تاریخِ عرب میں تیسرے خطرہ کا موقعہ جب آیا، جب شریف مکہ شریف حسین نے خلافتِ عثمانیہ

اور سلطنتِ ترکی سے بغاوت کی اور وہ اتحادیوں کے ساتھ مل گئے، اور اس کا اندیشہ ہوا کہ اتحادیوں کا جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ پر کہیں تسلط اور نفوذ قائم نہ ہو جائے، اور وہ اعتقادی اور فکری طور پر اس پر اثر انداز نہ ہوں، لیکن اس اقدام کے خلاف عالمِ اسلام میں بالعموم اور برِ صغیر ہندوستان میں بالخصوص تحریکِ خلافت کے نام سے جو زبردست تحریک پیدا ہوئی اس نے ایک طرف اتحادیوں کو قدرے محتاط بنادیا، دوسری طرف اس نے ملتِ اسلامیہ میں بالخصوص مسلمانانِ ہند میں مغربی اقتدار ہی نہیں، مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ زندگی کے خلاف ایسا شدید ردّ عمل پیدا کیا، جس کی مثال دور دور اور دیر دیر تک نہیں ملتی، اس کو (جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، قیام الدین، مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ صاحب، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی شکل میں ایسے قائد و زعیم، خطیب اور اہلِ قلم اور مجاہد و سپاہی مل گئے، جنہوں نے مسلمانوں کی نئی نسل میں زندگی، بلند خیالی، اور مغربی اقتدار و تہذیب کے خلاف نفرت و بغاوت کی ایک روح پھونک دی، ادھر اتحادی بھی دو دو عظیم جنگوں اور اندرونی مسائل میں ایسے منہمک ہوئے کہ ان کو کسی فوجی اقدام، یا سیاسی اور انتظامی تسلط کی فرصت نہیں ملی، اور اس کو مناسب نہیں سمجھا، انہوں نے ان پر صرف مغرب کے ذہنی، تعلیمی اور تہذیبی اثرات ڈالنے اور ان ملکوں سے مالی و سیاسی استحصال پر قناعت کی۔

لیکن جو سب سے بڑا نامبارک واقعہ اور مغربی طاقتوں خاص طور پر برطانیہ کی طرف سے منحوس اقدام ہوا، اسرائیل کا قیام اور فلسطین کے بیشتر حصہ پر یہودی حکومت اور مسجدِ اقصیٰ پر ان کی تولیت اور قبضہ کا افسوس ناک واقعہ ہے، جو نہ صرف

عالمِ عربی بلکہ پورے عالمِ اسلامی کے لئے ایک شرمناک واقعہ اور مستقبل کے لئے خطروں اور اندیشوں کا سرچشمہ ہے، اس کی بڑی ذمہ داری عرب لیگ اور اس وقت کی آس پاس کی عرب حکومتوں پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے اس خطرہ اور مغربی طاقتوں کے عزائم اور اسرائیل اور یہودیتِ عالمیہ اور صیہونیت کے ارادوں، مقاصد اور پروگراموں کا مطالعہ نہیں کیا، (۱۷) اور اس منحوس واقعہ کی سنگینی اور اس کے آئندہ خطرات کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

لیکن اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اسرائیل کے وجود اور خطرہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پھر ایک مردِ مومن ایک شیر دل مجاہد اور ایک مخلص قائد کی ضرورت ہے، جو البطل الناصر لدين الله سلطان صلاح الدين ایوبی کا کردار ادا کرے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلے، یہ سیاسی بازیگروں اور قومیتِ عربیہ کے علمبرداروں کا کام نہیں، ایک عرب مؤرخ و فاضل اور شاعر خیر الدین زرکلی نے اُمتِ اسلامیہ اور فلسطین کو خطاب کر کے کئی برس جو پہلے کہا تھا وہ آج بھی صادق ہے ؎

هاتى صلاح الدين ثانية فينا

وجد دى حطين او شبه حطينا

(اے اُمتِ مسلمہ اور اے فلسطین! دوبارہ صلاح الدین کو میدان میں لا، اور حطین (۱۸) کی جنگ کو تازہ یا اس سے ملتے جلتے کسی دوسرے فیصلہ کن معرکہ کو۔)

۴۔ اب اس وقت کی صورتِ حال یہ ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ صلیبی عیسائیوں اور صہیونی یہودیوں نے گزشتہ تجربات کی روشنی میں اپنا طریقِ جنگ (STRATE-GY) بدل دیا، انہوں نے جزیرۃ العرب اور پڑوسی عرب ملکوں پر براہ راست اقدام

کرنے اور فوجی و عسکری طاقت سے اس کو فتح کرنے کے بجائے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ وہ قومیتِ عربیہ کے علمبرداروں بالخصوص "**البعث العربی**" سے وابستگی اور شیفتگی رکھنے والے قائدین سے یہ کام لیں اور ان کے لئے "**ہیرو**" بننے اور عربوں، مسلمانوں اور بالخصوص فلسطینیوں کی امیدوں کا مستقبل اور مرکزِ محبت و توجہ بننے کا سامان پیدا کریں، جس سے وہ اس کے اس مرکز میں داخل اور مؤثر بن کر عربوں کے ذہنی اور تہذیبی ارتداد جاہلیتِ اولیٰ کی طرف بازگشت اور دین پر عقیدہ و عمل میں ضعف و تزلزل پیدا کر سکیں اور ہو سکے تو پھر ان کو ما قبل اسلام اور جاہلیتِ عربیہ کی طرف واپس لا سکیں، (۱۹) جس کا یہ مغربی اور مسیحی و یہودی قائدین و مفکرین صدیوں سے خواب دیکھ رہے ہیں، یہ منصوبہ بڑا نازک، مخفی اور عمیق ہے، اسکو سمجھنے کے لئے عالمِ اسلام اور عالمِ عربی کو ذہانت اور دوربینی کی بھی ضرورت ہے، اور دینی و ایمانی فراست کی بھی، اور تاریخ کے عمیق و وسیع مطالعہ کے بھی، اللہ تعالیٰ اس نازک موقعہ پر ہمارے دینی و سیاسی قائدین، فکری رہنماؤں، ابلاغِ عامہ کے ذرائع و صحافت پر اثر رکھنے والے اہلِ قلم اور خاص طور پر پُر جوش نوجوانوں کو اس کی ہمت اور توفیق دے کہ وہ مسیحی مغرب کے مخالفِ اسلام دانشوروں اور اسرائیلی مفکرین کی سازش کو سمجھ لیں اور اس کا شکار نہ ہونے دیں، اور اس آیت کو اپنا رہنما بنائیں۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا. (سورۃ الاعراف ۵۸)

(جو زمین پاکیزہ (ہے) اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے، اور جو خراب ہے اس میں سے جو بھی نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے۔)

حواشی

(۱) مثال کے طور پر ملاحظہ ہو "سیرت النبی" جلد اول از علامہ شبلی نعمانی و "نبی رحمت" از راقم ص ۵۹، ۲۷ (طبع سوم)

(۲) پروفیسر میشیل عفلق بعث پارٹی کے بانی اور سربراہ تھے، وہ اصلاً شامی عیسائی تھے، مگر عمر کے آخری حصہ میں وہ عراق منتقل ہوگئے یا بلالئے گئے اور احترام و اعتماد کے ساتھ رہے، ان کی موت سے پہلے اسلام قبول کرنے کی روایت غالباً سیاسی مصلحت سے مشہور کی گئی، بقول ایک عرب فاضل کے کہ: "وہ انتقال کے بعد مسلمان ہوئے"۔

(۳) اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مصر کی قومیتِ عربیہ کے مفکر و زعماء بھی ان کے خوشہ چیں اور ان کے سامنے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۴) نضال البعث۔ میشیل عفلق۔ ص۔ ۱۷۳۔ ج ۱

(۵) فی سبیل البعث ص ۲۴۴ میشیل عفلق۔

(۶) ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الایمان باب ثلاث من کن فیه، وجد حلاوة الایمان.

(۷) مثلاً مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ، سجاح، لقیط بن مالک الازدی۔

(۸) ملاحظہ ہو جدید تحقیقی کتاب "أثر أهل الكتاب في الفتن والحروب الأهلية في القرن الاول الهجري" (پہلی صدی ہجری کے فتنوں اور اندرونی جنگوں میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا اثر و حصہ تصنیف ڈاکٹر جمیل عبداللہ المصری، مطبوعہ ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۴۔ ۱۸۰

(۹) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۶ ص ۳۰۴

(۱۰) ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ ص ۶۲۷ مضمون CRUSADES۔

(۱۱) سلطان صلاح الدین کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کرد ہے، جو مختلف زمانوں میں بلند مرتبہ مجاہد، داعی الی اللہ اور مشائخ و اولیاء پیدا کرتا رہا ہے، اس قبیلہ کے کئی لاکھ آدمیوں کو عراقی قائد صدام حسین نے کیمیاوی اسلحہ اور بموں کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔

(۱۲) سلطان صلاح الدین ایوبی، محمد فرید قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب ان بیکس حجاج نے اس سے انسانیت اور شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ "اپنے محمدؐ سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں" یہ فقرہ صلاح الدین کو پہونچا اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب میرے ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا"۔ ص ۱۲۷

(۱۳) سلطان صلاح الدین ص ۱۸۸

(۱۴) النوادر السلطانیہ ص ۲۱۳

(۱۵) النوادر السلطانیہ ۔ص ۲۵۱

(۱۶) ایضاً ص ۵۔۱۰

(۱۷) نمونہ کے طور پر مطالعہ ہو پروتوکول صہیونی عربی، اور یہودیتِ عالمیہ اردو۔

(۱۸) فلسطین کی وہ فیصلہ کن جنگ جس میں صلیبیوں نے مکمل شکست کھائی، اور سلطان صلاح الدین بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوا۔

(۱۹) اس کا خطرہ ہے کہ جیسے کویت میں ہوا، حجاز مقدس میں بھی صدام حسین کے اسٹیچو لگائے جائیں، اور اگر ابو جہل، ابو لہب کے نام سے نہیں تو عنترہ عبسی اور حاتم طائی کے نام پر مجلسیں اور اکیڈمیاں قائم ہوں، شراب کی ممانعت ہٹادی جائے جیسا عراق اور کویت میں ہوا، اور مقدس مقامات اور مساجد اور شعائرِ اسلام کے خلاف بھی وہ اقدامات کئے جائیں جن کا نمونہ عراق و کویت میں دیکھا جا چکا ہے۔

امت اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد

وہ اہم مقالہ جو قاہرہ، مصر میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے لئے لکھا گیا جو شئون اسلامیہ کی مجلس اعلیٰ اور وزارت اوقاف حکومت مصر نے اپریل ۱۹۹۱ء کی ۲۵، ۲۶، ۲۷ تاریخوں میں بلائی تھی۔ اور جس میں خلیج کی جنگ اور اس سے پیدا شدہ حالات ونتائج کا حقیقت پسندانہ اور منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور مسلم قیادتوں اور ذمہ داروں کو دیانت دارانہ اور جرأت مندانہ مشورہ دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امت اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد

چند سبق جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، چند خامیاں جن کو دور کرنا ضروری ہے

حضرات!

"خلیجی جنگ کے بعد امت اسلامیہ کا مستقبل" کے موضوع پر منعقد ہونے والا یہ اجتماع بر وقت بھی ہے اور بر محل بھی، بر وقت اس لئے کہ یہ بے سبب اور لاحاصل جنگ ابھی ختم ہوئی ہے، اس کے اسرار کھل رہے ہیں اور نتائج سامنے آرہے ہیں، نہ تو اس کا کوئی جائز اور معقول سبب تھا، نہ اس کے ممکنہ نتائج و عواقب کو سامنے رکھا گیا تھا، اس کو ایک مجنونانہ جست، حصول قیادت و عظمت کا جنون یا جنگی دماغی دورہ (HYSTERIA) ہی قرار دیا جاسکتا ہے، اور شخصی و انفرادی قیادتوں، سطوت و اقتدار کے جذبے، بڑھے ہوئے شوق اور نخوت و غرور کے مظاہروں کی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں، میں اس طرح کے قائدین کی فہرست پیش کر کے اور ان کے زمان و مکان کی تفصیلات بیان کر کے اس محترم و موقر مجلس پر چھائی ہوئی سنجیدگی اور شائستگی کو نہ مجروح کرنا چاہتا ہوں اور نہ معزز

حاضرین کی کبیدگی خاطر کا سبب بننا چاہتا ہوں، جن میں عالم عربی و اسلامی کے قابل احترام علماء، اصحاب فکر و نظر، سیاست و انتظامیہ کے ممتاز ترین افراد شامل ہیں، بڑے افسوس اور معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کی شاندار اور طویل تاریخ بھی اس طرح کے مہم جو افراد سے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اس طرح کے سیاسی قمار بازوں سے خالی نہیں رہی، حالانکہ اسلام کے پاکیزہ پیغام، اس کی حکیمانہ تعلیمات اس کے عظیم مقاصد اور بلند معیار کی روشنی میں بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اسلامی تاریخ اس طرح کی نامناسب مثالوں اور فاسد نمونوں سے خالی ہو، لیکن انسانی فطرت اپنا کام کرتی ہے، وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے، خاص طور سے ایسی صورت میں جہاں صحیح طاقتور اور مؤثر تربیت کا فقدان ہو، یا اجتماعی و دینی احتساب کا شعور و احساس نہ ہو، یا "رب العالمین" و "ارحم الراحمین" خالق کائنات پر ایمان رکھنے والا قلب و ضمیر موجود نہ ہو اور آخرت کا خوف نہ ہو، جہاں ہر انسان سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اور اس کا دائرۂ اثر و نفوذ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔

بہر حال اب جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں اور ہیجانی و ہنگامہ خیز مرحلہ ختم ہو چکا ہے، جس میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی، نہ دینی اعتبار سے، نہ اصولی حیثیت سے اور نہ عقل اور حقیقت پسندی کی رو سے، اور اب اگرچہ حالات اپنی راہ پر آگئے ہیں اور حق حقدار کو مل گیا ہے، لیکن دعوتِ اسلامی اور تحریک **"پیامِ انسانیت"** کے ایک کارکن کی حیثیت سے، وہ بھی ہندوستان جیسے حساس ملک اور نازک و پیچیدہ حالات میں جہاں اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں، اور انسانی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں، یہ کہتے ہوئے میرا دل رنج و غم

سے بھرا ہوا ہے اور کلیجہ پھٹا جارہا ہے کہ اس جنگ نے اسلام کی شہرت کو سخت نقصان پہنچایا ہے، اسلام ہی سب سے عظیم و نمایاں دین ہے جو انسانیت کے احترام اور جان ومال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی دعوت دیتا ہے، ایسے معبود پر ایمان رکھتا ہے، جو" رب العلمین "ہے، اور ایسے نبی کا پیرو اور امتی ہے جو "رحمۃ للعالمین "ہیں، ایسے دین کی شہرت و عظمت کو اس جنگ نے اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ تاریخ میں ایک مدت سے اس کی مثال نہیں ملتی، تاریخ کے ایک طالب علم اور مصنف کی حیثیت سے اور ہندوستان میں **"تحریکِ پیامِ انسانیت"** کے ایک داعی کی حیثیت سے یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں، پیام انسانیت کی تحریک کو اللہ کا شکر ہے، ہندوستان میں توقع زیادہ کامیابی ملی ہے، وہ غیر مسلم اکثریت کے تعلیم یافتہ اور صاحب فکر ودانش رہنماؤں کی تائید اور ان کا اعتراف حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے، اس تحریک کے رہنماؤں نے غیر مسلم دانشوروں اور قائدین کے تعاون کے ساتھ جو اجتماعات منعقد کئے ہیں وہ بہت کامیاب رہے ہیں اور ملک کے مختلف طبقات کے ممتاز ترین لوگ ان میں شریک ہوئے اور متأثر ہوئے ہیں، لیکن عراق کے ظالمانہ اقدام نے اس تحریک کی راہ میں مشکلات پیدا کر دیئے، کویت پر عراق کا حملہ قزاقی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، اس میں دینی وحدت واشتراک کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا گیا، مال و دولت کے علاوہ بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، عزتیں پامال کی گئیں، احسانات کی ناشکری ہوئی اور رذالت وبد کرداری کی آخری حدیں پار کرلی گئیں، جس سے برصغیر کے مسلمانوں کے سر شرم سے جھک گئے، پیشانی عرق آلود ہو گئی اور برادران وطن کو امن و آشتی کی دعوت کے لئے اب زبان کھولنی مشکل ہے، اگر ہمارے غیر مسلم

برادران وطن خلیجی جنگ اور کویت جیسے اسلامی اور امن پسند ملک کے ساتھ عراق کے طرز عمل کی طرف اشارہ کریں یا مسلمان کردوں کے ساتھ عراقی حکام کے رویہ کا تذکرہ کریں، جنھوں نے کسی زمانہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے بطل جلیل کو پیدا کیا اور وہ کہیں کہ جناب ہمیں احترام انسانیت کی دعوت دینے سے پہلے ذرا اپنے گھر کی، اپنے ہم مذہب لوگوں کی خبر لیں، اور مسلمانوں کی "مثالی قوم" کو دیکھیں تو ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

محترم حضرات! جنگ کے بادل اگرچہ چھٹ چکے ہیں، اور یہ منحوس مرحلہ اگرچہ ختم ہو چکا ہے، پھر بھی امتِ اسلامیہ کے حال و مستقبل کی فکر رکھنے والے مصلحین و مفکرین کو یہ جنگ اور اس کے دوران پیش آنے والے واقعات و حالات، چند حقائق کی طرف پوری قوت کے ساتھ متوجہ کر رہے ہیں، جو اس مدت میں واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں بلکہ ان احوال و کوائف نے ہر سنجیدہ و باشعور، اس امت کی فکر رکھنے والے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے والے مسلمان کی انگلی، اس امت میں موجود کمزوریوں اور اس کی صفوں میں موجود شگافوں (GAPS) پر رکھ دی ہے، بلکہ اس جنگ نے اس سے بھی زیادہ خطرناک دوررس اور امت کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی خامیوں کو آئینہ کر دیا ہے، جو نوجوانوں، صحافت، و دیگر ذرائع ابلاغ، اور بہت سی اسلامی تحریکات کے طرز فکر اور ان کے ذہن و شعور میں گھر کر گئی ہیں، ان کا خاص طور سے اس مؤقر مجلس میں اخلاقی جرأت کے ساتھ جائزہ لینا، قوت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا اور مکمل غیر جانبداری کے ساتھ اپنا اور دینی بھائیوں کا محاسبہ کرنا ضروری ہے، اللہ فرماتا ہے:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُونُوا قَوّٰامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ

الوَالِدَيۡنِ وَ الاَ قۡرَبِيۡنَ (سورۃالنساء ۱۳۵)اے ایمان والوں ! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنے رہو چاہے وہ تمہارے یا تمہارے والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو۔

لیکن ہم ان غیر خوش کن حقائق اور امت اسلامیہ کی (جس میں عرب مسلمان بھی شامل ہیں) موجودہ زندگی میں موجود قابل تشویش خلا پر گفتگو سے پہلے اس امر پر قدرے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ کانفرنس جس طرح بروقت ہو رہی ہے اسی طرح صحیح اور مناسب ترین جگہ میں منعقد ہو رہی ہے، اللہ نے مصر کے لئے یہ مقدر کر دیا ہے، اور اس کو یہ شرف بخشا ہے کہ انتہائی نازک اور خطرناک گھڑی میں اور جیساکہ قرآن میں آیا ہے :۔

إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِي وَقِيلَ مَنْ سكہ رَّاقٍ. (القیامہ ۔۲۶، ۲۷)اور جب جان حلق میں جالگے اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی تلاش ہونے لگے۔

ایسے وقت میں اسلام کی عزت و شرف اور مقدساتِ اسلامیہ کی حفاظت کے لئے فیصلہ کن اور قائدانہ کردار ادا کرے، کم از کم تاریخ میں دوبار ضرور ایسا ہوا ہے، جن کی طرف مختصراً اشارہ کرنا ضروری ہے۔

پہلا موقع تو وہ ہے جب کہ یورپ کے صلیبی عیسائی اپنے بادشاہوں، فوجی سرداروں اور پر جوش اور سر فروش سپاہیوں کے ساتھ اور بے نظیر عزم وارادہ کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے، ان کے عزائم یہ تھے کہ جزیرۂ نمائے عرب اور حرمین شریفین پر قبضہ کرلیں، وہاں سے اسلام کے آثار و نشانات مٹادیں، اور ان مقدسات کی توہین کے مرتکب ہوں جن پر مسلمان اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزت اور اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں، اس حملہ اور اس کی

وجہ سے عالم اسلام کو لاحق خطرات کے سلسلہ میں ہم ایک صاحب اختصاص مغربی مصنف اسٹینلے لین پول (STANLEY LANEPOOLE) کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں، وہ اپنی مشہور کتاب "صلاح الدین" (SALADIN) میں لکھتا ہے :۔

صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے۔(۱)

اس موقع پر علیم و قدیر، کار ساز عالم کا یہ فیصلہ سامنے آیا کہ مسلمانوں کا قبلۂ اول "**بیت المقدس**" نوے سال صلیبیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رجب ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء میں اسلام اور مسلمانوں کو واپس ملے۔

صلاح الدین، الملک العادل نورالدین زنگی کے سپہ سالار اور ان کی طرف سے مصر کے حاکم تھے، اس طرح اس عظیم کارنامہ اور شاندار فتح کے ساتھ مصر کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا، اور یہ فضیلت صلاح الدین کی صورت میں مصری قیادت کے حصہ میں آئی، ظاہر ہے کہ اس نے اللہ کی مدد کے ساتھ مصر کے بہادر مسلمان مجاہدین کے ذریعہ یہ کارنامہ انجام دیا، لین پول لکھتا ہے :۔

"نورالدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا رود نیل پر قابض ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آگئی تھی، وہ دونوں طرف سے دب رہی تھی، اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی

تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے دمیاط اور اسکندریہ کی
بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک بحری
بیڑے پر بھی ہو گیا اور انھوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق
یورپ سے منقطع کر دیا"۔(۲)

سلطان صلاح الدین خود اس کا اعتراف کرتے تھے کہ اس کارنامہ میں مصر کا اہم حصہ ہے، ایک مرتبہ انھوں نے کہا:۔

"جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں نے سمجھا کہ فلسطین بھی اللہ
کو مجھے دینا منظور ہے"۔(۳)

دوسرا موقع ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر تاتاری یورش کا ہے، یہ یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا، تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی، یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا "إذاقيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق" اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا۔

اس نازک موقع پر جو صلیبی حملوں سے بھی زیادہ خطرناک تھا، مسلمان بادشاہ، حکومتیں، اور قیادتیں تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سامنے نہیں آئیں انھوں نے تاتاری غلبہ واستعلاء کو تقدیر کا فیصلہ اور عذاب الٰہی سمجھ رکھا تھا، اس موقع پر ایک بار پھر مصر سامنے آیا اور تاتاریوں کے مقابلہ اور شکست دینے میں سبقت حاصل کی، مصر کے حاکم الملک المظفر سیف الدین قطز اور اس کی بہادر

مصری مسلمان فوجوں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ تاتاریوں کے شکست نہ کھانے کا مقولہ غلط ثابت کر دیں، مؤرخین لکھتے ہیں :۔

"شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارتگری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المظفر قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے اس لئے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے چنانچہ ۲۵۔ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی فوج میں مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی وہ بری طرح بھاگے، مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور بڑی تعداد میں گرفتار کیا"(۴)

علامہ سیوطیؒ "**تاریخُ الخلفاء**" میں لکھتے ہیں :۔

"تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو پکڑ لیتے تھے، اور لوٹتے تھے"(۵)

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل کر دیا اور اس طرح

وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں۔

ان دو غیر معمولی مثالوں کی روشنی میں مصر کو اسلامی تاریخ میں اپنے کارناموں اور خدمات پر فخر حاصل ہے، اس کو اللہ کی تائید و نصرت اور مقدس و نازک فریضہ کے لئے انتخاب پر بارگاہ الٰہی میں شکر گذار ہونا چاہئے، اسلام اور مقدسات اسلامیہ کے تحفظ میں مصر کی شاندار اور قابل فخر تاریخ کا تقاضہ ہے کہ اس دور میں بھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے سامنے آئے، قائدانہ کردار ادا کرے۔ اور اپنے ترکش کے تیروں۔ مثبت اور تعمیری تیروں۔ کو سامنے لائے، مصر کو قدیم زمانہ سے ''**کنانۃ الاسلام**'' اسلام کا ترکش کہا گیا ہے، اور اسلام کے ترکش کے تیر نہ کبھی ختم ہوتے ہیں نہ نشانہ خطا کرتے ہیں۔ آج کے نازک دور میں ''**کنانۃ الاسلام**'' سے جو تیر مطلوب ہے، اور اس ملک سے جس کردار و عمل کا انتظار ہے، وہ ہے نئے حقائق کا شعور و ادراک، اور ان کا اعتراف و اظہار، کویت پر عراق کے ظالمانہ حملہ، صدام حسین کے غیر عاقلانہ اور مغرورانہ طرز عمل اور عرب اور دیگر مسلمان اقوام کے رد عمل کے نتیجہ میں بہت سے نئے حقائق سامنے آئے ہیں، امتِ اسلامیہ، اسلامی تنظیموں اور مسلم صحافت کے ذہن اور طرز فکر میں بہت سی خامیوں اور دراڑوں سے پردہ ہٹ گیا ہے۔

یہاں میں عام مسلمانوں کے طرز فکر، ملک کی صحافت و ذرائع لبلاغ یا زیادہ وسیع اور واضح الفاظ میں ان کی زندگی میں موجود خامیوں اور ان کے علاج، امت کی صفوں میں پڑنے والی دراڑ اور ان کے پُر کرنے اور قرآن و حدیث اور تاریخ انسانی کی شہادتوں کی روشنی میں امت کے مستقبل پر مرتب ہونے والے خراب و خطرناک نتائج و عواقب سے محفوظ رکھنے کے اصولوں کی طرف امت کا ذہن بنانے والوں،

تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں ،صحافیوں ، دعوت اسلامی اور ''**صحوئہ اسلامیہ**'' کی خدمت انجام دینے والوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ا۔ عام مسلمانوں ، خاص طور سے نوجوانوں کی ایک اہم کمزوری جو اس جنگ کے دوران بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے وہ ہے پر جوش نعروں ،بلند بانگ دعووں اور سحر انگیز وعدوں سے فریب کھانے کا مزاج یا مستقل صلاحیت ہے اس سلسلہ میں عام مسلمان نہ تو نعرہ لگانے والوں کے افکار و عقائد دیکھتے ہیں ،نہ ان کے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں ،نہ ان سیاسی وفکری تحریکات اور ان کے فکر و فلسفہ اور مقاصد واعمال کو دیکھتے ہیں جن سے یہ نعرہ لگانے والے پوری طرح مربوط وہم آہنگ ہوتے ہیں خاص طور سے اگر یہ نعرے اور ڈینگیں کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرتی ہوں اور ڈینگیں مارنے والے جرأت و حوصلہ مندی کا مظاہرہ کریں تو عام مسلمان اور خاص طور سے نوجوان شدید تأثر ، جذباتی ابال اور ایک طرح کے دماغی دورہ (HYSTERIA) کا شکار ہو جاتے ہیں جس کو کسی طرح قابو میں نہیں لایا جا سکتا ایسی صورت میں نہ دینی احکام و مصالح کا پاس ولحاظ ہوتا ہے ،نہ علمی تنقید و تحلیل اور نہ حالات و حقائق کا دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ ہی کچھ مفید ثابت ہوتا ہے بلکہ کھولتی ہوئی ہانڈی کی طرح جذبات میں ابال آجاتا ہے جو اکثر دین عقائد اور شعائر اسلام سے اعراض بلکہ ان کی اہانت تک پہنچادیتا ہے ،اور دین کے نمائندہ علماء اور اصحاب اختصاص تو سب سے پہلے زد میں آتے ہیں ،اس طرح کے جذبات کی رو میں بے سوچے سمجھے بہہ جانے والوں کی بلیغ ترین صفت سیدنا علی بن ابی طالبؓ نے ایک جملہ میں بیان فرمائی ہے ، جن کو اس صورت حال کا بار بار سامنا کرنا پڑا تھا ،اور جنھیں دوسرے ائمہ اسلام کے مقابلہ میں اس طرح کے حالات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا ،

آپ نے اہل عراق کے بارے میں فرمایا تھا، "أتباع كل ناعق" (ہر زور سے بولنے والے کے پیچھے بھاگنے والے ہیں)

لہٰذا امت کے مختلف طبقوں میں یہاں تک کہ دیندار اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح دینی، سماجی اور سیاسی شعور پیدا کیا جائے، نیک وبد کو سمجھنے کی صلاحیت کو تقویت پہونچائی جائے، نئے مسائل پر غور کرنے، ان کی گہرائیوں تک اترنے اور ان کے نتائج وعواقب کا صحیح اندزہ لگانے کی قوت میں جلا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور ان کو صفائی اور صراحت کے ساتھ بتلایا جائے کہ عقائد وافکار کے اصل اور صحیح ماخذ کون سے ہیں اور قوت ونشاط کے حقیقی سرچشمے کہاں ہیں؟

مسلم عوام کو اس بات کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو سمجھیں، زمانہ کے مشکلات ومسائل اس میں جاری وساری رجحانات، تحریکوں، اسلام کے بارہ میں ان کے رویہ، زندگی پر مرتب ہونے والے ان کے اثرات، دین کے مستقبل کے لئے ان سے لاحق خطرات اور نئی مسلم نسل کے ذہن پر پڑنے والے سایوں کو ذہن میں رکھنا سیکھیں، ان قیادتوں کے مطمح نظر اور ان کے اغراض ومقاصد سے ناواقف نہ رہیں، جو ملکوں پر اور سماج پر تسلط قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو سماج کو اپنے عقائد، افکار ونظریات اور اپنے آدرشوں کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، جو زندگی کو نئی راہ اور نیا رخ دینا چاہتے ہیں، ان طاقتوں، رجحانات افکار اور قیادتوں کو نظر انداز کرنا اور دینی جماعتوں کا اپنے خول میں بند رہنا خود ان تحریکوں کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، ان تحریکوں کی دینی دعوت ان کی سرگرمیاں اگر فرائض وواجبات، طہارت وعفت کی زندگی اور نوافل کے

اہتمام تک محدود رہیں تو خطرہ اس بات کا ہے کہ کچھ مدت گذرنے کے بعد دین پر عمل اور شرعی احکام کے نفاذ کی آزادی سلب کرلی جائے اور حالات ان کے لئے اس قدر دشوار ہو جائیں، جس کی تصویر کشی قرآن مجید نے اپنے بلیغ اور معجزانہ اسلوب میں کی ہے کہ :۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِم أَنفُسُهُمْ (سورة التوبة۔ ۱۱۸) زمین ان پر باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آگئے۔

جذباتی نعروں، دعوؤں، وعدوں، اور کھوکھلی شجاعت کے مظاہروں سے فریب کھانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا زبردست خطرہ ہے، (خاص طور پر اس امت کے لئے اپنے عقیدہ پر اور اپنے پیغام پر قائم رہنے کے لئے اور نوع انسانی کی ہدایت ورہنمائی کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آسمانی شریعت اور اس آخری دین پر قائم رہنے کے لئے،) اس طرح مسلمانوں کا یہ رویہ قرن اول سے لے کر اس وقت تک کے ان کے مصلحین و مجددین، مجاہدین اور دعوت اسلامی کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے والے شہداء کی تمام کوششوں پر پانی پھیر سکتا ہے، اس سے خطرہ اس بات کا پیدا ہو گیا ہے کہ اس امت میں اور قدیم ترین اسلامی ممالک میں بھی مغربی عیسائیوں کا یہ تصور کار فرما نظر آنے لگے کہ :"دین ایک ذاتی معاملہ ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان محدود ہے، قانون سازی، سیاست اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں اس کا عمل دخل نہیں"

۲۔ عام مسلمان اور خاص طور سے نوجوان جوان بے حقیقت و پر جوش نعروں اور کسی بڑی طاقت کو للکارنے کے جھوٹے مظاہروں سے اس حد تک متأثر

ہو گئے کہ عقل و ہوش کھو بیٹھے، اس کے کچھ نفسیاتی اسباب بھی ہیں اگرچہ وہ اس کا جواز فراہم نہیں کرتے کہ ہر جوشیلے نعرے لگانے والے کو تقدیس کی حد تک پہنچادیں پھر بھی انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کا احساس کیا جائے اور ان کا سدباب کیا جائے۔

اس امت میں عرصہ سے ایسی طاقتور اور جرأتمند قیادت کا فقدان ہے جس کے اندر جہاد کی روح کار فرما ہو، جسے اپنے عقیدہ پر فخر ہو، دنیا کی رہنمائی کے منصب اور اس کی ذمہ داریوں کا شعور ہو اور بڑی حد تک مغربی یا مشرقی بڑی طاقتوں کے سہارے سے بے نیاز ہو، یہ بڑی طاقتیں ہی اسلامی کوششوں اور وسیع تر حلقہ واثر رکھنے والی اسلامی تحریکوں کو ناکام بنانے اور اسلامی ممالک کو ایسی عظیم، مؤثر اور قوی شخصیتوں سے، جن پر دینی فکر غالب ہو، جو اپنے ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ چاہتی ہوں، جو اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی قوت و شوکت کے عزائم رکھتی ہوں، محروم کرنے کی ہر طرح کی سازشیں کرتی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اسلام ماضی قریب میں بہترین رہنماؤں سے محروم ہوتا رہا۔

پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ قوت و شوکت اور کبھی کبھی خطر پسندی سے متأثر و مرعوب ہونا فطری بات ہے، جن صفات سے انسان خود محروم ہوتا ہے، ان سے متأثر ہوتا ہے اور اسلام کی تاریخ شجاعت و شہامت اور بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہ لانے کے واقعات سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس دور کے باضمیر اور غیر تمند مسلمان کمزور حکومتوں اور آرام طلب قیادتوں سے تنگ آگئے ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر مسلمان اور خاص طور سے نوجوان بڑی طاقتوں کی سرگرمیوں اور ان کی سازشوں سے واقف ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی قیادت کو سامنے لانے پر توجہ دی جائے جو طاقتور ہو، جرائتمند ہو، صاحب ایمان اور ہوش مند ہو، اللہ نے ان کے ملک کو جو طاقت وثروت عطا فرمائی ہے ان پر اعتماد رکھے، ان میں اضافہ کی کوشش کرے، ٹکنالوجی، صنعتوں اور فوجی قوت پر توجہ دے، ممکن حد تک غیروں سے بے نیاز ہو، ایمانی قوت، قوم وملت کے اخلاص اور ایمان و عقیدہ کے دفاع کے لئے قربانی کے جذبہ پر اعتماد کرتے ہوئے، اسلامی مصالح اور صحیح و مخلص قیادت کے خلاف کسی بھی سازش کے مقابلہ میں یا اسلامی مسائل و ممالک میں کسی بھی دخل اندازی کے سامنے جم کر کھڑی ہو جائے۔

۳۔ اسلامی ممالک میں مثبت، فعال و متحرک اور طاقتور دینی تحریک کے قیام واستحکام پر توجہ دینا بھی ضروری ہے اور اگر کوئی ایسی تحریک موجود ہو تو اس سے خطرہ محسوس کرنے اور اس کو ختم یا کمزور کرنے کی کوشش کے بجائے اس کی قدر اور ہمت افزائی کرنی چاہئے، اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تکمیل اور اس کے استحکام وبقاء کے لئے ایک ایسی اسلامی دعوتی تحریک بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے جو مردانگی، جرأت وہمت، بلند ہمتی اور پیش بینی کی صفات سے متصف ہو، جو ایسی طاقتوں اور قیادتوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت وصلاحیت رکھتی ہو، جنھوں نے بلا کسی استحقاق و جواز کے نوع انسانی کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے، اور جو اسلامی و غیر اسلامی ممالک واقوام کی قسمتوں کی مالک بن بیٹھی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قوم مسلم، اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کے باوجود، جن میں بعض کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا، مشرقی و مغربی تمام اقوام کے مقابلہ میں بعض صفات کے اندر بہت ممتاز ہے۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر ☆ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

یہ صفات ہیں اللہ اور آخرت پر ایمان، زندگی کی بے حقیقی کا شعور، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے زندگی کی لذتوں اور آسایشوں کی قربانی، شہادت کا شوق، جنت اور رضائے الٰہی کی امید، اللہ کے وعدہ کئے ہوئے اجر و ثواب کا یقین اور اس کے لئے جان و مال سب کچھ لٹادینے کی تڑپ، بے مثال صلاحیتوں کی یہ چنگاریاں منتظر ہیں کسی طاقتور مخلص داعی کی، جو ان کے اسلامی جوش کو ابھار دے، شرارۂ ایمان کو شعلۂ جوالہ بنادے، اور ابھی ماضی قریب تک بعض مخلص اللہ والوں نے یہ کارنمایاں کر دکھایا ہے، (۶) قرآن کریم نے بھی مسلمانوں کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے، جو انھیں دیگر مادی اقوام و ملل کے سورماؤں اور بہادروں سے جن کا رابطہ آسمانی پیغام اور ایمانی سرچشموں سے منقطع ہو گیا ہے، کے مقابلہ میں ممتاز کرتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ، إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ (النساء ـ ۱۰۴) اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو اگر تمہیں (جسمانی) دکھ پہونچتا ہے تو ان کو بھی دکھ پہونچتا ہے (لیکن) تم اللہ سے (اجر و ثواب کی) وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔

یہ ایسی دولت ہے جس کی کوئی مثال نہیں، ایسی طاقت ہے جس کا کوئی جواب نہیں اور مسلمان ملکوں اور قوموں پر زیادتی ہو گی، بلکہ ان ملکوں اور قوموں میں قائم حکومتوں اور قیادتوں کے حق میں بھی یہ زیادتی ہو گی کہ وہ اس سے گھبرائیں اور اپنی قیادت و حکومت کے لئے ان سے خطرہ محسوس کریں، ان کو اپنا حریف سمجھیں اور بات یہاں تک پہنچ جائے کہ ان کو ختم کرنے اور ان کے اثر و نفوذ

سے نجات حاصل کرنے کے لئے ساری طاقتیں اور سارے وسائل، جن میں صحافت، دیگر ذرائع لبلاغ اور نظام تعلیم وتربیت وغیرہ بھی شامل ہیں، وقف کردی جائیں، یہ ایک بے محل جد جہد ہے، اور قوم وملک کے ان عزیز ترین فرزندوں کے خلاف جنگ کی ایک شکل ہے، جو نازک گھڑی میں ان کے کام آسکیں۔

ان مسلمان اقوام کا ایک نمایاں اور معروف وصف اللہ اور اللہ کے دین کے ساتھ اخلاص بھی ہے، شرط یہ ہے کہ اس کے اظہار کا صحیح موقعہ و محل فراہم ہو، کوئی اللہ کے نام پر اور اسلام کے نام پر آواز لگاتا ہے تو مسلمان اس کی طرف ایسے جوش اور جذبہ کے ساتھ لپکتے ہیں جس کی اس زمانہ میں نظیر نہیں ملتی، مسلمان حکومتوں اور قیادتوں کی کمزوری ہے کہ وہ حقائق کو نظر انداز کرتی ہیں، اور اس قیمتی سرمایہ اور زبردست طاقت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کو دبانے اور مٹانے کے لئے ساری طاقت، ذہانت، اور وسائل صرف کرتی ہیں۔

۴۔ اسلام ہی عرب قومیت کی اساس وبنیاد اور محمد عربی ﷺ عالم عربی کی روح ہیں، اس کے قائد اور امام ہیں، اور ایمان کی طاقت ہی عربوں کی اصل طاقت ہے، عربوں نے جب اس طاقت سے فائدہ اٹھایا تو پوری دنیا پر چھا گئے، آج بھی اس کے اندر وہی قوت وصلاحیت موجود ہے اور عرب اقوام آج بھی اس کی مدد سے اپنے دشمنوں کو شکست دے سکتی ہیں، اور اپنا تحفظ کر سکتی ہیں، اسلام اور ایمانی قوت کے بغیر عربوں کا نہ کوئی امتیاز ہے، نہ وقار واعتبار، نہ کوئی تشخص اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا — محمد عربی سے ہے عالم عربی

محمد عربی ﷺ نے ہی عربوں کو دنیا کے سامنے ایک حقیقت اور ایک ممتاز و مشخص

قوم کی حیثیت سے پیش کیا، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور قومیت اور وطنیت کے مقابلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا، اس کو اپنانا اور اس کا پر جوش داعی بننا چاہئے، عالم عربی کو پورے عالم اسلامی سے مربوط کرنے کا یہی سب سے مضبوط و مستحکم ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے پوری دنیا کا مسلمان عالم عربی سے محبت و ہمدردی رکھتا ہے، اس کی مدافعت اور اس کے لئے قربانیوں کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے یہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو عالم عربی کو مغربی اور غیر اسلامی قوموں کی نظر میں بھی ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

۵۔ ممکن حد تک ناز و نعمت اور عیش و عشرت کی زندگی سے دور رہنا چاہئے، ترقی و تمدن کے مظاہر میں مبالغہ، بے ضرورت کے اخراجات، لذت و شہوت اور شان و شوکت کے اظہار کے لئے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کوئی پسندیدہ بات نہیں، ایسے اعمال و اخلاق سے پرہیز لازم ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہوں اور تائید و نصرت الٰہی سے مانع بن سکتے ہوں۔

چھٹی صدی عیسوی کا رومی اور ایرانی تمدن جو زیب و زینت، دولت و ثروت اور پر تکلف زندگی کی آخری حدوں تک پہنچ رہا تھا اس کے مقابلہ میں قدیم عرب مسلمانوں نے اپنے اسلامی اخلاق، سادگی، فضول خرچی سے اجتناب، محبت و مشقت کی زندگی اور شہسواری کی خصوصیات کو باقی رکھا تھا، آج بھی اس زندگی کو اپنانے کی ضرورت ہے، اور اگر تمدن کو اختیار کرنا کسی حد تک ضروری تو اسے ان تعلیمات کے سانچہ میں ڈھال دینا، ان اخلاق و آداب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان مقاصد اور نشانوں کے تابع بنا دینا چاہئے، جن سے اسلام کے ذریعہ اللہ نے اس امت کو نوازا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جو قوم بھی عیش وعشرت، آسائش، حیات کی کثرت اور ناز ونعمت میں ڈوب گئی، اس میں جاہلیت کی عادتیں پھیل گئیں اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں، وہ دوسروں کے ظالمانہ حملوں کا نشانہ بن گئیں :۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوا مِنْ قَبل. وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدْراً مَّقدُوراً. (احزاب. ۳۸) یہی اللہ کا معمول رہا ہے ان لوگوں کے بارہ میں جو پہلے گذر چکے ہیں اور اللہ کا حکم خوب تجویز کیا ہوا ہوتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں اسلامی معاشرہ میں عام طور سے یہی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، جب تاتاریوں کا سیلاب عالم اسلام پر امنڈ پڑا، جس نے نسلی اور دینی قتل عام کی شکل اختیار کرلی، تاتاری حملہ سے پہلے بغداد کے مسلم معاشرہ کے حالات کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہاں صرف ایک بڑے مؤرخ کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں، اس زمانہ میں دوسرے مسلم ممالک اور شہروں کے حالات اس سے زیادہ مختلف نہیں تھے، مفتی قطب الدین نہروالی اپنی کتاب ''**الإعلام بأعلام بيت الله الحرام**'' میں لکھتے ہیں :۔

مرفهون بلين المهاد، ساكنون على شط بغداد في ظِل ثخين وماء معين ، وفاكهة وشراب واجتماع احباب واصحاب، ماكابدوا حرباً ولا دافعوا طعنا ولاضرباً (الاعلام. ۱۸۰) عیش وعشرت کے مزے لوٹ رہے تھے، بغداد میں (دجلہ کے) ساحل پر آباد تھے، جہاں گھنا سایہ تھا، بافراط میٹھا پانی تھا، میوے اور مشروبات کی کثرت تھی، دوست احباب کی مجلسیں تھیں، جنگ کی مصیبتوں سے سابقہ نہیں تھا، نہ نیزے اور تلواریں اٹھانے کی نوبت آتی تھی۔

مسلمانوں کی طویل تاریخ کے اندر بہت سے مسلم معاشروں، مسلمان قوموں اور وسیع اور ترقی یافتہ حکومتوں میں خوش عیشی اور فارغ البالی کی یہی کہانی دُہرائی گئی، اور اس کا نتیجہ وہی نکلا ہے جو بغداد میں ظاہر ہوا، شدت و وسعت میں اگر کچھ فرق رہا ہو تو ان معاشروں کے قدو قامت یا ان حکومتوں کی قوت و حیثیت اس کا سبب بنی ہے۔(۷)

۶۔ اس مرحلہ پر اس امر کی بھی ضرورت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ عرب اور اسلامی حکومتوں اور قوموں کی اپنی ایک مؤثر اور فعال تنظیم ہونی چاہئے جو اسلامی ممالک ـــ اور ان میں عرب ممالک سر فہرست ہیں ـــ کی بین الاقوامی سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کی دیکھ ریکھ میں اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کی جگہ لے سکے، آزادی اور عزت و وقار کے تحفظ میں ان کی ہمت افزائی کرے، اگر کوئی بڑا ملک کسی چھوٹے ملک پر حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت کا فریضہ انجام دے، اس طرح کے معاملات میں اقوام متحدہ یا کسی بڑی طاقت کی جگہ اس کی طرف رجوع کیا جا سکے، اور اس سے مدد لی جا سکے، ایسی کسی تنظیم کو اتنا احترام و وقار اور اتنی طاقت حاصل ہونی چاہئے کہ وہ کسی بھی اسلامی ملک پر جارحیت کا مناسب جواب دے سکے، اور انانیت پسند استبدادی قیادتیں اور دنیا کی بڑی طاقتیں اسے نظر انداز نہ کر سکیں۔

اس طرح کی کسی تنظیم کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہونی چاہئے کہ وہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین کی خاص طور پر اور پورے جزیرۃ العرب کے تحفظ و دفاع کی عام طور پر ذمہ داری سنبھالے کیونکہ یہی اسلام کا اصل مرکز اور دعوتِ اسلامی کا اصل سرمایہ ہے، مسلمان کسی زمانہ میں بھی ہوں اور کسی جگہ بھی ہوں، ان

کا عزوشرف حجازِ مقدس کی عزت وعظمت کے ساتھ وابستہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

جَعَلَ اللّٰهُ الكَعبَةَ البَيتَ الحَرامَ قِيامًا لِلنّاسِ وَالشَّهرَ الحَرام . (المائدہ . ۹۷) اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے نیز حرمت والے مہینہ کو۔

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ نظامِ عالم درحقیقت بیت اللہ الحرام کے ساتھ وابستہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ عقائد اور اعمال واخلاق کا نظام اس دعوت سے وابستہ ہے جس کے لئے اس گھر کی تعمیر ہوئی ہے، مسلمان دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں، ان کے لئے مرکزِ اسلام۔۔۔ جہاں اللہ کی آخری وحی نازل ہوئی اور جہاں نوعِ انسانی کے لئے نئی صبح صادق طلوع ہوئی۔۔۔ کے بارہ میں انتہائی حساس اور غیرتمند ہونا اسلامی فریضہ ہے اور جیساکہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اخیر میں اسلامی ممالک کے ذمہ داروں اور سربراہوں کی خدمت میں بھی ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں :۔

محترم حضرات! قرآن، سنت، دعوتوں اور دنیا کی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ کی روشنی میں سب سے بہتر اور مفید چیز ہے اللہ کے ساتھ صدق واخلاص، اس کی طرف رجوع وانابت، ساتھ ہی فرد اور سماج کی زندگی میں ہر ممکن اصلاح، سماج سے منکرات، اللہ کی تائید ونصرت سے محروم کرنے والے اخلاق واعمال کا ازالہ اور سماجی، سیاسی، انتظامی اور انفرادی زندگی سے سستی وکاہلی اور

تضادات سے اجتناب، قرآن وحدیث اس پر شاہد ہیں، سیرتِ مبارکہ، خلفائے راشدین اور صالح بادشاہوں کی زندگی میں اس کے بے شمار نمونے موجود ہیں، ان کی تفصیل اور واقعات واسماء کے تذکرہ وتعیین کی یہاں ضرورت نہیں، خلاصہ یہ کہ انابت الی اللہ اور اصلاحِ امت وازالہٗ منکرات کی جدوجہد میں اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے مصیبتوں اور دشواریوں کے وقت قوموں اور معاشروں کو بُرے نتائج سے محفوظ رکھنے کی مؤثر ترین قوت ہے، اور عام ذرائع واسباب، فوجی طاقت یا بڑی طاقتوں کی تائید وحمایت یہ ساری چیزیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

حواشی :۔

(۱) سلطان صلاح الدین ص ۸۹

(۲) سلطان صلاح الدین ص ۸۹

(۳) سلطان صلاح الدین ص ۱۴۶

(۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "**الکامل**" ۔ ابن الاثیر ج ۱۲

(۵) تاریخ الخلفاء ص ۴۲۵

(۶) جیسے ہندوستان میں سید احمد شہیدؒ بالاکوٹ (م ۱۲۴۶ھ) طرابلس میں سیدی احمد الشریف السنوسی (م ۱۳۵۱ھ) اور امیر عبدالقادر الجزائری (م ۱۳۰۱ھ) وغیرہ۔

(۷) تفصیل کے لئے ہندوستان میں مغلوں کے عروج وزوال اور ایران وترکستان میں خوارزم شاہی سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار
اور
ہندوستان کے لئے ان کا باعث افتخار ہونا

مفکرؒ اسلام کی ایک گراں قدر تحریر ومقالہ جو ایک تاریخی جائزہ اور ایک دیانت دارانہ محاسبہ بھی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار

اور

ہندوستان کے لئے ان کا باعث افتخار ہونا

فضلائے مدارس عربیہ کی چند امتیازی خصوصیات

قدیم دینی نظام تعلیم اور عام طور پر جو دینی یا عربی مدارس کہلاتے ہیں، وہ بعض ایسی خصوصیات کے مالک اور محافظ ہیں جو جدید تعلیمی نظاموں (EDUCA-TION SYSTEMS) میں (ان کی افادیت اور ضرورت کا انکار کئے بغیر) مفقود یا بہت نایاب ہیں، اور ان کی بنا پر ہر بدلے ہوئے زمانہ اور ترقی یافتہ جدید دور اور ایک نوخیز و ترقی پذیر معاشرہ میں ان کی قدر و قیمت اور ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہاں بہت اختصار کے ساتھ چند خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کی عملی مثالیں اور واقعات ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کے ہزارہا صفحات میں

بکھرے ہوئے ہیں۔

ا۔ ان میں سے ایک بڑا امتیاز و شعائر (خصوصیت وعلامت) پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا اخلاص (SINCERITY)اور ایثار (SACRI-FICE) ہے، چونکہ تعلیم و تعلم کا اُخروی ثواب اور استاد و معلم کی دینی فضیلت طلبہ کے ذہن پر نقش ہوتی ہے، اور ان کا عقیدہ اور جزو ایمان بن چکی ہوتی ہے، اس لئے ان میں (اگر سب نہیں تو ایک بڑی تعداد) محض خدا کی خوشنودی اور اجر و ثواب کے حاصل کرنے کے لئے تعلیم و تعلم میں مشغول ہوتی ہے، اور اس کو افضل عبادت واعلیٰ سعادت سمجھتی ہے، اساتذہ میں بہت سے حضرات زُہد و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اور اپنے علمی امتیاز اور کمال فن کی بنا پر اپنے ملک یا دوسرے ملکوں میں جو فوائد و مواقع حاصل کر سکتے ہیں، ان سے آنکھ بند کر کے اپنے ملک اور مدرسہ میں قناعت و ایثار کی زندگی گزارتے ہیں، اور اپنے فن اور طلبہ کی خدمت کرتے ہیں، کسی زمانہ میں بھی اقتصادیات اور معیار زندگی کتنی ہی اہمیت حاصل کرلے، اس ایثار و قربانی اور قناعت کی تحقیر اور اس کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

۲۔ دوسری خصوصیت درس میں انہماک ہے، مدارس عربیہ کے اساتذہ کو درس و تدریس میں اس درجہ استغراق وانہماک رہا کرتا تھا (اور اس کا نمونہ اب بھی دیکھا جاسکتا ہے) جس کا تصور بھی واقعات اور مثالوں کے بغیر مشکل ہے، اور ان کا اس مختصر مضمون میں پیش کرنا اور بھی دشوار ہے، پڑھنا اور پڑھانا، مطالعہ اور محنت ان کی روح کی غذا اور ان کی عبادت اور وظیفہ بن گیا تھا، اساتذہ کے تمام اوقات (بشری ضرورتوں اور قلیل راحت کے علاوہ) پڑھنے پڑھانے میں گھرے

رہتے تھے، یہاں تک کہ بعض حضرات کھانے کے وقت اور چلتے پھرتے بھی پڑھاتے تھے۔

۳۔ تیسری خصوصیت طلبہ سے تعلق ہے، ان اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالبِ علموں سے ایسا گہرا اور شدید تعلق ہوتا تھا،(۲) جس کی مثال اس زمانہ اور جدید نظامِ تعلیم میں ملنا مشکل ہے، اساتذہ طلبہ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اکثر اوقات ان کے متکفل ہوتے تھے، اور ان کو خورد و نوش میں شریک کرتے تھے۔(۳)

۴۔ اسی طرح طلبہ کا اساتذہ سے ایسا تعلق تھا، جس کے سلسلہ میں تاریخ و سوانح حیات میں ایسے واقعات ملتے ہیں، جن کا یقین کرنا اس زمانہ میں مشکل ہے اور جن کی نقل و تقلید بھی اس زمانہ میں دینی و علمی حیثیت سے نہ ضروری ہے نہ ممکن،(۴) پھر بھی خالص مادی اور لادینی (SECULAR) تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں اب بھی مدارسِ دینیہ عربیہ کو اس سلسلہ میں کھلا امتیاز حاصل ہے۔

۵۔ ان دینی اور عربی مدارس کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اُن کے فضلاء اور سند یافتہ لوگوں نے اپنے وقت کے غلط رُجحان، کسی خطرناک فتنہ، یہاں تک کہ سلطنتوں (اور وہ عام طور پر مسلم سلطنتیں ہوتی تھیں) کی غلط سیاست اور ناجائز قوانین اور سرپرستوں کا دلیرانہ اور بعض اوقات سرفروشانہ مقابلہ کیا، اور بعض اوقات اس میں جانیں دے دیں، اور بعض اوقات سلطنتوں اور ملک و معاشرہ کا رُخ بدل دیا، اور کسی قیمت پر بھی وہ حکومت کے ہاتھوں، یا اہلِ دولت اور اہلِ اثر کے ہاتھوں بِکے نہیں۔(۵)

۶۔ اس تعلیم و تربیت، حق پسندی، اخلاقی جرأت اور ضمیر کی آزادی

دینداری کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے مقابلہ کی پہلی صدا اسی دینی طبقہ اور علماء کے حلقہ سے بلند ہوئی، اس نے سب سے پہلے اس خطرہ کو محسوس کیا اور انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا، (۶) انگریز مؤرخین نے صاف طور پر اس کا اظہار کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں (جس کو وہ غدر-MU-TINY) کے لقب سے یاد کرتے ہیں) سید احمد صاحبؒ کی جماعت مجاہدین کی چنگاریاں ہی کام کر رہی تھیں، اسی بنا پر اس جنگ آزادی میں سب سے بڑی قربانیاں اسی جماعت کے افراد و خاندانوں، بالخصوص خاندان صادقپور پٹنہ نے دیں، ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں، مکانات یہاں تک کہ مقابر تک منہدم کیے گئے، اور بعض نامی گرامی افراد (مولانا یحیی علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب) جزیرۂ انڈمان اور کالا پانی بھیج دیئے گئے، اور وہیں اول الذکر دونوں افراد کی وفات ہوئی۔ (۷)

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی آزادی کا صور پھونکا گیا، اور آزادی کی تحریک اور تحریک خلافت وجود میں آئی تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قربانیاں طبقۂ علماء کے افراد اور فضلائے مدارس نے دیں، مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی (جو شیخ الہند کے لقب سے معروف ہیں) اور ان کے ساتھ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عزیز گل صاحب، مولوی وحید احمد، اور حکیم نصرت حسین کوڑوی کو ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء) کو پہلے مصر پھر مالٹا بھیج دیا گیا، وہ تین سال دو مہینے رہے، اور حکیم نصرت حسین صاحب کا وہیں انتقال ہوا، واپسی پر بھی وہ آخر وقت تک آزادی کی جدوجہد، اور اس تحریک و دعوت میں نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش رہے، جہاں

تک مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا تعلق ہے، وہ اتنے بار جیل گئے کہ کسی سیاسی قائد کو اس کا اتفاق کم ہی ہوا ہوگا۔

اس تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند اور ان کے اہلِ عقیدت وارادت کے علاوہ کثیر التعداد علماء اور فضلائے مدارس شریک تھے، جن میں مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبد الحلیم صدیقی، اور کثیر التعداد علماء اس گروہ میں شامل ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد معروفِ عوام وخواص ہیں، اور وہ نہ صرف جنگ آزادی کے ایک قائد ورہنما، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ دماغ اور مفکر اعظم ہیں، ان کے علاوہ بھی عام طور پر فضلائے مدارس، علمائے دین، یہاں تک کہ خالص علمی وتحقیقی کام کرنے والے حضرات بھی تحریکِ آزادی وطن سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والے اور فکری طور پر ان سے ہم آہنگ تھے، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی (ناظم دار المصنفین) مولانا معین الدین اجمیری اور مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب بہاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اور ہندوستان کی تاریخِ آزادی کا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ان فضلاء وطلبائے مدارس عربیہ کی ایک خصوصیت (جس کو اس صدی کے اخلاقی طور پر بدترانحطاط معاشرہ اور بے اصولی کے دور میں بے قیمت اور حقیر نہیں سمجھا جاسکتا) اُن کے ان اخلاقی اصول، دینی تعلیمات، اور تہذیب وآداب کی پابندی ہے، جو وہ قرآن وحدیث، سیرت نبویؐ، اور علمائے سلف کے تذکروں سے

سیکھتے، اپنے اساتذہ میں اس کا نمونہ دیکھتے اور ان سے اس کی تاکید و تعلیم پاتے ہیں، اور جس کی اس بگڑے ہوئے (CORRUPT) معاشرہ میں بڑی ضرورت ہے، اور جس کو کردار سازی (CHARACTER BUILDING) سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس کی ہمارے معاشرہ میں عام طور پر اور جدید دانش گاہوں میں خاص طور پر کمی نظر آتی ہے۔

مشہور وممتاز ترین دینی وعلمی درسگاہیں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر ملک میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ احساسِ شکست، احساسِ کہتری، اور ایک عام مایوسی پھیلتی جا رہی تھی، نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ پورے ملک میں جدید مغربی نظام تعلیم اور فلسفۂ زندگی و تمدن کا اثر بلکہ سحر پھیلتا جا رہا تھا، اور اس سے اخلاق و معاشرت میں ایک انتشار اور سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی غلامی پیدا ہو رہی تھی، جس کا اثر اخلاق و معاشرت پر بھی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا، (۸) اور آسانی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اگر یہی صورتِ حال باقی رہی تو ہندوستان کی آبادی بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ (جس کے ہاتھ میں زمامِ قیادت اور عنانِ فکر رہتی ہے) اس مغربی قارورہ میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اس تأثر کا مقابلہ کرنے کے لئے یونیورسٹیاں کافی نہیں تھیں، جو مغربی نظامِ تعلیم ہی کی مقلد، خوشہ چیں بلکہ پیرو تھیں۔

اس صورتِ حال کے مقابلہ میں جری اور دوربیں علماء نے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد (کم سے کم) مسلمانوں کو دینی واخلاقی زوال سے محفوظ رکھیں، اور ان میں داعیانہ روح اور رضاکارانہ خدمت اور

اشاعتِ علم کا جذبہ ہو، اور جو حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کی دینی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت و حفاظت کا فرض انجام دے سکیں۔

دار العلوم دیوبند اور دوسرے مرکزی دینی مدارس

ان مدارس میں دار العلوم دیوبند کو اولیت اور خاص اہمیت حاصل ہے، دار العلوم دیوبند سے اس کی سو سالہ تاریخ میں تحصیل علم کر کے نکلنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے، فارغین میں افغانستان، یاغستان، خیوہ، بخارا، قازان، روس، آذربائیجان، مغرب اقصیٰ، ایشیائے کوچک، تبت، چین، جزائر، بحر الہند وغیرہ دوسرے ملکوں کے طلبہ شامل ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دار العلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کی نمایاں اثرات رونما ہوئے، متعدد فضلاء نے سیاسی میدان اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور حق گوئی و بے باکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کر دی۔

دار العلوم دیوبند کے بعد سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم کا نمبر ہے، یہاں سے بھی بڑی تعداد میں علماء اور علم دین کے مخلص و خدمت گذار فارغ ہو کر نکلے ہیں، جنہوں نے خاص طور پر فن حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، متعدد کتب حدیث کی شرحیں ان کے قلم سے نکلی ہیں، جن کی وجہ سے ممالک عربیہ میں بھی اس کی شہرت ہوئی ہے، اور وہاں کے ماہرین فن بھی ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔(۹)

ہندوستان میں درس نظامی کے دوسرے مدارس بھی ہیں، جن میں قدیم نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، جماعت اہلِ حدیث کے بھی متعدد مدارس

ہیں، جو حدیث و سنت کی تدریس و تحقیق کا کام کرتے ہیں، فرقہ اثنا عشری (شیعہ فرقہ) کے بھی مدارس ہیں، جن میں لکھنؤ کے بعض مدارس (سلطان المدارس، ناظمیہ و مدرسۃ الواعظین) ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جنوبی ہند میں بھی کثیر التعداد وسیع و عظیم درسگاہیں ہیں، یو۔پی، بہار گجرات، دکن (خاص طور پر حیدر آباد) کرناٹک اور مالابار کیرالا میں متعدد شاندار مدارس اور دینی و علمی ادارے ہیں۔ (۱۰)

دارالعلوم ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی فکری تحریک ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں وجود میں آئی، اس کے بانی مولانا سیّد محمد علی مونگیریؒ تھے۔ (۱۱) اس کی رہنمائی ان کے بعد عرصہ تک علامہ شبلی، اُن کے نامور رفقاء و تلامذہ خاص طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ہندوستان کے ممتاز علماء اور اہلِ فکر و نظر نے کی جو نظامت اور معتمدی کے منصب پر فائز رہے۔ (۱۲)

اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ اور اصول پر تھی کہ نصابِ تعلیم ایک تغیر و ترقی پذیر ذریعۂ تعلیم و تربیت ہے، جس کو زمانہ کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (دینی روح و مقاصد، بنیادی عقائد، اور اساسی علوم کی حفاظت کے ساتھ) بدلتے اور ترقی کرتے رہنا چاہئے، وہ ان کے نزدیک ایک جامد، متحجر (FOSSILIZED) نصاب ہونے کے بجائے، ایک زندہ اور نامی جسم کی طرح زندگی، ترقی، اور وسعت کی صلاحیتوں سے بھرپور ہے، دوسرے الفاظ میں دین ایک ابدی حقیقت ہے، جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے، جس کا نشوو نما ابد جاری رہے گا، اسلام ان کے نزدیک ایک عالمگیر اور جاوداں دین اور زندگی ہے، اس لئے ذہن انسانی کے ارتقاء و تنزل، اور تغیرات کی مختلف منزلوں

سے اس کا سابقہ پڑنا، اور ان بدلے ہوئے حالات و تصورات وافکار میں رہنمائی کا فرض انجام دینا، اور پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو رفع کرنا ایک قدرتی امر ہے، اس کے لئے اس ذریعۂ تعلیم کی بھی (جو اسلام کے نمائندوں اور اس کے شارحین کو تیار کرتا ہے) اپنے دائرہ کو برابر وسیع کرتے رہنے اور اپنی صلاحیت وزندگی کا ثبوت دیتے رہنے کی ضرورت ہے۔

اس احساس اور حقیقت بینی کی بنا پر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور رہنماؤں نے ان یونانی علوم (منطق وفلسفہ) کے اس حصہ کو کم اور بقدر ضرورت رکھا اور اس علم کلام میں بھی حذف واضافہ سے کام لیا، جو درحقیقت یونان کے ان مفروضات اور تعلیمات کی تردید پر مبنی تھا، جو علمی حقائق کے بجائے یونان کی دیومالا (GREEK MYTHOLOGY) پر مبنی تھا، اس کے بجائے جدید علوم میں سے جغرافیہ، تاریخ، ریاضی اور جدید کتابوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انگریزی کی محدود تعلیم داخل نصاب کی، محض کتب تفسیر پر اکتفا کرنے کے بجائے متنِ قرآن کو داخل نصاب کیا۔

ایک بڑا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ عربی زبان کو (جس کی قدیم نصاب میں نمائندہ اور ذریعۂ تعلیم نثر و نظم کے چند مجموعے تھے، جو تصنع و تکلفات سے مملوء اور محض مشکل الفاظ کے سمجھنے اور یاد کرنے کا ذریعہ تھے) ایک زندہ ورواں، تقریر و تحریر، اور دعوت و تاثیر کی قابلیت پیدا کرنے والی زبان کی طرح تعلیم دینے کا انتظام کیا، جس سے وہ افراد تیار ہو سکیں، جو خود اہلِ زبان کو متاثر کرنے اور عالم عربی کے (عصر جدید اور مغربی اقتدار سے پیدا ہونے والے فتنوں اور تحریکات) کا مقابلہ کرنے اور دینِ حنیف کی دعوت دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں، چنانچہ اس کے متعدد

فضلاء نے قومیتِ عربیہ کی زبردست تحریک، جس کے بانی عیسائی عرب تھے، اور جس کا مقصد عربوں کو جاہلیتِ اولیٰ کی طرف واپس لانا تھا، جس میں کفر وایمان، اسلام اور عیسائیت کا کوئی فرق نہیں تھا، اور جس کی طاقتور داعی "**البعث العربی**" کی تحریک اور جس کے بڑے حامی وسرپرست ماضی قریب میں صدر جمہوریۂ مصر جمال عبدالناصر، انورالسادات اور شام کی بعث پارٹی تھی، طاقتور اور نہایت مؤثر مقابلہ کیا، جس کا اعتراف اسلامی الفکر عرب فضلاء اور قائدین نے کیا۔(۱۳)

ندوۃ العلماء کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درسگاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشرواشاعت سیرت نبویؐ کی تحریر وتدوین، اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اُسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا، علامہ شبلی نعمانی کی علمی وادبی تحریرات، اسی طرح ان کے شاگرد رشید وجانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا، موقر اور عالمی شہرت رکھنے والے ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور اہلِ فکر کو متأثر کرنے والا ایسا اسلامی لٹریچر تیار کیا جس کی مثال بہت سے خالص اسلامی اور عرب ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔(۱۴)

اس کے نصاب کے لئے تیار کی ہوئی بعض کتابیں خالص عرب ملکوں کے اسکولوں، کالجوں اور بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں، جو نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء، یہاں کے مدارسِ عربیہ، بلکہ ہندوستان کے لئے ایک فخر کی بات ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ان خصوصیات اور کارگذاریوں سے خود ہندوستان کا عالم اسلامی اور ممالک عربیہ میں اچھا تعارف ہوا، اس کے کارناموں کا اعتراف کیا گیا، اور اس کے فضلاء کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم (ڈاکٹر سر محمد اقبال) نے اپنی بالغ نظری سے اس حقیقت کو دیکھا اور اس کا اعتراف کیا، وہ لکھتے ہیں :۔

> "میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کامیاب ثابت ہو"۔(۱۵)

خود ممتاز ترین فضلائے عرب نے بھی وقتاً فوقتاً اس کے امتیاز کا اعتراف کیا، یہاں پر چند تأثرات وبیانات درج کئے جاتے ہیں۔

علامہ عبدالعزیز تیونسی جو اپنے ملک کے بڑے سیاسی رہنما، عربی کے بڑے فاضل وادیب تھے ۱۹۲۳ء میں ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے دارالعلوم میں اپنی تقریر میں کہا :۔

> "حضرات! عالم اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، اگر آپ اپنی تنظیم کرلیں، تو تمام عالم اسلامی کی بہبودی اور ترقی کا مرکز آپ بن سکتے ہیں، پھر آپ اپنی طاقت سے ایک بار دنیا کا نقشہ پلٹ سکتے ہیں"۔(۱۶)

عالمی شہرت اور اہمیت کے مالک شیخ الازہر الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم

محمود نے بھی اس کا اعتراف واظہار اپنے اس خطبۂ صدارت میں کیا جو ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن منعقدہ ۱۹۷۵ء (۳۱/ اکتوبر ۔ ۲/ نومبر ۱۹۷۵ء) کے موقعہ پر پڑھا:۔

"آج پورا عالمِ اسلام ندوہ کی قابلِ تحسین و آفریں مساعی کا احساس رکھتا ہے، اور نشر و اشاعت کی ان کوششوں اور خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو یہاں انجام دی جارہی ہیں، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے، جو غور و فکر میں مشغول ہیں، اور راہِ خدا میں ہر طرح کی کوشش کررہے ہیں"۔(۱۷)

پچاسی سالہ جشن کے حوالہ سے اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ علمی وبین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی قریبی پچھلی تاریخ میں کسی اجلاس میں بیرونی دنیا کے اتنے فضلاء، خاص طور پر عالمِ اسلام کے اتنے ممتاز علماء، اہلِ فکر و نظر، خطباء اور ذمہ دارانِ مدارس و جامعات ہمارے علم میں ہندوستان نہیں آئے، صرف بیرونی مندوبین کی تعداد (جس میں عرب ممالک کے علاوہ روس وایران کے مندوب بھی تھے) ۷۱ تھی، یہ یاد رہے کہ یہ جشن اس وقت ہوا جب ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ تھی۔

ندوۃ العلماء کو عالم عربی میں جس نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے ہندوستان کا جو وقار واحترام ہے، اس کے سمجھنے کے لئے عصر حاضر کے ممتاز ترین عرب ادیب وانشاء پرداز علامہ شیخ علی الطنطاوی (سابق جج اپیلنگ کورٹ دمشق، وپروفیسر بغداد یونیورسٹی، حال مقیم حجاز) کا یہ تأثر کفایت کرتا ہے، وہ ایک

جگہ لکھتے ہیں :۔

"ندوہ ایک معتدل اور جامع راستہ پر چلنے والا ادارہ ہے، یہ راستہ نہ اپنی منزل سے منحرف ہوا ہے، اور نہ اس نے اس مستقیم راستہ کو چھوڑا ہے، یہ قدیم مدارس جامع ازہر وغیرہ اور جدید جامعات (یونیورسٹیوں) کے درمیان ایک معتدل اور جامع راستہ ہے، جس میں نہ قدیم مدارس کا جمود ہے، نہ جدید جامعات کی جدت پسندی، اس نے ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کیا ہے، اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔

میں ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دے رہا تھا، مجھ سے ٹیلی ویژن کے نمائندہ نے سوال کیا کہ وہ کونسا مقام ہے جس میں آپ اپنی زندگی کے بقیہ ایام صرف کرنا چاہتے ہیں ؟ میں نے کہا کہ میں اگر اپنے شہر (دمشق) کو واپس نہ ہو سکا، اور یہاں بیت اللہ کے جوار میں بھی رہنا نصیب نہ ہوا (۱۸) تو میں لکھنؤ کو ترجیح دوں گا، اور یہ کہ میں ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں قیام کروں، جو ایک پُر فضا محل و مقام بھی ہے، اور وہاں علماء کی صحبت بھی میسر ہے"۔(۱۹)

ہندوستان کے فخر و مسرت کے لئے یہ بات بھی کافی ہے کہ یہاں کی ایک تعلیم گاہ اور عربی درسگاہ (دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی تالیف کردہ عربی زبان وادب کی کتابیں ترقی یافتہ عرب ممالک کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں داخلِ نصاب ہیں، اور یہاں کے بعض فضلاء عالمی (INTERNATIONAL) اسلامی و عربی ادب کی تنظیمات اور انجمنوں کے صدر و سکریٹری ہیں۔(۲۰)

تحریک پیامِ انسانیت

"پیامِ انسانیت" کی تحریک جو وقت کا اہم ترین تقاضہ اور ملک کو (جو وطن و مسکن بھی تھا، اور ایک بلند مرتبہ تہذیب، انسان دوستی، اور روحانی واخلاقی دعوتوں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا تھا) **"خودکشی"** اور غیبی سزاؤں کا مستحق بننے سے بچانے کا ایک کامیاب اور مؤثر ذریعہ بھی تھا، جس کے بغیر اس ملک میں نہ امن وامان اور اعتدال کی زندگی گذاری جاسکتی تھی، نہ کوئی تعمیری، اصلاحی، علمی ودعوتی کام سکون سے کیا جاسکتا تھا، فرقہ وارانہ منافرت، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس، جان ومال، عزت وآبرو کے بے قیمتی، مذہبی واخلاقی تعلیم کے فقدان، اور پریس اور ذرائع لبلاغ کی اشتعال انگیزی نے اس ملک کو ایک میدانِ جنگ میں تبدیل کردیا تھا، جس میں کسی وقت بھی باہمی جنگ کے شعلے بھڑک سکتے تھے، اور کمزوروں، یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں پر بے رحمانہ طریقہ پر ہاتھ اٹھایا جاسکتا تھا، اور اٹھایا جاتا تھا، ضرورت تھی اور وقت کا اہم ترین تقاضا تھا کہ کسی بڑی اصلاحی یا سیاسی تنظیم، یا روحانی وتعلیمی مرکز سے انسانیت کے احترام، جان وعزت وآبرو کی قیمت شناسی، اور محبت وشرافت، قدر واعتراف اور حفاظت باہمی کے ساتھ زندگی گذارنے اور ملک کا نام روشن کرنے کی تحریک شروع ہو، جس سے یہ ملک نہ صرف اپنی حفاظت، نیک نامی بلکہ دنیا اور متحارب ملکوں کو امن ومصالحتِ باہمی کا پیام دے سکے اور عالمی سطح پر ایک بلند کردار ادا کرسکے۔

لیکن مدت دراز سے اور تقریباً تقسیم ملک کے بعد سے اس بارے میں ہر طرف خاموشی تھی، اور اس کوشش یا احساس نے کسی تحریک اور دعوت کی شکل نہیں اختیار کی تھی، جس میں مذہبی جذبہ، خدا کی رضاجوئی کی طاقت وبرکت بھی

شامل ہو، اور انسانی جان اور عزت وآبرو کی قدر شناسی، اور سچی حب الوطنی کا جوہر بھی۔

توفیق الٰہی اور علم دین (جو احساس ذمہ داری اور خدا کے سامنے جواب دہی کا خوف پیدا کرتا ہے) کی کرشمہ سازی تھی کہ یہ تحریک ایک ایسے ادارہ سے شروع ہوئی جس کا کام پڑھنا پڑھانا، علمی، ادبی اور تحقیقی کام انجام دینا اور اپنے دینی بھائیوں کو نصیحت کرنا اور تعلیم دینا تھا، ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے چند افراد نے ۱۹۷۴ء میں تحریک "پیام انسانیت" کے نام سے ایک تحریک اور جدوجہد کام آغاز کیا، اس سے کچھ پہلے ہی جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس کے علاوہ بھی جا بجا نسل کشی اور برادر دشمنی کے واقعات پیش آرہے تھے، رشوت کا بازار گرم تھا، روزمرہ کی زندگی بھی غیر محفوظ ہوتی چلی جارہی تھی، ندوۃ العلماء کے چند ذمہ داروں اور وہاں کے فضلاء نے **"پیام انسانیت"** کے نام سے یہ کام شروع کیا، ملک کے دورے کئے اور ہندوستان کے تقریباً تمام اہم اور مرکزی مقامات میں جلسے کئے، جن میں اس خیال اور تحریک کے ترجمان مسلمان مقررین کے علاوہ اکثریت کے فرقہ کے دانشور اور ہمدرد انسانیت بھی شریک ہوئے، اور مؤثر تقریریں کیں، اور نہ صرف ان مقامات پر بلکہ دور دور ان کا اچھا ردِ عمل اور تأثر ہوا، اب بھی یہ تحریک اس نام سے چل رہی ہے، اور اس میں کی ہوئی تقریروں اور پڑھے ہوئے مقالات کا ایک بڑا ذخیرہ اردو، ہندی، انگریزی اور بعض علاقائی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ (۲۱)

ایک افسوسناک حادثہ اور ملک کے لئے باعث شرمندگی واقعہ

لیکن آخر میں بڑی شرمندگی اور قلق کے ساتھ لکھا جارہا ہے کہ ۲۱ر ۲۲ر نومبر ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں اس عالمی شہرت واعزاز کے ادارہ اور مرکز میں نصف شب (۲ بجے رات) کو ذمہ داروں کے علم واطلاع کے بغیر (جو وہاں موجود تھے) مرکزی پولیس اور انٹلی جنس بیورو (آئی۔بی) کے ایک سیکشن نے ریاستی پولیس کے چند افراد کو ساتھ لے کر (جو یو،پی کی حکومت کے ذمہ داروں کی اطلاع کے بغیر شامل ہو گئے تھے) زبردستی دارالعلوم کے احاطہ میں داخل ہو کر چھاپہ مارا، ان کو ایک ایسے طالب علم کی تلاش تھی، جس کے کسی کاغذ پر اطہر ہاسٹل دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نام لکھا تھا، محض اس خیال سے کہ ایسا کوئی شخص وہاں ہوگا مسلح چھاپہ مارا، وہاں اس کا کوئی نشان نہیں ملا اور کچھ ثابت نہیں ہوا تو انھوں نے ہوسٹل کی تلاشی لی، اور وہاں گولیوں کے کئی ہوائی فائر کیے جن سے دو طالبِ علم زخمی ہوئے، سات طالبِ علموں کو ان کے شبانہ لباس میں موسمِ سرما کی سرد رات میں پکڑ کر لے گئے، لیکن ان سے کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی، نہ ان کا کسی تشدد پسند مخالف حکومت تنظیم سے تعلق نکلا، پھر ریاستی حکومت کے ذمہ داروں بالخصوص وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ جی یادو کی مداخلت اور حکم سے) وہ چھوڑ دیے گئے، اور یہ تفتیشی اقدام بالکل بے نتیجہ اور ناکام ثابت ہوا، افسوس ہے کہ اس اقدام کی وجہ سے جو ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے، اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے والے عالمی ادارہ میں پیش آیا تھا، ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر ملک بدنام ہوا اور ایسا احتجاج کیا گیا جسکی مثال اہم حوادث پر بھی سالہا سال سے نہیں ملتی ہے، ممالکِ عربیہ کے متعدد ذمہ داروں نے بھی اس پر احتجاج کیا، کثرت سے احتجاجی خطوط، فیکس اور تار آئے، اور ٹیلیفون کے پیغامات کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔

خدا کرے ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت ان اقدامات میں احتیاط اور دور اندیشی سے کام لے، تعلیم گاہوں، بالخصوص ان مدارسِ دینیہ و عربیہ کا احترام اور ان کی قدر کرے، جن کی خصوصیات، خدمات، قربانیوں اور کارناموں کا ذکر تفصیل سے اس مختصر رسالہ میں کیا گیا ہے، اور جو ملک کا ایک بیش قیمت سرمایہ، نسلِ جدید کی ایک اہم ضرورت اور بیرونی دنیا میں ہندوستان کے لئے سرمایۂ عزت وافتخار ہے بلکہ قابلِ رشک اور حیرت آور اور لائق تقلید اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔

حواشی:۔

(۱) اس ایثار و قناعت بلکہ قربانی کے چند واقعات اور مثالوں کے لئے مصنف کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" (تاریخی جائزہ) ملاحظہ ہو۔ ص ۱۱۸۔ ص ۱۲۰، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔ (اردو، انگریزی اور ہندی ایڈیشن)

(۲) اور اب بھی مدارسِ عربیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

(۳) اسکی عملی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۲۔ ۱۲۳

(۴) ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۳۔ ۱۲۴

(۵) اس کی روشن تر مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" حصۂ چہارم وحصۂ پنجم، اور اس کا انگریزی ترجمہ (SAVIOURS OF ISLAMIC SPRIT) (Vols. 111&1V)

(۶) ملاحظہ ہو حضرت سید احمد شہیدؒ متوفی ۱۲۴۶ھ۔ ۱۸۳۰ء کا خط مہاراجہ گوالیار اور ان کے افسر افواج کے نام جس میں انہوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف متحدہ جنگ اور صف آرائی کی دعوت دی ہے (سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول ص ۴۰۳، ۴۰۴) انہوں نے نواب امیر خاں (بعد میں والیٔ ریاست ٹونک) کی رفاقت ترک کر دی، جب انہوں نے انگریزوں سے مصالحت کرلی، (سیرت احمد شہیدؒ جلد اول ص ۱۴۶، ۱۴۷)

(۷) ملاحظہ ہو کتاب "کالاپانی" (از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری) ان حضرات کے علاوہ مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی اور مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی، اور یہ سب تعلیمی حلقہ اور مدارس کے لوگ تھے، ملاحظہ ہو تذکرۂ صادقہ (تالیف مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری، ومقدمہ از مولانا ابوالکلام آزاد)

(۸) اس کا مقابلہ سب سے زیادہ مشہور ونامور شاعر لسان العصر سید اکبر حسین الہ آبادی اکبر نے کیا، جو مغربی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور پورے مشرق میں اس پر سب سے بڑے صاحبِ نظر اور طنز نگار تھے، مصر میں بھی ان کا تعارف (راقم کے قلم سے) اور ان کے کلام کے ترجمہ پر ایک کتاب الحضارة الغربية الوافدة واثرها في الجيل المثقف کے نام سے دار الصحوة القاهرة کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(۹) ان میں خاص طور پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۲ء قابلِ ذکر ہیں جن کی شروح حدیث اور علمی رسائل مصر، شام وحجاز میں بڑی وقعت اور عقیدت سے پڑھے جاتے ہیں، اور انکا بلند الفاظ میں اعتراف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) اس کے لئے ان مدارس عربیہ کی مکمل فہرست پیش کرنی مشکل ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" ص ۱۳۴۔ ص ۱۳۶

(۱۱) مولانا کے حالات وسوانح کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" از سید محمد الحسنیؒ شائع کردہ ندوۃ العلماء۔ منصب نظامت کے ذمہ داروں میں ہندوستان کے نامور مصنف، مؤرخ وادیب اور عربی میں ہندوستان کی تاریخ اور شخصیات کے سب سے بڑے مؤرخ اور سوانح نگار مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ اور ان کے فرزند گرامی قدر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کا ذکر کافی ہوگا، جو ایک طرف علماء راسخین میں تھے، دوسری طرف علومِ جدیدہ کے ماہرین اور ممتاز فضلاء میں تھے۔

(۱۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ندوۃ العلماء" (۱۔۲) شائع کردہ دفتر نظامت ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۱۳) اس کا نمونہ جواں سال ادیب وانشاء پرداز سید محمد الحسنی مرحوم کی تحریریں، اور "البعث" اور "الرائد" کے پرچے ہیں، جن کے مضامین سے خود قومیت عربیہ کے داعی مضطرب اور پریشان ہوئے، اور صاحب حمیت وانصاف عرب فضلاء نے ان کی طاقت وبلاغت کا اعتراف کیا۔

(۱۴) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی متعدد کتابوں کا ترجمہ ترکی، فارسی، انڈونیشی، فرنچ، جرمن، روسی اور اب حال میں اسپینی زبان میں بھی شروع ہوگئے، اس کی بعض کتابوں کے (جس کے اردو میں چار پانچ ایڈیشن نکلے ہوں گے) عرب ملکوں میں ۱۵۔ ۱۵ اور ۲۰۔ ۲۰

(۱۵) "اقبال نامہ" ص ۱۶۸، کتاب موسوم "اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں" میں "اسلامی ہند" کے بجائے

اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کے لفظ آئے ہیں ص ۱۸۸

(۱۶) "تاریخ ندوۃ العلماء" حصہ دوم ص ۲۸۰

(۱۷) ملاحظہ ہو "روداد چمن" ص ۱۲۵

(۱۸) علامہ طنطاوی دمشق چھوڑنے کے بعد جو سیاسی وجوہ سے تھا، مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں۔

(۱۹) مقدمہ کتاب "فی مسیرۃ الحیاۃ" ص ۱۳

(۲۰) جیسے رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ اور (CENTRE OF ISLAMIC STUDIES, OX-FORD UNIVERSITY)

(۲۱) یہ رسائل ومقالات "دفتر پیام انسانیت" دارالعلوم ندوۃ العلماء، یا "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" پوسٹ بکس ۱۱۹ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے طلب کئے جاسکتے ہیں۔

(۲۲) جن میں دارالعلوم کے ناظم مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی سابق نائب ناظم اور معتمد تعلیم ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی اور اقامت گاہوں کے متعدد نگراں حضرات شامل ہیں۔

نشانِ راہ

یہ مقالہ ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ ہی
میں ہندوستان کے مختلف مکتب فکر کے
درد مند نمائندوں کے ایک اہم اجتماع میں
پیش کیا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نشانِ راہ

حضرات! اس سے پہلے کہ ہم موجودہ حالات کا جائزہ لیں اور کوئی راہِ عمل متعین کریں، ہم کو اپنے ماضی قریب کا مختصر جائزہ لینا چاہیے، تاکہ ہم کو اس وقت کے مسائل و مشکلات کا صحیح اندازہ ہو اور ہم اس کی روشنی میں صحیح راستہ متعین کر سکیں۔

ماضی کا جائزہ

تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا) ہندستان کی اسلامی تاریخ میں دو فصلوں کے تداخل کا زمانہ ہے۔ ہندستان میں مختلف روحانی طاقتیں اور سیاسی و عقلی عوامل صدیوں سے جن مقابل رجحانات، طبائع اور صلاحیتوں کی پرورش کر رہے تھے وہ تکمیل کو پہنچ گئی تھیں اور اب ان کے درمیان رسہ کشی اور زور آزمائی تھی۔ ایک طرف قدیم اسلامی زندگی کے ترکہ اور دین کے داعیوں اور خادموں کی جاں فشانیوں کے نتیجہ میں امت میں مجموعی حیثیت سے ایمان موجود تھا۔ اور تمام انقلابات کے باوجود عقائد کی بنیادیں محفوظ تھیں، ایمان وثواب اور آخرت کا یقین اب بھی ایسی قوتِ متحرکہ تھی جو امت کی دلدل میں

پھنسی ہوئی گاڑی کے پہیہ کو ہر وقت گھما سکتی تھی، معاصی اور بے دینی پر فخر کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، عملی کوتاہیاں فسق کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھیں، لیکن آنکھوں میں ابھی حیا باقی تھی، قومی ذلتوں کے باوجود دین کی عزت و عظمت دل میں ایسی بسی ہوئی اور گھٹی میں اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ "کافر فرنگی" اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار اور سیاسی عظمت کے باوجود حقارت و ذلت کے لئے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی سیاسی طاقت اور ظاہری آرائش بھی اس کی حقارت پر پردہ ڈالنے کے لئے کافی نہ تھی، قومی خودداری اور احساس برتری بڑی سے بڑی طاقت و وجاہت اور دولت کے سامنے جھکنے سے مانع تھا، آخرت کی سرخروئی اور جنت کا شوق طبیعتوں کے لئے اتنی کشش رکھتا تھا کہ ایک دینی نعرہ بڑے بڑے زاہد رندان بادہ خوار کو اللہ کے راستہ میں بے خود بنانے کے لئے کافی تھا، دین میں سستی تھی، طبیعتوں میں اضمحلال تھا، مگر راکھ کے ڈھیر میں آگ دبی ہوئی تھی جو دین میں رخنہ اندازی کے شبہ سے بھی بھڑک اُٹھتی تھی۔ یہی جذبہ تھا کہ ۱۸۵۷ء میں کارتوسوں میں سور کی چربی کی آمیزش کی افواہ نے سارے ہندوستان میں آگ لگادی اور قوم کے اس عنصر کو سر فروشی پر آمادہ کر دیا جو اپنی ضمیر فروشی اور دینی بے حسی کے لئے مشہور ہے، دین و ایمان کی محبت عوام میں اس درجہ موجود تھی کہ عیسائی مبلغین جو حکومت کے نمائندہ اور مادی ترغیبات اور سیاسی طاقت سے مسلح تھے، مسلمانوں کے ادنیٰ اور جاہل طبقہ میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

دوسری طرف عرصہ سے اس درخت کو جو ابھی زمین پر کھڑا تھا، گھن کھا رہا تھا، مسلمانوں کی قومی سیرت کے محفوظ قلعہ کے اندر بغاوت کے آثار شروع ہو گئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں جعفر و صادق و غلام علی جیسے اشخاص پیدا

ہو چکے تھے، جنھوں نے دنیا کو آخرت پر اور انگریزوں کی اعانت کو اسلام کی حمایت پر علانیہ ترجیح دی تھی اور اپنے حقیر و موہوم ذاتی نفع کے لئے بنے بنائے کھیل بگاڑ دیئے۔ اس کشمکش میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ اپنے رفقاء کے ساتھ میدان میں آئے، انہوں نے دین کے اس بچے کھچے سرمایہ کا جائزہ لیا، جس کی تولیت اس کے سپرد کی گئی تھی، اس سرمایہ کی سب سے بڑی دولت وہ دینی احساس اور حمیت دینی تھی جو ابھی زندہ لیکن روز بروز افسردہ ہو رہی تھی، انہوں نے اس کو متحرک کر کے مسلمانوں کی دبی ہوئی قوتوں کو اس سے اُبھارا اور ان کی منتشر صلاحیتوں کی تنظیم کی، اخلاق و صلاحیتوں کا کچا مال جس نے پڑے پڑے گلنا شروع کر دیا تھا سب طرف سے جمع کیا، مردانگی و سپہ گری، شرافت و حمیت، عالی ہمتی و حوصلہ مندی، جفاکشی و مستعدی، ذہانت و طباعی، علم و تبحر، تصنیف و تالیف، ادب و شاعری میں سے کسی چیز کو حقیر اور اپنے کو اس سے مستغنی نہیں سمجھا۔ بلکہ ان ساری قوتوں کو اللہ کا مال سمجھ کر ان میں ایمان و احتساب کی روح پھونک کر دینی دعوت و اصلاح کے کام میں لگایا، انہوں نے ایمان، حصول ثواب اور رضائے الٰہی کی طمع اور شوقِ شہادت کی قوتِ محرکہ سے جس سے زیادہ طاقتور محرک انسانی علم و تاریخ کے تجربہ میں نہیں آیا۔ اُمت کی گاڑی کے پہیہ کو اس زور سے گردش دی کہ وہ دفعۃً اس دلدل سے نکل آئی جس میں وہ کئی صدیوں سے پھنسی ہوئی تھی، اور پھر اپنی قوت روحانی اور قوت ارادی سے اس کو ڈھکیلتے ہوئے محاذ پر پہنچایا۔ ۱۲۴۶ھ کی ذیقعدہ میں یہ گاڑی بالاکوٹ کی چٹانوں لیکن دراصل مسلمانوں کی بیوفائی اور نااہلی کے پتھروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی، مگر اس کے مسافروں نے حالات کے ساتھ کشمکش جاری رکھی اور جگہ جگہ اپنے مرکز قائم کر لئے۔ صادق

پور کی خانقاہ اور ستھانہ کا مرکز ان میں خالص امتیاز و شہرت رکھتے ہیں۔

سید صاحب کی تحریک کے اس انجام کے بعد میدان میں کوئی اجتماعی دینی کوشش باقی نہیں رہ گئی۔ ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ ہندوستان کی چھ سو سال کی اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، جس کے لئے مسلمان ذہنی طور پر تیار نہ تھے، مسلمانوں نے تذبذب، نفسی کشاکش اور تحیر کے ساتھ اس حادثہ کا استقبال کیا، جس میں نفرت و غصہ غالب تھا جو گروہ زیادہ ذکی الحس اور عجلت پسند تھا اس نے اس انقلاب کے سامنے اپنے ذہن و دماغ کی سپر ڈال دی اور انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب کو مسلمانوں کے درد کا درماں سمجھ کر مسلمانوں کو پوری طاقت کے ساتھ اس کی دعوت دی۔ ان مخلصین نے جو اس وقت دین کے محافظ اور نئے اقتدار کے مخالف تھے اس سیلاب کو روکنے اور انقلاب کا پشتہ باندھنے میں امت کی صلاح سمجھی، اور جب وہ قدرتی طور پر اس طبعی انقلاب کو روکنے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے اپنے علٰحدہ مرکز اور دین و تہذیب کی حفاظت و دعوت کے لئے جا بجا قلعے تعمیر کر لئے جو "**عربی مدارس**" کہلاتے ہیں اور انہوں نے دین و تہذیب کے ایک بڑے حصہ کو اور مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو الحاد و لادینیت سے بچا لیا، لیکن مسلمانوں کے سواد عظیم کو مغربی تہذیب و تعلیم کے اثرات سے نہ بچا سکے۔

انگریزوں کو عہد اقتدار میں مسلمانوں کے دینی احساس و حمیت کو سب سے بڑا امتحان پیش آیا جو کبھی پیش نہیں آیا تھا، انگریزی اقتدار و حکومت اور مغربی تعلیم و تہذیب کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں کے حاسۂ دینی پر پڑتی تھی، اب اس کا مقابلہ ایک منظم غیر دینی طاقت سے تھا، پہلے لادینیت، فسق و فجور اور فحش و عریانی زندگی

کی "**بدعات**" میں شمار ہوتے تھے جن کو قانون اخلاق و معاشرت نے ابھی تک سندِ جواز نہیں دی تھی اب ان کی حیثیت "**دین الملوک**" کی تھی اور اس کی مقبولیت و عمومیت مسلم، پہلے الحاد و تحریف انفرادی اعمال تھے، اب منظم ادارے اور مستقل تحریکات تھیں، اسی طرح حصول معاش کے لئے عقیدہ اور ضمیر کی مخالفت اور بہت سی خلاف دین چیزوں سے چشم پوشی، دنیاوی عروج کے لئے دینی تنز اور بعض فرائض و شعائر دین سے دست برداری کا جواز ایک قومی فتوے کی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا، اس سب کا نتیجہ تھا کہ محسوس و غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کا حاسۂ دینی اپنی ذکاوتِ حس روز بروز کھوتا جارہا تھا اور ان کا قومی مزاج جو دین کے معاملہ میں بہت نازک واقع ہوا تھا، اب بہت لچک پیدا کرتا جارہا تھا اور بڑے بڑے اولوالعزم انسانوں کی زبانوں پر تھا کہ ؎

زمانہ باتونہ ساز دتو باز مانہ بساز

اگر ہمارے پاس پیائش کا کوئی ایسا آلہ ہوتا جس سے دینی حاسۂ کی پیائش ہوسکتی تو حسی طور پر اس حیرت انگیز تنزل کا اندازہ ہوتا جو مسلمانوں کے دینی احساس و حمیت میں ایک صدی کے اندر اندر واقع ہوا ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمانوں کی قوت مدافعت ابھی زندہ تھی، اس نے آسانی کے ساتھ بے دینی کو ہضم نہیں ہونے دیا، ایسے لوگ موجود تھے اور عوام میں باثر تھے جنہوں نے فرنگی کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی، جو مجبوری سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا ہاتھ پاک کرتے تھے، جو کسی انگریزی دربار یا کسی جلوس و اعزاز کے موقع پر غیرت و غصہ میں شہر چھوڑ کر چلے جایا کرتے تھے، جو انگریز شان و شوکت اور انگریزوں کے عروج و ترقی کے مظاہر کے دیکھنے کو بے

حمیتی اور بے غیرتی سمجھتے تھے، اس کی وجہ سے انگریزی تمدن و تعلیم کو قبول عام حاصل کرنے کے لئے طویل مسافت طے کرنی پڑی اور اس کو اس کے لئے زیادہ وقت صرف کرنا پڑا۔

اسی کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن اور اس کا نظام تعلیم ایک دوسرے ملک کی پیداوار تھی جو یہاں کے مزاج و حالت سے موافقت نہیں رکھتا تھا، اس کے راستہ میں کچھ طبعی حجابات بھی حائل تھے اس لئے بھی اس کو یہاں کے مذاق و مزاج سے زیادہ کشمکش کرنی پڑی۔

مزید بر آں انگریزی حکومت کے سامنے کوئی اخلاقی یا مذہبی دعوت نہ تھی اور نہ کوئی زندگی کا فلسفہ یا نظام تھا، وہ کسی تہذیب کی داعی نہ تھی، اس کے جو کچھ تہذیبی اثرات اس ملک میں پھیلے وہ زیادہ تر اس کے سیاسی اقتدار و بالاتری کے نتیجہ کے طور پر یا خود بعض اہل ملک اور مسلمان اہل دعوت کی دعوت و تبلیغ کے اثر سے تھے جو مسلمانوں کی پستی کا علاج یہی سمجھتے تھے کہ وہ حاکم قوم کی تہذیب و تمدن اختیار کر کے کچھ بلندی حاصل کرلیں، ورنہ وہ دراصل ایک دفتری نظام حکومت تھا جس کو صرف اپنی دفتری نظم و نسق سے دلچسپی تھی، اس کے سامنے نہ تو تاریخ کا کوئی دور تھا جس کا احیاء اس کے مدنظر ہو، نہ مستقبل کے لئے ذہن و تہذیب کا کوئی سانچہ بنانا ان کے مقاصد میں تھا۔

نیا دور اور اس کے خطرناک پہلو

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے ایک دوسرا دور شروع ہوا اور مسلمانوں کے دینی حاسۂ، مذہبی زندگی اور تعلیمی و تہذیبی تصورات کو نئے مسائل اور غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ملکی حکومت کے قیام کے ساتھ اگرچہ ذمہ دار سیاسی

جماعت نے غیر مذہبی حکومت ہونے کا اعلان کیا مگر جو لوگ عوام میں زیادہ اثر رکھتے ہیں، وہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کو ایک مجرد سیاسی انقلاب نہیں سمجھتے بلکہ ایک نئی زندگی اور ہندو تہذیب کی نشاۃ ثانیہ سے اس کو تعبیر کرتے ہیں اور برملا و بے پردہ کہتے ہیں کہ تقسیم کے بعد اب اس ملک میں صرف ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان رہے گی، اس میں کسی دوسری تہذیب اور کسی مشترک زبان کی گنجائش نہیں، وہ اتحاد کے بجائے وحدت کی دعوت دیتے ہیں جس میں تہذیبی خصائص کی کوئی تفریق نہ ہو۔

ایک تاریخی حقیقت

اس موقع پر یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس ملک کی زمین اور اس کی تہذیب نے مسلمانوں سے پہلے بیسیوں قوموں کو ان کے قومی خصائص اور دینی شعائر مٹا کر اس طرح ہضم کر لیا کہ اب وہ کوئی جداگانہ وجود نہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ **"وحدت وجود"** اور **"وحدت ادیان"** کا خیال جو ہندو مذہب اور فلسفہ کی روح ہے ایک ایسے دین کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے جس کی بنیاد رسالت و شریعت پر ہو اور جو اس کا قائل نہ ہو کہ **"سب مذاہب ایک ہیں"** بلکہ اس کا قائل ہو کہ **"حق ایک ہے"**۔ ایسا مذہب اور فلسفہ جو تمام مذاہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کرتا ہو کسی دوسرے مذہب کے جاہل عوام اور مرنجاں مرنج قسم کے لوگوں کو تسخیر کر لینے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے، پھر جس تہذیب و تعلیم و نظام زندگی سے واسطہ ہے وہ اسی ملک کی پیداوار ہے، اس لئے قدرتاً اس کے راستہ میں وہ طبعی حجابات حائل نہیں ہیں جو مغربی تہذیب و تعلیم و نظام زندگی کے راستہ میں حائل تھے۔

چند اور حقائق

اسکے ساتھ چند اور حقائق قابل غور ہیں جنہوں نے خطرہ کو اور زیادہ سخت کر دیا ہے ان کا تعلق خود مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے۔

موجودہ نسل کے دینی حاسہ کی کمزوری

جو دینی و تہذیبی ترکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے معاصرین کو ملا تھا، وہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک برابر صرف ہوتے رہنے کے بعد اس نسل کو منتقل ہوا ہے، اس لئے قدرتاً وہ اس مقدار و طاقت و اصلیت میں نہیں ہے جو ہم سے پہلی پشت کو ملا تھا، دینی حاسہ چوٹ کھاتے کھاتے زخمی ہو چکا ہے، قومی مزاج اپنا دینی احساس بہت کچھ کھو چکا ہے اور قوتِ مدافعت مسلسل جد و جہد کرتے کرتے ضعیف ہو چکی ہے، انگریزی دور حکومت و تہذیب نے مادہ پرستی، جاہ پسندی، ابن الوقتی اور قومی بیوفائی کے ایسے پائیدار اثرات چھوڑے ہیں جو ہر معرکہ میں دین اور اصول و اخلاق کی مدافعت کو کمزور اور اس کے قلعہ میں رخنہ ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

محض ایک سیاسی حریف کی حیثیت

یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ انگریزوں کی سیاست اور مسلمان سیاسی قائدین کے مخصوص مزاج نے مسلمانوں کو اس ملک میں محض ایک سیاسی حریف بنا کر چھوڑ دیا جس کے ساتھ گویا نہ کوئی بے غرض و بے لوث دینی دعوت ہے نہ انسانیت کے لئے فلاح و نجات کا کوئی پیغام اور نہ سیاسی حقوق و فوائد سے بلند تر مقصد زندگی، پھر انہوں نے اپنی سیاسی دعوت کو کامیاب بنانے کے لئے جذبات کو اتنا مشتعل کیا کہ مسلمانوں کی طرف سے دماغوں میں کوئی بلند تصور اور دلوں میں ہمدردی کا کوئی جذبہ باقی نہ رہا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی اخلاقی و روحانی

دعوت جس کو اس سیاسی معرکہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں ہے **"حریف"** سے انتساب کی وجہ سے نگاہوں میں حریف بن گئی اور اسلامی دعوت کے لئے بڑی حد تک دل کے دروازے بند ہو گئے۔

بے دلی و نا امیدی

دوسری طرف مسلمانوں کے جذبات اور جوش کے مسرفانہ استعمال سے ان کو یہ نقصان پہونچا کہ وہ تھوڑے دنوں میں اپنا ذخیرہ ختم کر کے افسردہ و پژمردہ ہو گئے۔ چڑھے ہوئے دریا کے اتار پر جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس طوفانی و بحرانی دور کے خاتمہ پر نظر آتی ہے، ہر طرف بے دلی و نا امیدی، شرمندگی اور بے اعتمادی کے آثار نظر آتے ہیں، پھر فسادات اور ہنگاموں نے اور آخر میں سیاسی رہنماؤں کے فرار نے ان کے دل بجھا دئے اور ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے بالکل نا امید کر دیا اور ان میں اپنے دین و تہذیب کی طرف سے ادنیٰ مدافعت اور اس پر کم سے کم استقامت کی بھی ہمت نہیں رہی. ان میں ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو کسی امتیاز و تشخص اور فرقہ کے ادنیٰ انتساب سے اس طرح گھبرانے لگے جس طرح سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی بھاگتا ہے، پھر احساس کمتری جو قوموں کے حق میں تپ دق کی خاصیت رکھتا ہے اور جو ۱۸۵۷ء کے کچھ عرصہ کے بعد پیدا ہوا تھا، ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد پیدا ہو گیا جو قوم ایمان و یقین کی طاقت بہت کچھ کھو چکی، جس کی رگ و پے میں خوف و دہشت سرایت کر گئی جو اعداد کی طاقت پر ایمان لائی تھی اور جس کے نزدیک ایمانی طاقت اور غیبی نصرت کے بجائے زندگی میں صرف ریاضی کے جامد اصولوں کی فرمانروائی ہے اور جو اسلامی دعوت کی اس معجزانہ طاقت سے بے خبر ہے، جس نے مسلمانوں کے فاتح تاتاریوں کو اسلام کا مفتوح بنا دیا اس

قوم کی ناامیدی و بے دلی موجب حیرت نہیں۔

حالات کا روشن پہلو

حضرات! ہم نے ماضی اور حال کا جو صحیح اور واقعی نقشہ پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر کچھ عجب نہیں کہ مایوسی کی ایک لہر ہمارے دلوں میں دوڑ جائے اور ہم کو مستقبل میں بھی اندھیرا اور مسلمانوں کے وجود ملی کے لئے سخت خطرات نظر آئیں ۔لوگوں کی زبان پر عرصہ سے ''**اندلس**'' اور ''**بخارا**''، ''**سمرقند**'' کے نام بھی آنے لگے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی واقعات کا ایک ایسا درخشاں پہلو ہے اور مستقبل میں کچھ ایسی روشنیاں نظر آتی ہیں کہ ہمارا دل نئی زندگی اور دماغ تازہ روشنی سے معمور ہو جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کے مٹنے کے بجائے اس کی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز کے آثار ہیں، اس موقع پر بے اختیار ہماری زبان پر قرآنی الفاظ آتے ہیں کہ :

وَ عَسَیٰ اَنۡ تَکۡرَھُوۡا شَیۡئًا وَّھُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ (البقرہ ۲۱۶) اور شاید تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تم کو۔

دبیز پردے چاک ہوئے

ابھی تک امت کی داعیانہ حیثیت پر ایسے تہ بہ تہ حجابات پڑے ہوئے تھے جن کا اٹھنا بہت مشکل نظر آتا تھا، اس حیثیت کو اس کی نظر سے او جھل کرنے والی اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانے والی اتنی چیزیں تھیں کہ صدیوں یہ پردہ چاک نہ ہو سکتا۔ سیاسی اقتدار، منصبوں اور عہدوں کی کشش، اس ملک کے دفتری نظم و نسق میں اپنے حصہ رسدی کے حصول کی کوشش یہ وہ طاقت ور ترغیبات اور دلفریب مقاصد تھے جن کے سامنے کوئی تبلیغ و دعوت یا استدلال کارگر نہیں ہوتا تھا، لیکن

اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے ایک اشارہ نے دفعتاً یہ پردہ چاک کر دیا اور مسلمانوں کو حالات نے اچانک ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا جہاں دین کے سوا کوئی روشنی، ایمان وتوکل کے سوا جینے کا کوئی سہارا اور اسلامی دعوت کے سوا پناہ کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی، یہ وہ نادر موقعہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی پر نظر ثانی کریں اور اپنی غلط اور کمزور حیثیت کو ختم کر کے صحیح اور طاقت ور حیثیت اختیار کر لیں اور یوں سمجھیں کہ آج سے ہندوستان میں ان کی اصلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ان کی حیثیت اب اس ملک میں ایک سیاسی حریف یا معاشی رقیب کی نہیں ہے جس کو اپنی تعداد اور حیثیت کے لحاظ سے خدمت وما تحتی کے کچھ مواقع ملنے چاہئیں، بلکہ ان کی حیثیت ایک بے لوث داعی کی ہے جو اپنے فوائد ولذائذ کے حصول کے لئے نہیں، بلکہ نسل آدم کے مفاد کے لئے آیا ہے :۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ - (ال عمران-۱۱۰) تم بہتر سب امتوں سے ہو، جو پیدا ہوئے ہو لوگوں کے لئے۔

جو تمام قومی وملکی تعصبات اور ذاتی ونسلی اغراض سے بالا تر ہو کر انسانوں کو زندگی کے اندھیروں سے نکال کر وحی ونبوت کے اجالے میں، انسانوں کو انسانی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں، مذاہب اور خود ساختہ نظاموں کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں سے نکال کر دین وحق کے عدل وانصاف میں داخل کرنے کے لئے آیا ہے، وہ مادیت، خود غرض اور نفس پروری کی کانٹوں بھری راہ بلکہ انگاروں بھری چتا سے اٹھا کر صحیح روحانیت واخلاق، بے غرضی وایثار اور خدا پرستی کی اس جنت میں داخل کرنے کے لئے آیا ہے۔ جس میں کوئی غم اور کوئی کھٹکا نہیں، وہ اس محدود دنیا اور اس کی محدود زندگی کی چند روزہ تگ ودَو، اس کی ناقص

ترقیات، اس کی پست حوصلہ مندیوں سے بلند ہونے اور عالم مادّی کے اس تاریک قید خانہ سے نکل کر جس کی پوری وسعت بھی تنہا ایک انسان کی آزادانہ پرواز کے لئے کافی نہیں، ان لامتناہی فضاؤں اور روح و قلب کی ان وسعتوں میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے جس میں انسان کو بے تکلف پرواز کرنے، اس کے جوہر انسانیت کو چمکنے، اس کی دبی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو پوری طرح ابھرنے اور فانی انسان کو غیر فانی بننے کا پورا موقع ملتا ہے۔ اس کا پیغام ہے :۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلاَّ نَعْبُدَ اِلاَّ اللّٰہَ وَلَانُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًاوَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ . (آل عمران. ٦٤) آؤ ایک سیدھی بات پر ہمارے تمہارے درمیان کی، کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی، اور شریک نہ ٹھہرائیں اس کی کوئی چیز، اور نہ پکڑیں آپس میں ایک ایک کو رب سوا اللہ کے۔

یہی تنہا وہ پیغام ہے جس سے ایک ہی ملک کی نہیں بلکہ سارے عالم کی شبِ تاریک سحر ہو سکتی ہے۔

عالم کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

اور ایک مرتبہ اسی "**اذانِ سحر**" سے اس عالم کی قسمت جاگتی تھی اور اب بھی اس کے بغیر جہاں کہیں کچھ روشنی نظر آتی ہے وہ "**مکرِ چاندنی**" ہے صبح صادق نہیں۔

زندگی کی ضمانت

یہ دعوت اللہ تعالیٰ کی وہ محبوب دعوت ہے جس کی خاطر اس نے اپنے قوانین قدرت میں تغیر کر دیا ہے، اشیاء سے ان کے خواص سلب کر لئے ہیں اور

کبھی ان کی فطرت کے خلاف خواص نقش دیئے ہیں، آگ کو گلزار اور سمندروں کو پایاب کردیا ہے، پہاڑوں کے راستہ میں آئے ہیں، تو ان کو سرنگوں ہونا پڑا ہے۔ سمندر اور بہتے ہوئے دریا راستہ میں پڑ گئے تو انکو راستہ دینا پڑا ہے۔ قیروان کی تاریخ شاہد ہے کہ اژدہوں اور خونخوار درندوں سے اس کے کام میں رکاوٹ محسوس ہوئی ہے تو ان کو جنگل چھوڑ کر چلا جانا پڑا ہے، یہ دعوت قوموں اور جماعتوں کے حق میں "**آبِ حیات**" ہے، جس نے اس کا کوئی جرعہ پی لیا اس پر موت حرام ہے، اگر مسلمان اس دعوت کے علمبردار ہیں اور انہوں نے اپنے وجود کو اس دعوت کے وجود میں اس طرح گم کردیا کہ ان کی زندگی اس دعوت کی زندگی کے مرادف ہوگئی تو فنا ان کے لئے محال اور بقا ان کے لئے مقدر ہے

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاشِ سرِّ کلیم و خلیل

اسلامی دعوت کے لئے آج بھی زمین ہموار ہے

اس پیغام کی صداقت وبلندی اور اس کی قوت نیز ہر قسم کے مواقع ومشکلات، ہر طرح کی مخالفتوں، رنجشوں، شکایتوں اور غلط فہمیوں پر غالب ہے، اس کے راستہ میں نہ پہاڑ حائل ہیں، نہ دریا، نہ وطنیت وقومیت کی آہنی دیواریں، نہ طبقات کا تفاوت، نہ رنگ ونسب کا اختلاف، اس سے ہر زمانہ میں معجزات کا ظہور ہوتا رہا ہے اور کعبہ کو صنم خانہ سے پاسباں ملتے رہے ہیں، اس وقت جہاں اس کے راستہ میں مسلمانوں کی غلطیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے تعصبات کی بڑی بڑی دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں وہاں قدرت الٰہی نے اس کا راستہ صاف کرنے میں بھی کمی نہیں کی ہے، انسانی نظاموں اور فلسفوں کے پے در پے ناکامی زندگی کی گرہ کو

سلجھانے کی ہر نئی کوشش کے بعد اس کی صدہا نئی الجھنیں، آزادی و حکومت، خود اختیاری کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو جانے کے بعد اہل ملک کی اصلی آسائشوں اور راحتوں سے محرومی، علم واخلاق اور دولت وانسانیت کا افسوسناک عدم توازن، اہل اختیار کا عدم احساس، امانت وذمہ داری عوام وخواص، تجار وملازمین کی بڑھی ہوئی دولت کی ہوس اور معاشی جوع البقر جس نے ملک کو رشوت ستانی، چوربازاری اور نفع اندوزی کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا ہے اور جس کے انسداد کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، یہ سب روز مرہ کی وہ حقیقتیں اور مشاہدات ہیں جنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اس زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے کہ اس کو ہزار بار کھسکانے اور اس میں اُلٹ پھیر کرتے رہنے سے بھی کام نہیں چلتا، اس میں کوئی ایسی چیز کم ہے جس کی کمی دوسری چیز کے اضافہ سے پوری نہیں ہوتی، وہ ہے اللہ پر ایمان اور اس کا جلوت وخلوت میں خوف، آخرت کا یقین اور بازپُرس کا کھٹکا اور پیغمبر معصوم ﷺ کی کامل پیروی اور زندگی کے تمام مسائل ومعاملات میں اس کا اتباع یعنی مختصراً ''اسلام''۔

اسلامی دعوت کی اندرونی طاقت

اس پیغام کا سرچشمہ دو چیزیں ہیں، قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت، ان دونوں میں وہ موہنی ہے جو دشمن کو دوست اور پتھر کو موم کر دے، وہ اندر اندر اپنا راستہ اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، دلوں کو گھلا کر اور محبت کو پگھلا کر اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں اور پھر جسم کے ریشہ ریشہ میں اس طرح سما جاتے ہیں کہ:

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

یہ طاقت آج بھی معجزے دکھا سکتی ہے

صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ ان کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ہر انسان ان کو اپنی چیز اور اپنے درد کی دوا سمجھے، دوسرے یہ کہ ان کو مسلمانوں کی غلطیوں اور خواہشوں سے الگ کر کے پیش کیا جائے اور اپنی کوتاہیوں کے اعتراف میں ذرہ برابر بھی تامل نہ کیا جائے، اگر محبت و حکمت کے ساتھ یہ دو چیزیں پیش ہوں تو آج بھی یہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے اور دریاؤں کا رخ بدلنے کی طاقت رکھتی ہیں۔

اس طاقت سے کام لینے کے چند طریقے

اس سلسلہ کا ایک کام تو یہ ہے کہ ان دو چیزوں کو مؤثر و دل آویز طریقہ پر پیش کرنے کے وہ سب معقول و مفید ذرائع اختیار کئے جائیں جو ممکن ہوں، مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب اور روزمرہ کی حقیقتوں، مشاہدوں اور زندگی کی بے نظمیوں سے ایمان اور پیغمبروں کی رہنمائی کی ضرورت کا احساس دلایا جائے۔ قرآن مجید کے اثر آفریں انتخابات اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے پُر اثر واقعات پیش کئے جائیں، اگر مقرر حالات و نفسیات سے واقف ہے اور آسان زبان اور قرآن وسیرت کی تفہیم و تلخیص پر قادر ہے تو یہ کوشش بہت کامیاب ہو سکتی ہے۔

دوسری ضرورت اس کی ہے کہ اس موضوع پر ہندی اور انگریزی میں آسان مگر طاقتور ادبی زبان اور دل نشین اور مؤثر پیرایہ بیان میں چھوٹی اور متوسط کتابیں دل آویز و جاذب نظر طریقہ پر شائع کی جائیں اور ان کے موضوع و مضامین میں اتنا تنوع اور کشش ہو کہ وہ اپنی طرف متوجہ کر سکیں اور ذوق پر بار نہ ہوں، ان کی قیمتیں ممکن حد تک کم ہوں، ان کی اشاعت اتنے بڑے پیمانے پر ہو کہ کوئی

دار المطالعہ، ریلوے بک اسٹال اور کتب فروش کی دوکان ان سے خالی نہ ہو، پھر اس کے علاوہ نجی طور پر بھی غیر مسلم دوستوں، افسروں اور ماتحتوں اور محلہ داروں کو پیش کی جائیں اور ان کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔

تیسری ضرورت اس کی ہے کہ ہندی اور انگریزی میں کچھ اچھے لکھنے والے ہوں جو ہندی اور انگریزی کے رسالوں میں اسلامی موضوعات پر وقتاً فوقتاً مؤثر اور وقیع مضامین لکھتے رہیں، خالص غیر مسلموں کے حلقہ میں کسی ہندی یا انگریزی دعوتی رسالہ کے اجراء کے مقابلہ میں بھی یہ طریقہ زیادہ مؤثر اور آسان ہے لیکن اس کے باوجود بھی چند مستقل ہندی اور انگریزی کے رسالوں کے اجراء کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ اشاعت کا یہ کام سرمایہ اور وقت کا طالب ہے، لیکن اس میں کس کو کلام ہوگا کہ مسلمان کے مال، وقت اور قوت کا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ ضروری کوئی مصرف نہیں، اگر مسلمان اہل استطاعت اس میں بخل سے کام لیں اور اپنے مال اور وقت کو اس سے زیادہ عزیز سمجھیں تو سوائے قرآن مجید کی اس تہدید کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ. وَاللّٰهُ لَايَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ. (التوبة ۲٤) تو راہ دیکھو، جب تک بھیجے اللہ حکم اپنا اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

اور جس وقت سے ڈرلیا گیا ہے وہ وقت تو بہت جگہ ہمارے ملک میں آچکا ہے جہاں عمر بھر کی اندوختہ دولت لمحوں میں لٹی اور پھنکی اور وہی دولت جس سے اعلاء کلمۃ اللہ میں بخل کیا گیا تھا گلے کی پھانسی بنی ہے اور:

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا

مَاكُنتُم تَكنِزُونَ. (التوبة. ۳۵) پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں، یہ ہے جو تم گاڑتے تھے اپنے واسطے، اب چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔ کا منظر قیامت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے دکھادیا ہے۔ اس لئے بالکل حقیقت قرآن مجید کا اعلان اور تاریخ کی مسلسل و متواتر تصدیق و شہادت ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا دولت کی بھی حفاظت ہے اور اس سے بخل کھلی ہوئی خودکشی:

وَاَنفِقُوا فِی سَبِیلِ اللهِ وَلَاتلقوا بِاَیدِیکُم اِلَی التَّهلُکَةِ وَاَحسِنُوا اِنَّ اللهَ یُحِبُّ المُحسِنِینَ. (سورة البقر. ۱۹۵) اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں، اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں اور نیکی کرو اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو۔

حالات وحوادث کے تازیانے

حضرات! موجودہ غیر معمولی حالات اور حوادث جن کو "**اتفاقات**" کے بے معنی لفظ سے یاد کر کے ان کی اہمیت کو ضائع نہیں کیا جاسکتا، صاف بتلا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے اس موجودہ جاہلی طرز زندگی سے جس میں دعوت کی روح، دین کے لئے جدوجہد وایثار، آخرت کی فکر، اور ایمانی زندگی کی کیفیات نہ ہوں، ہرگز راضی نہیں، یہ بھی اس کی خاص رحمت اور اس امت کے ساتھ خصوصیت ہے کہ وہ ان کو اس طرز زندگی پر زیادہ دن تک قائم نہیں رکھنا چاہتا، کسی ایک ہفتہ کے واقعات یا کسی ایک ہی دن کا اخبار دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گویا مسلمان ہر جگہ جھنجھوڑے اور جگائے جارہے ہیں، اور مختلف قسم کے اشارات اور خطرے کی علامات ان کی تنبیہ و عبرت کا سامان کر رہے ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ امت کے لئے ایک زندگی سے دوسری زندگی کو منتقل ہونے کا مرحلہ یادور آپہنچا سامنے آگیا ہے اور عالمگیر پیمانہ پر ان میں تبدیلی وانقلابات کا سامان ہو رہا ہے اور ان

کو اپنا منصب و مقام یاد دلایا جارہا ہے۔ دنیا میں جابجا خصوصاً ہمارے ملک میں ان واقعات کا اثر پڑرہا ہے اور مسلمانوں میں اپنے مقصد زندگی اور اصل مشغلۂ زندگی کی طرف بازگشت کے کچھ آثار ضرور ہیں۔

عام مسلمانوں کا جمود اور دینی زندگی سے بُعد

لیکن اس کے برخلاف عام مسلمانوں کی عام آبادی کا طرز زندگی، دنیاوی انہماک اور خود فراموشی سخت تشویش کا باعث ہے، زندگی کا یہ طرز، کہ سوائے زندگی کے مادی ضروریات کی تکمیل اور اپنی شکم پُری اور بچوں کی پرورش یا حصول و دولت کے زندگی کا کوئی بلند مقصد، بہتر مشغلہ اور بڑی فکر نہ ہو، زندگی سر تاپا ایمان واحتساب کی روح سے خالی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے جذبہ سے عاری ہو، اس میں دین کی ترقی، تعلق باللہ کے استحکام، دینی واقفیت کی زیادتی اور ایمانی کیفیت کے حصول کی کوئی خواہش نہ ہو، طلبِ علم وذکر کا کوئی خانہ نہ ہو، دین کے لئے حسبِ استطاعت جدوجہد اور اس کے لئے تفکر سے دن اور راتیں، مشغولیت اور فرصتیں یکساں محروم ہوں، دینی محبت والفت اور اسلامی اخوت کے مناظر سے مجلسیں اور اجتماعات ویران ہوں، تعارف وارتباط اور تعاون علی البر والتقوی کی روح سے جماعت بے بہرہ ہو، دینی دعوت، اس کے لئے نقل وحرکت، اس کے لئے تواضع وخوشامد، اس کے لئے ایثار وجفاکشی سے زندگی خالی ہو، غرض مختصر لفظوں میں جن مقاصد کے لئے مسلمانوں کی بعثت ہوئی ہے اور ان کی نسل اول میں جو کیفیات ومناظر آتے ہیں ان کی جھلک ان کی زندگی میں بالکل نظر نہ آئے، یہ وہ طرز زندگی ہے جو ایک اچھے خاصے آزاد اسلامی ملک کو اندلس بنا سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ ملک جہاں مادی زندگی کے دروازے روز بروز بند ہوتے جاتے ہوں اور جہاں صرف

ایمان و عمل صالح کی زندگی اور دعوت الی اللہ کا انہماک ہی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے نیاز بارگاہ میں اس امت کی بقا اور زندگی کی سفارش کر سکتا ہو۔

دینی زندگی کے احیاء کا فطری اور عملی راستہ

ظاہر ہے کہ ان مقاصد و خصوصیات کا بنا بنایا ماحول آج اسلامی ملکوں میں بھی موجود نہیں، اور دعوت و حرکت اور طلبِ علم و ذکر کی یہ زندگی خالص اسلامی آبادیوں میں بھی پائی نہیں جاتی، اس کے لئے ہر جگہ اہتمام اور جد و جہد کرنی ہو گی، اس کے لئے کم سے کم ایک ایسا وقتی اجتماع اور ایک ایسا عارضی ماحول قائم کرنا ہو گا جس میں مسلمانوں کو شرکت کی عمومی دعوت دی جائے، جس میں شریک ہو کر مسلمان اپنی زندگی کے اصل مقصد اور اپنے عمر کے حقیقی مشغلہ کو معلوم کر سکیں، جس میں اپنی گم شدہ زندگی کا سراغ پا سکیں، جہاں آکر پچھلی بے سوز و بے کیف زندگی اور غفلت کے اوقات کی گرد جھاڑ سکیں، جہاں سے آنے والے اوقات اور مشغولیت کے لئے نئی توانائی، نئی تازگی اور ایمان واحتساب کی نئی طاقت حاصل کر سکیں جس کی وجہ سے وہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (النور ۳۷) وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے، اور نماز کھڑی رکھنے سے، اور زکوۃ دینے سے، ڈر رکھتے ہیں اسی دن کا، جس میں الٹے جاویں گے دل اور آنکھیں۔

کا مصداق بن سکیں، جہاں سے دین کی ترقی کی فکر اور اس کی ایسی خلش اپنے ساتھ لے جا سکیں جو ان کو اپنے معاشی انہماک اور دنیاوی کاروبار میں غافل و خود فراموش نہ ہونے دے، جہاں سے ان کے ایمانی جذبہ کو قوت اور غذا ملتی رہے، جہاں سے وہ

شعائرِ اسلامی اور اسلامی تہذیب کے خصائص کی اہمیت کو محسوس کرتے رہیں جو ان کو کسی اور سواد میں گم ہونے سے روکے، جہاں ان کو اپنے دینی بھائیوں کے خلوص و محبت اور جذبہ خدمت کا تجربہ ہو اور خود ان کو اپنے ان جذبات کی پرورش اور ان کے اظہار کا موقع مل سکے، جہاں وہ ایثار و جفاکشی کی عادت ڈال سکیں اور ان میں اپنے مالوفات اور عادات سے علاحدہ ہونے کی خو اور ہمت پیدا ہو سکے۔ جہاں ان کو خود اپنی صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں کا احساس ہو سکے۔ جہاں ان کی نگاہ میں آخرت کی زندگی کی قیمت بڑھتی اور دنیا کی زندگی کی قیمت گھٹتی رہے اور اس کے لئے ان میں وہ جذبات زندہ ہوتے رہیں اور اس کے راستے اور طریقے ان کو معلوم ہوتے رہیں۔

حضرات! آج مسلمانوں میں غفلت اور دینی بے حسی کا جو بحر الکاہل پھیلا ہوا ہے اس میں آخر تموج و اضطراب پیدا کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ اور اس بڑی مسلمان آبادی کی (جس کو خود کوئی طلب اور احساس نہیں) دینی تربیت کا کیا راستہ ہے، کتابوں اور رسائل کی اشاعت، دینی مدارس کے قیام و تاسیس، انجمنوں مواعظ و تقاریر سے انکی آزمودہ و مسلم تاثیر و نفع کے باوجود وہ نتائج، وہ تغیرات، اور وہ اندرونی کیفیت حاصل نہیں ہوتی جو ایک زندہ روحانی ماحول کی خصوصیت ہے، ان تمام اداروں سے جن کا اوپر تذکرہ ہوا، جو دینی و تربیتی نتائج حاصل ہوتے ہیں ان میں نہ اتنا عموم اور پھیلاؤ ہوتا ہے نہ اتنی گہرائی جو ایک دینی زندگی سے (خواہ وہ کتنی محدود و مختصر ہو) حاصل ہوتی ہے، پھر اس کے لیے نہ کسی سرمایہ کی ضرورت ہے، نہ کسی ادرہ کی، تقریباً ہر شہر و قصبہ میں ابھی ایسے اہل علم و اہل دین موجود ہیں جو ایسے وقتی دینی مرکز و اجتماعات قائم کر سکتے ہیں، ان کے کمالات اور ان

کی قوتیں اور ان کا کچھ علم عوام کی بے حسی اور کچھ لاعلمی اور کچھ ان حضرات کی افسردگی وناامیدی یا بے تعلقی وعلاحدگی کی وجہ سے ضائع ہو رہا ہے۔ اسی طرح عوام کا جذبہ دینی اور ان کی صلاحیتیں بھی تلف ہو رہی ہیں۔ ان دونوں کو کارآمد اور اس کو اسلام کی ترقی کے لئے قوت کہربائی بنانے کی صورت یہی ہے کہ ان دونوں تاروں کو ملادیا جائے اور عوام میں دین کی طلب اور قدر اور خواص میں عوام کی حالت کا درد وترحم پیدا ہو جائے، اور دونوں طبقے خالص دینی رشتہ اور خدمت دین کے جذبہ سے ایک دوسرے کی اعانت کے لیے ایک جگہ جمع ہو جایا کریں۔

پھر آج بڑے پیمانہ پر ارتداد کے جو خطرے پیدا ہو گئے ہیں اور خطرات سے گزر کر جو واقعات پیش آرہے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی کا جو پھیلاؤ ہے، اس کے پیش نظر دین کی حفاظت اور دینی زندگی کے اشاعت کی اس کے سوا اور کیا صورت ہے کہ شہروں اور قصبات کی عام مسلمان آبادی اس ضرورت کی طرف توجہ کرے اور اس کو اپنی اصلاح وتربیت اور دین کی حفاظت کا مشترک کام سمجھے۔ اس مقصد کے لیے جس وسیع عملہ کی ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان حکومت بھی اس کا انتظام نہیں کر سکتی، کروڑوں کی آبادی میں چند ہزار نفوس کیا تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں؟ اس کی صورت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ان اجتماعات اور عام دعوت کو اس ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ سے اس مقصد کے لیے وقت حاصل کیا جائے، مرکز کی طرف سے مہینہ کے کچھ دن مقرر ہوں جس میں اس اجتماع کے شرکاء اپنے مشاغل سے وقت نکالیں۔ ان کی جماعتیں شرعی نظام کے تحت شہروں قصبات اور دیہاتوں کی طرف بھیجی جائیں۔ شہروں میں وہ شہریوں کے مزاج وحالات کے مطابق دین کی دعوت دیں اور وہاں کے مسلمانوں کو

اجتماع کرنے، اہل دین کو اس کی سرپرستی کرنے اور پھر ماہوار جماعتیں نکالنے پر آمادہ کریں اور وہاں کے خصوصی اور ملک کی عمومی دینی ضرورتوں اور دین کے لیے قریبی خطرات کی طرف متوجہ کریں اور دیہاتوں میں وہاں کی دینی سطح اور ضروریات کے تقاضہ کے مطابق دین کے مبادی و مہمات کی تلقین کریں اور ان میں دینی احساس اور عملی تبدیلی کی دعوت پیش کریں اور ان کو قریب تر مرکز سے تعلق اور وہاں کے اجتماعات میں شرکت کرتے رہنے کی تاکید کریں اور اس مرکز اور وہاں کے ان مضافات میں عملی رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔(۱)

ہم ایک مدت سے اس نظام کو تجربہ کر رہے ہیں اور الحمد للہ روز بروز ہمارا اطمینان بڑھتا جا رہا ہے کہ اگر عمومی طور پر یہ نظام جاری ہو جائے۔ شہر شہر اور بڑے قصبات میں ایسے مرکز قائم ہو جائیں اور ان کی نگرانی اور کسی بڑے مرکز سے جہاں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اصول سے واقف لوگ موجود ہوں، ان کا ربط قائم ہو جائے اور وہاں سے آمد و رفت کا سلسلہ اور "**طالبین علم و دین**" کے ان قافلوں کی نقل و حرکت شروع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ اسلام کا دینی مستقبل محفوظ ہے بلکہ دینی حیثیت سے یہاں کا حال ماضی سے اور مستقبل حال سے اصل اسلامی زندگی سے زیادہ قریب اور دینی روح اور اس کے اصلی کیفیات و خصائص سے زیادہ معمور ہوگا۔

آزاد اسلامی درسگاہوں کی ضرورت

حضرات! ان سب کے باوجود ایک صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب اُمت کی حیثیت سے مسلمانوں کا وجود خالص اسلامی سلطنت میں بھی دینی تعلیم اور

کتاب و سنت سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں، چہ جائیکہ ایسے ملک میں جہاں کا نظام تعلیم اور نظام زندگی مطلقاً غیر مذہبی یا کم سے کم غیر اسلامی بنیادوں پر قائم ہو۔ امت کا رشتہ اسلام کی تعلیمات اور بعثت کے مقاصد سے قائم رکھنے کے لئے اور اس کے عروق زندگی میں صحیح اور توانا خون کے دوران کو جاری رکھنے کے لئے ایسی آزاد اسلامی درسگاہوں کی ضرورت ہے، جن سے مسلمان اپنے دینی سرچشموں سے سیراب ہوتے رہیں اور ان کی دینی نگرانی اور شرعی احتساب کا فرض انجام دیں اور امت کو کسی اجتماعی انحراف اور دینی تحریف سے بچاتے رہیں۔

اسلامی مکاتب اور دینی مدارس کے نہ ہونے سے بڑے پیمانے پر ذہنی اور تہذیبی ارتداد کا خطرہ ہے اور اب خالص مشرکانہ نصاب تعلیم کی وجہ سے یہ خطرہ واقعات بن کر سامنے آگیا ہے۔ انگریزی سلطنت کے قیام کے ساتھ دفتری نظم ونسق میں دخیل ہونے کی طمع اور سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کی کشش نے خالص دینی اور آزاد درسگاہوں کی زندگی کو متزلزل کر دیا تھا اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی نگاہ میں ان مدرسوں کا وجود جو سرکاری ملازمتیں دلانے سے قاصر تھے، بے سود اور بے معنی ہو کر رہ گیا تھا، اور وہ مسلمانوں کی زندگی میں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب نئے حالات وانقلاب سے یہ طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ سرکاری نظام تعلیم اور دنیاوی ترقی اور روزگار لازم وملزوم نہیں رہے، اب مسلمانوں کو اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنا ہے، اسی کے ساتھ نئے تغیرات اور سیاسی انقلاب نے آئندہ نسل کی اسلامیت کے راستہ میں نئے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ (۲) دنیا کی کوئی قوم کسی ریاست کی سرپرستی اور امداد کے سہارے اپنی تعلیمی ضرورتوں اور مذہبی زندگی کی بقا کا انتظام نہیں کر سکتی، اس کے لئے اس کے ارادہ، فیصلہ اور جدوجہد کی

ضرورت ہے اور اگر اس کی رائے عام اس بارے میں منظّم، اس کا فیصلہ اٹل، اور اس کا احساس قوی ہے تو کوئی طاقت اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ تاریخ ماضی میں اور معاصر قوموں کی زندگی میں بھی اس کی متعدد نظیریں ہیں کہ ان قوموں نے حالات کی ناموافقت اور سرکاری امداد کی غیر موجودگی میں بھی اپنی آزاد تعلیم کا بندوبست کیا اور اپنے مذہب اور اپنی زندگی کے اصل سر چشموں سے اپنا اتصال قائم رکھنے میں وہ کامیاب رہیں۔

لیکن اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مادی ایثار اور دینی تعلیم سے حقیقی وفاداری اور مخلصانہ تعلق کا عملی اظہار و ثبوت، یعنی اس کے راستہ میں ضروری معاشی قربانیاں اور خطرات کا تحمل جو بعض اوقات پیش آسکتے ہیں اور جن کا گوارا کرنا ضروری ہوتا ہے، دوسرے زمانہ کے حقیقی تقاضوں کا اعتراف اور اس کے جائز مطالبات کی تکمیل یعنی نظام تعلیم کے سلسلہ میں ضروری اجتہاد اور اس کی اصلاح و ترقی، اور اس کو زیادہ مفید اور مؤثر اور عملی زندگی اور خارجی دنیا سے اس کو ہم آہنگ بنانے کے لئے بار بار کوشش، اس بارہ میں دین کے اصول و ارکان اور اس کے روح و مزاج کی حفاظت کے معاملہ میں پورے رسوخ، صلابت اور استقامت کے ساتھ اس کو زیادہ سہل اور قابل عمل اور عام کرنے کے لئے جدت فکر، ذہانت اور وسعت نظر کی ضرورت ہے۔ اس وقت سارے ملک میں ایسی آزاد درسگاہوں اور دینی مکاتب و مدارس کے قیام کی ضرورت ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے اعتماد و توکل پر اور صرف مسلمانوں کے دینی احساس و طلب کی بنیاد پر اپنا فریضہ انجام دیں اور زمانہ کی رُکاوٹوں اور بے نیازیوں سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مشغول رہیں، اس کے لئے جہاں بعض شدید موانع درپیش ہیں، ان کے راستے کی بعض

رکاوٹیں اور ذہنی حجابات بھی اُٹھ گئے ہیں، مسلمانوں کے لئے عہدوں اور ملازمتوں کی وہ فراخی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی، سرکاری تعلیم حصول معاش کے لئے پہلے بھی ایک جوا تھی جس میں ہار جیت کا یکساں خطرہ تھا، اب ہار کا امکان بہت بڑھ گیا ہے اور جیتنے کے احتمالات برائے نام رہ گئے ہیں، اس لئے اگر عزم، جدوجہد اور فہم سے کام لیا جائے تو دینی تعلیم کا اوسط پہلے سے بہت بڑھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بہر حال ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو اس کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے، اور اس میں اپنی جان کی بازی لگا دینے سے تأمل نہ کرے۔

حرفِ آخر

حضرات! ان غیبی امدادوں اور قدرتی انتظامات کے ساتھ جو اسلام کی دعوت کے لئے راستہ صاف کر رہے ہیں اور ایک صاحبِ دعوت اور صاحب عزم وایمان جماعت کے مستقبل کو درخشاں سے درخشاں تر بنا رہے ہیں۔ مستقبل سے ہراس، یا اللہ کی رحمت سے یاس کی کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، پھر جو مجمع اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس کو دیکھ کر یہ باور نہیں آتا کہ جس ملک میں اتنے صاحبِ فہم و فراست اور صاحبِ حمیت مسلمان بھی ہوں، اس سے اسلام مٹ سکتا ہے، جب کبھی ایک مردِ خدا نے مومن کے یقین کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ اینقص الدین وانا حی (کیا میری زندگی میں دین میں قطع وبُرید ہو سکتی ہے؟)۔

تو فوراً زمانہ کے تیور بدل گئے اور ارتداد کی طرف بڑھتا ہوا دھارا فتح روم وشام اور عالمگیر اشاعت اسلام کی طرف پلٹ پڑا ہے، اگر مخلصین کی ایک جماعت اب بھی صدیقیت کے ادنیٰ پرتو کے ساتھ کہہ اُٹھتی ہے کہ "کیا ہمارے جیتے جی ہندوستان سے دین مٹ سکتا ہے" تو یقین مانیئے کہ ہر گز نہیں مٹ سکتا ہے، بلکہ

اس کی کامیابی، استحکام واشاعت کے لئے وہ نئی نئی راہیں کھلیں گی جو کسی کے وہم وگمان میں نہیں۔

فَلَاتَهِنُوا وَتَدعوا اِلَی السَّلم وَاَنتُم الاَعْلَونَ وَاللّٰه مَعَکُم وَلَنْ یَتِرکُم اعْمَالکُم. (محمدؐ ۳۵) سوتم بودے نہ ہوئے جاؤاور پکارنے لگو صلح اور تم ہی رہوگے اوپر اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور نقصان نہ دے گا تم کو تمہارے کاموں میں۔

حواشی:

(۱) ان دعوتی سفروں کے بعض آزمودہ اصول وضوابط کی تفصیل کے لئے حسب ذیل رسائل ملاحظہ ہوں:
(۱) ایک اہم دینی دعوت (۲) مسلمانوں کی کمزوری کا قرآنی علاج (۳) مسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ (۴) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت۔

(۲) تفصیل اور وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا خطبۂ صدارت دینی تعلیمی کانفرنس بستی، مورخہ ۳۰،۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء اور رسالہ "دینی تعلیمی تحریک" شائع کردہ "دینی تعلیمی کونسل اترپردیش" (لکھنؤ)۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

☆☆☆

مسلمانانِ ہند کے لئے صحیح راہِ عمل

ان کے منصب ومقام، اسلامی تعلیمات
اور واقعات وحقائق کی روشنی میں

یہ مقالہ دوسری عالمی، دینی ودعوتی
کانفرنس (جو جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد
کے زیر اہتمام ۱۶، ۱۷؍ رجب ۱۴۰۷ھ۔
۱۷؍۱۸؍ مارچ ۱۹۸۷ء کو حیدرآباد میں
منعقد ہوئی تھی) کے پہلے اجلاس ۱۶؍ رجب،
۱۷؍ مارچ کے سیمینار میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانانِ ہند کے لئے صحیح راہِ عمل

ان کے منصب ومقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات وحقائق کی روشنی میں

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلیٰ سَیِّدِ المُرسَلِین وَخَاتِمِ النَّبِیِّین مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَصَحبِہٖ اَجمَعِین.

حضرات! میں آپ کی عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس اہم اجلاس کے افتتاح کے لئے میرا انتخاب فرمایا، ایک حقیقت پسند انسان کے لئے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور کسی فریب نفس میں مبتلا نہیں ہے، ان مواقع کی قدر وقیمت صرف اتنی ہی ہے کہ ان کے ذریعہ اس کو اپنے دل کی بات کہنے اور اپنے مطالعہ و تجربات کے نتائج کے اظہار کا ایک ایسی فضا میں موقعہ ملتا ہے، جس میں اس کی بات صبر وسکون اور اکثر اوقات ذوق واشتیاق کے ساتھ سنی جاتی ہے، مجھے امید کرنی چاہئے کہ یہ پیش کش آپ کی طرف سے کوئی رسمی اعزاز نہیں ہے، بلکہ ایک

اعتماد کا اظہار ہے، ہر چیز کی ابتدا بڑی نازک اور اہم ہوتی ہے، اور اس کا پورا اثر اسکے پورے سلسلہ پر پڑتا ہے، خدا مجھے اس اعتماد و ذمہ داری کا اہل ثابت فرمائے۔

بزرگو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور آپ کے لئے جس ماحول اور جن حالات کا انتخاب فرمایا ہے، اور اپنے علم و حکمت اور اپنے ارادہ و اختیار کی بنیاد پر انتخاب فرمایا ہے، وہ بہت اہم اور نازک ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ماحول، یہ حالات، یہ سرزمین اور یہ عہد، تو کسی بڑے مجدّد کا طالب تھا، میں تاریخ و اصلاح و تجدید کے نہ صرف طالب علم بلکہ ایک حقیر مصنف کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ جو عہد و ماحول ہم کو اور آپ کو ملا ہے، جن مسائل سے ہمارا آپ کا واسطہ ہے، جن خطرات، جن اندیشوں، اور جن چیلنجوں کا ہمیں سامنا کرنا ہے، اور اس زمانے کے جن خفی لیکن بے رحم اشاروں کو سمجھنا ہے، وہ کسی بڑے مجدّد کے، کسی صاحبِ عزیمت، صاحب حکمت اور مؤیّد من اللہ کے طالب ہیں، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ یہ دور حضرت مجدد الف ثانی کے شایان شان تھا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مجتہدانہ قابلیت اور مجدّدانہ عزیمت کے شایان شان تھا، یا شہیدین جلیلین، حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی حمیت و عزیمت اور بلند نظری و بلند حوصلگی کے شایان شان تھا لیکن یہ دور، یہ مسائل اور یہ مشکلات ہمارے لئے منتخب کئے گئے "ذلك تقدير العزيز العليم".

لیکن ایک اچھے محنتی طالب علم کو اگر امتحان میں کوئی مشکل پرچہ ملے تو اگر اس نے محنت کی ہے، اسمیں صلاحیت ہے، اور اس نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق تیاری کی ہے، تو اس کی شان یہ ہے کہ اس پر شکوہ نہ کرے، بلکہ شکر ادا کرے کہ وہ اس پرچہ کے قابل سمجھا گیا، اللہ تعالیٰ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا

"والله غالب علی امرہ "وہ جو فیصلہ کرتا ہے،وہ اسکی قدرت کا بھی مظہر ہوتا ہے،اسکی حکمت کا بھی،اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کی رحمت کا بھی مظہر ہوتا ہے تو بعید نہیں،اس کے اس فیصلہ میں (کہ اسنے ہم ناتواں کو ایسے عہد اور ایسی سر زمین کے لئے انتخاب کیا)اس کی قدرت کا بھی ظہور ہے ، حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آخر زمانہ ایسا ہوگا کہ تم جو کر رہے ہو اس کا عشر عشیر بھی اگر کوئی انجام دیگا تو اسکی نجات ہو جائے گی (۱)،واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اس عہد سعادت میں ہوتے،اور اس زمانے میں کوئی عمل کرتے تو اس عمل کی اس زمانے میں کوئی بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت نہ ہوتی ، قیمتیں اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی ہیں،بے موسم کا پھل بڑی قیمت میں بکتا ہے لیکن موسم کا پھل کوڑیوں کے مول بکتا ہے،آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی بڑے حملہ کے موقعہ پر دفاع کرنے والوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں،اور جب سارے آثار شکست کے ہوں،اسوقت کوئی کمزور سپاہی،کوئی سن رسیدہ ، کوئی بیمار مسلمان قدم جمائے کھڑا رہے تو اس کو جو اجر ملے گا غلبہ وفتح کے وقت بڑے شہسوار اور شہ زور کو نہیں ملے گا، تو کیا عجب اللہ نے ہماری کمزوری،ہماری بے بضاعتی کے باوجود ہمکو ایسے پر آشوب دور کے لئے منتخب فرمایا، یہ اس کی رحمت کا کرشمہ ہو۔اس نے ہمیں ایک ایسا زمانہ دیا ہے،کہ اس کے اندر تھوڑا کرنا اللہ کے یہاں بہت شمار ہوگا۔

حضرات ! جہاں تک کسی ملک میں مسلمانوں کے رہنے،وہاں ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کا سوال ہے تو تاریخ اسلام کے طویل سلسلہ اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں اس کے دو نمونے ملتے ہیں، پہلا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان

حکیمانہ حیثیت میں ہو اور وہ ملک اسلامی کے زیر اقتدار ہو، جیسا کہ خلافت راشدہ کے بعد رومی وایرانی شہنشاہیاں اور ان کے ممالک مسلمانوں کے زیر نگیں آئے، اور مسلمان جزیرۃ العرب سے لے کر مراکش تک پھیل گئے، انھوں نے افریقہ کی پوری شمالی مغربی پٹی فتح کرلی اور اس سے آگے سمندر کو عبور کر کے یورپ کے ملک اسپین پر قابض ہو گئے، اس حیثیت کے متعلق صریح احکام ہیں، قرآن مجید کے اشارات ہیں، ہدایات ہیں، صحابہ کرام کا طرز عمل ہے اور عقل سلیم کا فیصلہ ہے، کہ ایسے موقعہ پر مسلمانوں کا منصب کیا ہے، مسمانوں کو کیا کرنا چاہئے، ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور کس طرح ان کو زندگی گذارنی چاہئے؟ ان کے علماء کو کس طرح ملت کی قیادت کرنی چاہئے، ان کے داعیوں و مصلحین کی کیا ذمہ داریاں ہیں، ان کے علماء فقہاء اور مقننین کو مسائل کس ڈھنگ سے سلجھانے چاہئیں؟ اور ان کے مصنفین و مؤلفین و مفکرین کا طرز فکر و اسلوب کیا ہونا چاہئے، یہ بات واضح ہے اور اس کے لئے پورا تاریخی رکارڈ موجود ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان کسی جگہ مختصر و محدود اقلیت میں ہوں، وہ اس ملک کے حالات پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے ہوں ان کا ملک کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہ ہو، وہ خالص محکمانہ زندگی گزار رہے ہوں، اس کے لئے بھی فقہ و شریعت کے احکام موجود ہیں۔

لیکن ہندوستان میں ہماری نوعیت اس وقت دونوں سے مختلف ہے، اور وہ بڑی فکر انگیز، اجتہاد طلب، اعلیٰ ذہانت، حقیقت پسندی اور سخت جد جہد کی طالب ہے، اور اس سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، یہاں ہم اقلیت میں تو ضرور ہیں، لیکن وہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اکثریت کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے، اور اس کو

اقلیت کہنا بھی صحیح نہیں، بلکہ اس کو "**ملت**" کہنا چاہئے، ہم یہاں کم سے کم پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہیں (۲) بہت سی خالص اسلامی مملکتوں میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہیں، کوئی اسلامی ملک تیس لاکھ کا ہے، کوئی چالیس پچاس لاکھ کا ہے کوئی دو کروڑ کا ہے، کوئی چار پانچ کروڑ تک کا ہے، انڈونیشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے، لیکن وہ بھی تیرہ کروڑ ساڑھے تیرہ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن ہم یہاں پندرہ کروڑ یا اس سے زائد تعداد میں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملک جمہوری (DemocarticState) ہے، اس ملک کی سیاست میں ہمارا حصہ ہے، اس ملک کی قانون سازی میں ہمارا حصہ ہے، ہمارے لئے پورا موقعہ ہے کہ ہم ملک کے انتظامیہ (Administra-tion) کو نہ صرف یہ کہ متاثر کریں بلکہ اس کو نئی شکل دینے اور ملک کو بہتر سے بہتر انتظامیہ مہیا کرنے میں مدد و معاون بلکہ بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوں، ہم پاسنگ کا بھی کام کر سکتے ہیں، اور اس ملک میں قانون سازی ہم کو نظر انداز کر کے نہیں رہ سکتی، اگر مسلمان اپنے شہری حقوق کا صحیح، جرأت مندانہ آزادانہ استعمال کریں تو ایوان قانون ساز (Parliament) انتظامیہ (Administrarion) اور حکومت کرنے والی پارٹی (RulingParty) کسی طرح مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی، وہ مسلمانوں سے مستغنی نہیں رہ سکتی، اور مسلمان چاہیں تو اس پر انقلاب انگیز اثر ڈال سکتے ہیں، اور اس کی ہیئت کذائی بدل سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس ملک میں ہم تنہا وہ "**ملت**" ہیں جو خدا کا واضح پیغام رکھتی ہے، جو آخری آسمانی محفوظ کتاب کی حامل ہے، سیرت نبوی کی دولت اس کے پاس ہے، نوع انسانی کے لئے رحمت و ہدایت کا عظیم سرمایہ، اسوہ

نبوی، حیات صحابہ، اور مثالی و معیاری انسانوں کے کردار و عمل کا عظیم ذخیرہ (رکارڈ) موجود و محفوظ ہے، وہ اس سیرت اور طرز زندگی کا عملی مظاہرہ کر سکتے ہیں، اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کی ہدایت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں، یہ وہ ملت ہے جس کے پاس ہر عہد میں کسی ڈوبتے ہوئے معاشرہ کو، کسی بجھتے ہوئے چراغ کو، کسی برباد ہوتے ہوئے ملک کو، کسی روبزوال نہیں بلکہ جان بلب ملک یا معاشرہ کو بچا لینے والا پیغام رہا ہے، اس نے پہلی اور دوسری صدی ہجری (ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی) میں رومی، ایرانی اور وسط ایشیا کے بر سر اقتدار ترکستانی معاشرہ کو (جو زیادہ دن باقی رہنے اور قیادت کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا، اور جسکی ظاہری چمک دمک اور فربہی صحت و توانائی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک غیر طبعی فربہی اور متورم جسم کی علامت تھی) (۳) اور ساتویں آٹھویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسویں) میں نیم وحشی اور خون آشنا چینی و ترکی نسل کی تاتاری قوم کو ایک نیا دین و عقیدہ، مقصد زندگی، روحانیت، ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت، جامع مکمل معاشرتی تمدنی و انتظامی قانون اور نو بہو علوم و آداب دے کر ایک نئی زندگی و توانائی قیادت و رہنمائی کی صلاحیت اور عالمی پیمانہ کی افادیت و امتیاز عطا کیا، اور ان کو زندگی کی ایک نئی قسط ادا کردی، اور انھیں کی ایک شاخ عثمانی ترکوں کو جنھوں نے ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں اسلام قبول کیا، اور اسلام لاتے ہی ان میں بیداری، نئی زندگی اور حوصلہ مندی پیدا ہوئی، ایشیائے کوچک اور یورپ میں ایک بڑی سلطنت (سلطنت عثمانیہ) کا بانی بنا دیا، جس نے کچھ عرصہ کے بعد خلافت اسلامی کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اور حرمین شریفین و مقامات مقدسہ کی محافظ و پاسبان اور شوکت و عظمت اسلامی کا نشان بن گئی۔

یہ وہ ملت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہونچا سکتی ہے، اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں بالکل دھنس رہا اور دلدل میں پھنس رہا ہے، اور جو خودکشی پر آمادہ ہے، بچا سکتی ہے، اس لئے کہ اس کے پاس وہ کتاب الٰہی ہے ، اس کے پاس وہ اسوۂ نبویؐ ہے، اسکے پاس وہ ایمان موجود ہے جو اس کے خالص دولت پرست ، طاقت پرست ، اقتدار پرست اور مادہ پرست بننے سے روکتا ہے، یہ تنہا وہ ملت ہے، جس کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا یقین ہے، اس پر غفلت کے چاہے کیسے ہی اور کتنے ہی دبیز پردہ پڑیں، اسکے دلوں کے اندر اس بات کا شعور باقی ہے کہ اس کو خدا کے سامنے جانا ہے، اللہ کے رسول کو منہ دکھانا ہے، اور اپنی زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے، وہاں نہ عزت کام آئیگی نہ دولت، نہ طاقت کام آئے گی نہ اقتدار، نہ ذہانت کام آئے گی نہ علم، اگر کام آئے گا تو خدا کا خوف کام آئے گا، احساس فرض، سچی عبودیت اور بے لوث خدمت خلق کام آئے گی، ایمان اور عمل صالح کام آئے گا۔

میرے محدود مطالعہ میں اس ملت کی حیات اور اس کے طویل سفر اور تجربوں میں یہ بالکل انوکھی مثال ہے، کہ ہم ایسے ملک میں رہتے ہیں، ہم عظیم ترین اقلیت میں ہیں، یہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر وہ اپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دے، اکثریت سے زیادہ محنت سے کام کرے ، اور اپنی اہلیت وافادیت ، اپنے خلوص و صداقت کا مظاہرہ کرے تو وہ قیادت کا مقام بھی حاصل کر سکتی ہے، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ملک کا رخ تبدیل کر سکتی ہے، اور صاحب اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت وافادیت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے، پھر اس کے ساتھ اس میں حقیقی زندگی کی وہ رمق باقی ہے، (میں اس کو زندگی کی رمق ہی کہوں گا) جو دنیا کی اکثر

ملتیں کھو چکی ہیں روحانی حیثیت سے، ایمانی حیثیت سے، اور احتساب نفس کے لحاظ سے وہ ملتیں، اس آخری اخلاقی شعور اور ضمیر کی زندگی وبیداری سے محروم ہو چکی ہیں، جس کو زندگی کی رمق کہنا چاہئے، یہ ملت اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ اس رمق کی محافظ ہے۔

ایسی حالت میں اس ملت کے علماء کی، علوم دینیہ کے اہل نظر واہل فکر ماہرین کی، ملت کے بے لوث وبالغ نظر قائدین کی، اس ملک، اس عہد اور اس ماحول میں ذمہ داری اتنی عظیم، اور عظیم ہونے کے ساتھ اتنی نازک اور اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کا تصور اس سے پہلے کسی ملک میں کرنا مشکل تھا، پندرہ کروڑ کی تعداد میں مسلمان ایک ایسے ملک میں موجود ہیں جو لرزہ خیز مصائب اور ہوش ربا مسائل سے دوچار ہے، جہاں عرصہ سے انسان سازی کا، اخلاق وکردار بنانے اور ان کو توانائی بخشنے کا، دولت کی کشش اور مادیت کے سحر کا مقابلہ کرنے والی اخلاقی وروحانی طاقت پیدا کرنے کا کارخانہ بند ہو چکا ہے، اس کے جو بھی اسباب ہوں (ان اسباب کی اس مختصر مقالہ میں تشریح نہیں ہو سکتی) یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا معاشرہ ایک اخلاقی بحران میں مبتلا ہے، جس کے آثار ونشانات قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

ایسی حالت میں ایک ملت یہاں رہتی ہے جو پندرہ کروڑ کی تعداد میں بتائی جاتی ہے، وہ اپنے پاس اللہ کی کتاب صحیفہ آسمانی رکھتی ہے، سنت نبوی مدون اور محفوظ طریقہ پر اس کے پاس ہے، فقہ اسلامی کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو زندگی تمام احکام (عبادات سے لیکر معاملات وسیاست مدن واخلاق واجتماع کے آداب تک) پر مشتمل ہے جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی، فقہ کا جتنا بڑا کام، اعمال اور انسانی زندگی کے تنوعات کا، ثواب وعذاب کے عقیدہ اور ایمان سے، اور انسانی

حرکات و اعمال کا، حلال و حرام، جائز و ناجائز کے تصور سے جو ربط ہے، اس ربط کی تشریح و تفسیر کے سلسلہ میں جو محنت اسلام کی تاریخ میں ہوئی ہے، اسکی کوئی مثال مجھے معلوم نہیں، اور جس کی کوئی نظیر گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرات ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں اگرچہ ہم اصطلاحی طور پر اقلیت میں ہیں، لیکن حقیقت میں پوری قوم ہیں، پوری ملت ہیں، اس کے ساتھ ایک تاریخ ہے، ہندوستان میں آٹھ سو برس تک اس نے حکومت کی ہے، اور کامیاب حکومت کی ہے، اسکو ملک بنایا ہے، سنوارا ہے، ملک کا نام دنیا میں روشن کیا ہے، اپنے ملک کو وہ چیز دی جس سے وہ عرصہ سے محروم ہو چکا تھا، اس میں پہلی مرتبہ سیاسی و انتظامی وحدت پیدا کی، اس کو مساوات و اخوت انسانی کا پیغام دیا، اور ہندوستان کو جو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا ایک طویل و وسیع، مضبوط و مستحکم، توانا و صحت مند انتظامیہ اور وسیع مرکزی حکومت عطا کی۔

اس کے بعد سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم آخری امت ہیں، ہم حامل قرآن ہیں، ہم داعی الی اللہ ہیں، ہم محتسب کائنات ہیں، اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ حقیقت ادا کروائی ہے، اس کے سامنے مجلس شوریٰ میں مختلف قوموں کے بارہ میں کہا گیا، اور مختلف خطروں کی نشاندہی کی گئی، اس کی مجلس کے ارکان نے کہا ہمارے نظام اور کام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے، ملوکیت سے خطرہ ہے، جمہوریت سے خطرہ ہے، کسی نے کہا کہ ۔

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پر مدار

ابلیس نے ان تمام خطروں کو کوئی اہمیت نہیں دی، اس کے بر خلاف اس نے کہا ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس نے کہا ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

مسلمان قوم کا یہ امتیاز اور اس ملک کا جمہوری نظام، پھر مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، یہ ساری باتیں مواقع فراہم کرتی ہیں کہ ہم یہاں کے نظم ونسق پر اثر انداز ہوں، یہاں قانون بنانے میں ہمارا حصہ ہو سکتا ہے، پھر اس ملک کو جمہوری ہونے کی وجہ سے اس ملک کی قیادت کا ہم منصب حاصل کر سکتے ہیں، اگر ہم اپنے کو اخلاقی طور پر، باطنی طور پر ذہنی طور پر، بھی اور عملی طور پر بھی ممتاز وفائق ثابت کر دیں تو اس ملک کی قیادت کے ہم طالب نہیں ہونگے، ملک کی قیادت خود ہماری طالب ہوگی، ہمیں سورج کا چراغ لے کر ڈھونڈھے گی، یہاں کے خاک کے ذرہ ذرہ، درخت کے پتہ پتہ سے آواز آئے گی کہ اس ملک کو بچانے والے کہاں ہیں؟ آئیں اور اس ملک کو بچائیں۔ آپ کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ کو کچھ آسانیاں چاہئیں، کچھ آسامیاں چاہئیں، آپ ملک کے نجات دہندہ ہیں۔ آپ اس ملک کی آخری امید ہیں۔ اس ملک کے باشندوں کو ہم عدل کا پیغام دیں، عقل سلیم کا

پیغام دیں، خدا ترسی اور دوستی کا پیغام دیں، اور اس میں اس کا لحاظ رکھیں کہ ہمارا وہ پیغام اسلامی عقیدہ اور ایمانی جذبہ کے ساتھ مربوط اور جڑا ہوا ہو، یہاں تک کہ ذہین لوگ جن کو اللہ تعالی نے خاص طرح کی قوت شامہ عطا فرمائی ہے، (جو معنویات میں بھی اس طرح کام کرتی ہے جیسے مادیات وجسمانیات میں) اس عمومی انسانی دعوت میں ہمارے ایمان کی خوشبو اور مہک پائیں، وہ یہ محسوس کریں کہ یہ خود غرضی کا پیغام نہیں، نفسانیت کا پیغام نہیں، اسکے پیچھے سیاسی یا اقتصادی مقاصد نہیں، یہ وہ پیغام ہے، جس کو ان لوگوں کے ایمان باللہ وتعلیمات اسلامی نے پیدا کیا اور جلا اور طاقت دی، اس پیغام کا سرچشمہ اور اس کا محرک وداعی ان کے خدا سے (جو رب العالمین ہے) اور خدا کے اس آخری رسول (ﷺ) سے (جو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے) رابطہ ہے۔

اگر ہم یہ کام کرلیں گے تو صرف یہی نہیں کہ اس ملک کے میں ہم عزت کے ساتھ رہ سکیں گے، بلکہ اس ملک کی قیادت ہم کو تلاش کرے گی، حضرت یوسف جیل گئے اور ایک ایسے الزام میں گئے جس کے بعد ایسے "**اسیر زنداں**" کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، اور وہ آدمی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا، لیکن انھوں نے اپنے کردار سے، اپنی عملی صلاحیت سے، اپنی معجزانہ ایمانی طاقت سے، اپنی انسانی دوستی سے جیل کے اندر رہ کر بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہ مصر میں تنہا آدمی ہیں جن کے پاس ایمان ہے، جن کے پاس کردار کا جوہر ہے، جن کے اندر عملی صلاحیت ہے، انسان دوستی کا جذبہ اور امانت ودیانت ہے، بالآخر بادشاہِ مصر ان کو جیل سے بلواتا ہے، لیکن وہ خودداری کے ساتھ کہتے ہیں اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ

عَلِیْمٌ۔ (اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ ،ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ،بیشک میرا پروردگار ان کے مکر سے خوب واقف ہے) بادشاہ نے پھر تحقیق کی اور مدعیہ نے کہدیا "ماعلمنا علیه من سوء" (حاشاللہ ہمیں اس میں کوئی برائی معلوم نہیں) اس کی کوئی خطا نہیں تھی، یہ سب میرا پھیلایا ہوا جال اور بنائی ہوئی سازش تھی، جب وہ نکلے تو بادشاہ نے پیش کش کی کہ آپ کوئی عہدہ قبول کیجئے، انھوں نے کہا "اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ" (مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں) قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جو حالات کی تفصیل بیان کرے، لیکن اس قصہ کے سیاق میں ہمیں یہ بات مضمر معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جنھوں نے سالہاسال مصر میں گزارے تھے، سمجھ گئے کہ اس ملک اور انتظامیہ کا سب سے زیادہ کمزور شعبہ مالیات اور غذا کا شعبہ ہے، اور یہ وہ شعبہ ہوتا ہے، جو عوام سے زیادہ سے زیادہ ربط رکھتا ہے، جس کے ذریعہ ہر عوام تک پہونچا جا سکتا ہے، اور ان کی بے لوث خدمت کر کے ان کو ممنون و متاثر اور ان کو صحیح عقائد اور واضح حقائق پر غور کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ انھوں نے کہا "اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ"۔

حضرات! سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی موجودگی میں اور تعلیم کا معیار جو اس وقت ہے اور اس کے جو وسائل اس ملک کو مہیا ہیں، ان سب کے باوجود صالح قیادت، عادل قیادت، خدا ترس قیادت اور انسان دوست قیادت کا منصب خالی ہے، آپ اپنی حیثیت پہچانیں، اپنا منصب جانیں اور

ملک میں خدمت، ملک میں صالح انقلاب لانے اور ملک کو صحیح رخ پر لگانے اور چلانے کی اپنی صلاحیت کو پہچانیں اور اس سے کام لیں۔

ہم کو ملک وملت دونوں زندہ حقیقتوں میں سے کسی حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہئے، البتہ ہماری داعیانہ حیثیت، ہماری بے لوث اور خدااندیش فطرت اور ہمارا وہ فرض منصبی جس کی بنا پر ہم کو "خیر امت" کا لقب ملا، اس پر غالب رہنا چاہئے، اس سود وزیاں کی دنیا میں، اس قمار خانہ سیاست میں ہماری اصول پسندی، ہمارا اخلاقی کردار اور ہمارا ایمانی شعار سب پر غالب رہنا چاہئے، ہمیں ان سیاسی پارٹیوں کی پست سطح پر نہیں آنا چاہئے جو دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر اور دوسروں کی بربادی میں اپنی ترقی کا خواب دیکھتی ہیں، اور جن کا منتہائے نظر حکومت کی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں، ہمیں اس ملک کے بارے میں بھی اور اس ملت کے بارے میں بھی اپنا ذہن نبوی وآسمانی تعلیمات کی اساس پر تعمیر کرنا چاہئے۔

حضرات! اس کے ساتھ ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کریں، آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کریں، ہماری آئندہ نسلیں ارتداد کے خطرہ میں مبتلا ہیں، تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو بالکل کھلی سی بات ہے، لیکن اعتقادی ارتداد کا خطرہ بھی سر پر آگیا ہے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قصبات میں، گاؤں میں، شہروں میں، محلوں میں، گھروں اور برادریوں میں، بچوں کو دینی تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس پیدا کریں، مدارس اور مساجد قائم کریں، شبینہ اور صباحی مدارس ومکاتب قائم کردیں، اور ان کا جال بچھادیں، میں اس موقعہ پر اپنی ایک گزشتہ تقریر کا اقتباس پیش کروں گا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم پر کی

تھی:۔

"اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے، اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، تو میں کہوں گا "ماتعبدون من بعدی" (٤) لکھ دو، پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے، اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لئے اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ "**ما تعبدون من بعدی**" تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟) میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیانہ پر، برادری کے پیانہ پر، اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیانہ پر اور ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے پیانہ پر، ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی، وہ کس گروہ وملت کی پیرو ہوگی، کس کی پرستش کرے گی، کن عقائد کو مانے گی، یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی، یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دست قدرت کو

کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی؟"(۵)

اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جو جدوجہد شروع ہو گئی ہے، اس کو جاری رکھیں، ہمکو کسی ملک میں دریا کی مچھلیوں کی طرح (جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی) زندگی گزارنے کی اجازت نہیں، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے پوری ملت کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ نے جو پہلے سے قائم تھا اس کو اپنا موضوع بنایا، پھر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ہے، ان سب مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں بھی میں اپنی ایک گزشتہ تقریر کا کچھ حصہ پیش کروں گا جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۵/۱۶/ر دسمبر ۱۹۸۶ء، میں کی گئی، میں نے کہا تھا:۔

"مسلمان اگر مسلم پرسنل لاء (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں، کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوقِ عبادت کے باوجود) اور

گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت، نظامِ تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے"۔(۶)

حضرات! میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیامِ انسانیت پر تقریر کی، اس موقعہ پر R.S.S کے لوگ اور دوسری جماعتوں کے لوگ موجود تھے، اگلے دن ایک وفد میری قیام گاہ پر آیا مجھے معلوم ہوا کہ اس میں R.S.S کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں، اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا کہ "کل آپ کی تقریر سُن کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے" میں اس تاثر اور شہادت کو اپنے ہی لئے نہیں پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک بڑا اعتراف اور قابلِ فخر نہیں تو قابلِ شکر سند سمجھتا ہوں، ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہو اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اس

ملک کی ان سے زیادہ فکر ہے، آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے، آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے، لوگوں کا عزت کے ساتھ، سکون کے ساتھ، امن و امان کے ساتھ رہنا آپ کو دولت کمانے سے زیادہ عزیز ہے، یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جارہا ہے، اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی، وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے اس سطح پر آجاتے ہیں، اور وہ کام کرلیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑجاتا ہے، معاشرہ بُری طرح زوال کا شکار ہوتا جارہا ہے، اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتِ حال سے حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا، اور اپنی کمیونٹی، پارٹی، فرقہ اور جماعت کی ملامت و تنقید یا مدح و تعریف سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر تنقید واحتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دور دور نظر نہیں آتا۔

حضرات! آپ کے اس اجلاس میں بڑے بڑے علماء، فضلائے علوم دینیہ، زعماء و قائدین، اہلِ قلم و مفکرین موجود ہیں، میں اپنی اس گزارش کو اسلام کے عہد اول کے ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ کو یاد دلانے پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے لئے پورا پیام رکھتا ہے۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی، لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے، یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے، ابوبکر صدیقؓ اس وقت خلیفۂ وقت تھے، انہوں نے کہا "أینقصُ الدّینُ وأنا حیٌّ" (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے؟ کوئی قطع برید ہو سکتی ہے؟) حیف ہے، میری زندگی پر اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم ہونے لگے، اور اس کے فرائض واحکام میں انتخاب

کیا جانے لگے کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوٰۃ نہیں، یا زکوٰۃ بھی ٹھیک، روزہ نہیں، میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ ہو نہیں سکتا!

بس یہ حمیت تھی جو ابل کر ان کی زبان پر آئی، اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے، اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیتِ اسلامی، ایک انسان کے احساسِ ذمہ داری نے تہہ بہ تہہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، تاریخ لمبی ہے، اور واقعہ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی، وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات تھی، "یہ نہیں ہو سکتا میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے" میں نے جو دین رسول اللہ ﷺ سے پایا تھا، وہ دین بے کم و کاست سو فی صد رہے گا، ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے مٹنے نہیں دوں گا، اور انہوں نے کر کے دکھا دیا، اور آج اسلام اپنی پوری شریعت، اپنے ارکان و فرائض اور اپنے مکمل ڈھانچہ کے ساتھ موجود ہے۔

عہد حاضر بھی اس وقت کے علماء و قائدین اور سچے اور وفادار حاملینِ دین سے اسی دینی غیرت و حمیت اور اسی ہمت و عزیمت کا متوقع و منتظر ہے، اور مستقبل کا مؤرخ ہی نہیں عہد حاضر کا حقیقت نگار اور وقائع نویس بھی گوش بر آواز ہے کہ وہ ہماری زبان (صرف زبانِ قال نہیں زبانِ حال سے یہ اعلان سنے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم (۷)

حواشی :۔

(۱) جامع ترمذی، ابواب الفتن عن رسول اللہ ﷺ۔

(۲) ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بارہ کروڑ سے پندرہ کروڑ تک بیان کی جاتی ہے، اور اس کے قرائن واسباب موجود ہیں، حکومت بھی ان کی تعداد دس کروڑ تک مانتی اور بیان کرتی ہے۔

(۳) رومی ایرانی معاشرہ کی پستی اور اخلاقی ومعنوی زوال کی تفصیل کے لئے حسب ذیل کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔

THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE (EDWARD GIBBON) L'IRAN SOUS LES SASSANIDES BY A. CHRISTENSES

(ترجمہ اردو "**ایران بعہد ساسانیان**" بقلم ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورینٹل کالج۔ لاہور)

(۴) تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے، یہ وہ سوال ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس دنیا سے رحلت کے وقت اپنی اولاد اور پسماندگان سے کیا تھا، ملاحظہ ہو سورہ بقر ص ۱۳۳

(۵) ماخوذ از خطبہ صدارت علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس الہ آباد۔ منعقدہ ۱۷ر فروری ۱۹۸۵ء، مشمولہ رسالہ "**آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری**" شائع کردہ "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ" ص ۲۲۔ ۲۳

(۶) خطبہ صدارت اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی۔ منعقدہ ۱۵/۱۶ر دسمبر ۱۹۸۶ء۔ ص ۲۳۔ ۲۴۔

(۷) ہر کانٹے کے سرے کو ہم نے خون دل سے رنگین کیا ہے، اور اس طرح صحرا و چمن کی باغبانی وپاسبانی کا قانون (روشنائی سے کاغذ پر نہیں) بلکہ خون دل کی سرخی سے تحریر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

موجودہ عالمِ اسلام کے لئے

فیصلہ کن محاذ

اور

مرکزی میدانِ عمل

مکہ مکرمہ میں ۱۱ تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رابطہ عالم اسلامی کی ایک کانفرنس میں پڑھا گیا ایک اہم اور رہبر مقالہ جس کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ اس کانفرنس میں ۱۲۲ ملکوں سے اسلامی تنظیمات، جامعات اور مسلم زعماء و مفکرین نے شرکت کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موجودہ عالمِ اسلام کے لئے

فیصلہ کن محاذ

اور

مرکزی میدانِ عمل

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَحدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَن لَّانَبِیَّ بَعدَہٗ.

حضرات! ہم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہیں اور ان لوگوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے میرے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ آپ سے دعوت اسلام کے موضوع پر کچھ عرض کروں، میرے لئے یہ بات باعث مسرت ہے کہ میرے مخاطب وہ حضرات ہیں جو امت کی فکری رہنمائی کر رہے ہیں اور اسلامی جمعیتوں اور تنظیموں کے ذمہ دار ہیں اور سب ہی دین کی خدمت سے وابستہ ہیں، اور سب سے زیادہ یہ بات میرے جذبات کے لئے مہمیز کا کام کر رہی ہے کہ یہ گفتگو وہاں ہو رہی ہے جو دعوت اسلام کا اولین مرکز، رسول ﷺ کے مبعوث ہونے کی

جگہ اور بلد امین ہے، میں اگر اپنے آپ کو مخاطب کر کے ایک عرب شاعر کا یہ شعر پڑھوں تو بے جانہ ہو گا کہ :۔

حمامة جرعى حومة الجندل اسجعى فانت بمرأى من سعاد و مسمع

حومۃ الجندل کی بلبل !(مناسب وقت ہے کہ) تو نغمہ سرا ہو ،سعاد نگاہوں کے سامنے گوش بر آواز ہے

حضرات !دعوت اسلامی کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے،اس پر بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا جاچکا ہے،اور عصر حاضر میں تو اس پر کافی ریسرچ کیا گیا ہے، تحقیقی مقالات اور کتابیں لکھی گئی ہیں ،بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس موضوع پر پوری لائبریری تیار ہو چکی ہے۔(ا)جو اپنی صوری اور معنوی ہر لحاظ سے ممتاز ہے،لہذا میں چاہتا ہوں کہ اپنی گفتگو صرف ایک موضوع پر محدود رکھوں اور وہ ہے "دعوت دین کے فیصلہ کن محاذ اور اس کے مرکزی میدان عمل"جن سے نہ صرف دعوت کا رخ متعین کیا جاسکے گا بلکہ عالم اسلام کی منزل کا تعین ممکن ہو گا، میں اپنے محدود مطالعہ ، ماضی کے تجربات اور حقائق کی روشنی میں صرف انہی عملی گوشوں کی نشاندہی کروں گا،وباللہ التوفیق۔

(ا) مجھے بھی اللہ تعالی نے توفیق دی ہے کہ اس موضوع پر علمی اور تحقیقی انداز میں کچھ لکھوں چنانچہ میری کتابیں :۔

۱۔ رجال الفکر والدعوة فی الاسلام ١۔٤ ٢۔ الدعوة الاسلامية فی الهند وتطوراتها۔

٣۔ حكمة الدعوة وصفة الدعاة۔ ٤ ۔ النبوة هی الوسيلة الوحيدة للمعارفة الصحيحة والهداية الكاملة ٥ ۔منهج افضل للدعاة والعلماء۔

٦۔ دورالجامعات الاسلامية المطلوب فی تربية العلماء۔ اسی موضوع پر ہیں۔

۱۔ مسلم عوام اور ان کے تمام گروہوں میں ایمان کی قوت کو بیدار کرنا، اور اس کو جلا دینا، کیونکہ ان گروہوں اور ان عوام کا اسلام سے وابستہ رہنا اور اس کے لئے ان کے دلوں میں جوش کا قائم رہنا ایک مستحکم اور بلند شہر پناہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اس شہر اسلام کی بقاء کا دارومدار ہے یہی نہیں بلکہ بہتیری اسلامی حکومتوں اور سربراہوں کو یہی چیز اسلام سے وابستہ رہنے پر مجبور کر سکتی ہے، مسلمانوں کی دینی احساس کا ابھرنا اسلام کی قوت کا سر چشمہ اور اس کا رأس المال ہے، اور یہی وہ خام مال ہے جو ہر پاک و مفید مقصد کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، اور ایسے افراد کا وجود جوش عمل اور وسعت قلب و نظر اور اخلاص کے لحاظ سے پوری انسانی آبادی کا جوہر اور اس کا سب سے مفید اور مضبوط ترین مجموعہ ہوگا۔

ایمان کی پختگی اور دین کے لئے سرگرمی اور جوش عمل اسی وقت کار آمد ہوگی جب اس کے شرائط بھی پورے ہوں، اور ان افراد میں وہ اوصاف بھی پائے جائیں جن کی بنا پر وہ نصرت خداوندی کے مستحق ہوں، اور مشکلات پر قابو پانے اور دشمنوں پر غالب آنے کے سزاوار ہوں، وہ بنیادی شرائط یہ ہیں، عقیدہ کی تصحیح، صرف خدائے واحد کی عبادت، اور ہر قسم کے شرک اور غلط عقائد سے مبرا ہونا، جاہلیت کے رسوم اور غیر اسلامی شعائر، نفاق، عمل اور عقیدہ میں دورخی، قول و عمل کے درمیان تضاد، اور گزشتہ اقوام کی روش سے اجتناب جو اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں اللہ کے عذاب اور بے تعلقی کی مستحق قرار دی گئیں، نیز موجودہ اقوام کی روش سے پرہیز جو اللہ کو بھول گئیں تو اللہ نے انکو خود فراموش کر دیا، اور جو دنیا کو تباہی اور ہلاکت کے راستہ پر چلا رہی ہیں،

اسی کے ساتھ ساتھ دینی شعور کو صحیح راستے پر لگانا، اور اس شعور کی

پرورش کرنا بھی ضروری ہے، جس سے وہ مسائل و حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکیں، دوست دشمن میں تمیز کر سکیں اور نت نئے انداز کی تحریکوں کے دھوکہ میں نہ آئیں تاکہ ہماری اگلی زندگی میں وہ المیے دوبارہ نہ پیش آئیں جو قومی نعرہ بازیوں اور جاہلیت کی تحریکوں کا شکار ہونے کے سبب پیش آئے یا جو لسانی تعصب اور رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے، نیز چالاک و ناپاک قیادتوں اور بیرونی سازشوں کے سبب مسلم عوام کی تباہی کا سبب بنیں، اور دینی شعور اور فراست ایمان کی کمی کی وجہ سے مسلم عوام اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گئے۔

۲۔ مذہبی حقائق اور دینی تصورات کو تحریف اور عصر حاضر کے مغربی تصورات سے محفوظ رکھنا، سیاسیات و اقتصادیات کی اصطلاحوں کو دینی مقاصد کے بیان کرنے کے لئے استعمال کرنے سے باز رکھنا چاہئے اور دین کو خالص سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کرنے اور عصر حاضر کے فلسفیانہ اصول سے اسلامی اصول کو مطابق کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش کے نقصانات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے، کیونکہ دینی حقائق اسلام کے بنیادی اور ہمیشہ یکساں قائم رہنے والے اصول ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں اور وہ خود اپنے معیار ہیں، ان معیاروں کو کسی دوسری کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو ناپنے کے لئے خود اسی کا گز ہے، انبیائے کرام کی دعوت کا موضوع یہی اصول تھے، اور اسی کے لئے انھوں نے جہاد کیا، اور اسی کے لئے انھوں نے سعی وجد و جہد کی، اور انہی پیمانوں پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

اسی طرح ان باتوں سے پرہیز بھی ضروری ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کو کمزور کرے، آخرت پر ایمان کی اہمیت کو گھٹائے اور مومن کے دل سے احکام خداوندی پر عمل کرنے کے جذبہ کو، اس کی خوشنودی حاصل

کرنے کے شوق کو اللہ سے تقرب کی تمنا کو اور اس کی رضا کے لئے اور اس کے ثواب کی امید میں کاوش کرنے کو بے اہمیت قرار دے، کیونکہ یہ باتیں اگر پیدا ہو گئیں تو امت کا تشخص اور اس کی انفرادیت مجروح ہو گی، عند اللہ ایسے لوگوں کا کوئی وزن نہیں رہے گا، اسی طرح بت پرستی کے عقیدوں، صریح شرک، اور جاہلی عقیدہ و رواج کی برائیاں بھی ذہن نشین ہونا چاہئے، اور صرف دستور و نظام پر تنقید اور غیر اسلامی حکومتوں کی زبانی مخالفت کو کافی سمجھنا دین کے قدیم سماوی اسلوب سے روگردانی اور جدید سیاسی اسلوب کی پیروی ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ سے روحانی، جذباتی اور قلبی تعلق کی پختگی اور آپ کی ذات گرامی سے گہری محبت جو اپنی ذات، اہل و عیال اور آل و اولاد سے ہو، جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، رسول کریم ﷺ پر اس حیثیت سے ایمان کہ آپ خاتم الرسل، مولائے کل اور ہادی سبل ہیں اور آپ سے تعلق خاطر دین کی بنیاد ہے لہذا ان عوامل سے بچنا ضروری ہے جو اس محبت کے سرچشمہ کو خشک کرنے کا سبب بنیں، یا کم از کم ان کو کمزور کریں، جذبات و احساسات میں سرد مہری پیدا کریں، اور اس کے نتیجہ میں سنت پر عمل میں کوتاہی پیدا ہو، بے باکی اور دریدہ دہنی پیدا ہو، مزاج وافتاد ایسے رخ پر پڑ جائے کہ آنحضرت ﷺ کو فخر باور کرنے اور آپ کی سیرت پڑھنے اور سمجھنے کا شوق کم ہو، اور آپ کی محبت کو ابھارنے اور اس کو غذا دینے کے ذرائع سے روگردانی مذاق عام بن جائے، ہمارے موضوع کے اس پہلو پر ہر ایک کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر عرب بھائیوں کو اس کی زیادہ فکر کرنا چاہئے، کیونکہ عرب قومیت کی تحریکوں اور ماضی قریب کے حوادث نے ان کو اس سرچشمہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کا سرمایۂ حیات ہے اور جس کے وہ

زیادہ حقدار اور زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ بعثت محمدیہ سے یہی سرزمین مشرف ہوئی، اور قرآن کریم ان کی زبان میں نازل ہوا، رسول ﷺ نے انہی کی زبان میں گفتگو فرمائی۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اور اس طبقہ میں اسلام پر اعتماد کی بحالی جن کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت اور وسائل ابلاغ کی باگ ڈور ہے، اسلام پر اعتماد کی بحالی کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اس بات کا یقین ہو کہ اسلام کے اندر نہ صرف زمانہ کو ساتھ لے کر چلنے اور تعمیر و ترقی کے میدان میں ہر ایک سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، بلکہ وہ پوری انسانی آبادی کی قیادت بھی کر سکتا ہے، اور وہی زندگی کی کشتی کو ماہرانہ صلاحیت سے کھے کر سلامتی و خوش حالی کے کنارے تک پہنچا سکتا ہے، اور انسانی آبادی کو ہلاکت اور خودکشی کی راہ سے نکال سکتا ہے جس میں مغرب کی بوڑھی اور اندھی قیادت نے اس کو ڈال دیا ہے، اور وہ سمجھ سکیں کہ وہ ایسی بیٹری نہیں ہے جو ڈسچارج ہو چکی ہے یا وہ دیا نہیں ہے جس کا تیل خشک ہو چکا ہو اور جس کی بتی جل چکی ہو، بلکہ وہ ایک عالمی و سرمدی پیغام ہے، اور سفینۂ نوح کی طرح تنہا سفینہ نجات ہے جس پر سوار ہونے والے ہی غرق ہونے سے نجات پا سکتے ہیں۔

دین کی صلاحیت کے متعلق اعتماد کی کمی یا اس کا معدوم ہونا دراصل اس تعلیم یافتہ طبقہ کا مرض ہے جس نے مغربی ثقافت کے آغوش تربیت میں شعور کی آنکھیں کھولی ہیں یا جس کو مغرب کی بالادستی نے یہی باور کرایا ہے، یہی طبقہ پوری ملت کی تباہی کا ذمہ دار اور ذہنی ارتداد کا سبب ہے، ساری دستوری یا تمدنی بدعنوانیاں جو پورے عالم اسلام کو کھوکھلا کر رہی ہیں وہ اسی طبقہ کی کم نگاہی یا بے راہ روی کا نتیجہ ہے، مگر یہی لوگ مسلم اقوام پر مسلط ہیں، ان اقوام پر مسلط ہیں جو صرف ایمان و

قرآن کی زبان سمجھتا تھا اور جس کے اندر جوش عمل تھا، اور دین کے لئے قربانی کا جذبہ تھا، غرض اسی نظام تعلیم نے حکمراں طبقہ اور جمہور کے درمیان گہری اور وسیع خلیج حائل کردی ہے جس کی وجہ سے ہر جگہ ایک عمومی بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے، اور اس بات نے افراد کی ذہنی و عقلی قوتوں کو ایسے کاموں میں لگادیا ہے جس کا کوئی فائدہ ان اقوام کو نہیں حاصل ہوا۔

۵۔ ضرورت ہے کہ مغرب سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم جو پورے عالم اسلام میں رائج ہے ایک بار نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا جائے اور پوری طرح کھنگالا جائے اور اس کو ایسے قالب میں ڈھالا جائے جو مسلم اقوام کے قدو قامت پر راست آئے، اس کے عقیدہ و پیغام سے ہم آہنگ ہو اور جس سے مسلم قوم کی معنوی خصوصیت نمایاں اور اس کی انفرادیت آشکارا ہو، مادی و الحادی عناصر سے پاک ہو تاکہ کائنات کا صرف مادی تصور اس کے سامنے نہ ہو، کیونکہ جہاں تک علوم کا تعلق ہے وہ سب ایک دوسرے کا کاٹ کرنے والی اکائیاں ہیں جب کہ نظام فطرت ایک بے قید اور سب کو پامال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تاریخ انسانی کے اضطراب و بے چینی اور آپس کی جنگوں کے لامتناہی افسانوں کا پلندہ ہے، ان کو بنیاد بناکر جب عقل انسانی کی پرورش اور اس کے نمو و بالیدگی کی کوشش کی جائے گی تو کامیابی کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوگا۔

نظام تعلیم مین جزوی اصلاحات اور معمولی کتر بیونت کار آمد نہیں ہوسکتی، اس لئے ضرورت ہے کہ خواہ جس قدر بھی وسائل اور غور فکر کی ضرورت پڑے اچھے سے اچھے ذہن و فکر سے مدد لی جائے، بہتر سے بہتر وسائل اختیار کئے جائیں تاکہ ایک پائدار اور مفید نظام تعلیم و تربیت امت کو مل جائے کیونکہ اس کے بغیر

عالم اسلام اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اپنی عقل اور اپنے ارادہ کے مطابق کام نہیں کر سکتا، اس کے بغیر نہ تو حکومتوں کو مسلمان کارندہ مل سکتے ہیں نہ مخلص منتظمین مل سکتے ہیں، نہ ایسے مومن و مخلص افرد مل سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق سرکاری دفاتر، عوامی رفاہیت کے اداروں، انتظامیہ اور عدلیہ دانش گاہوں اور وسائل اعلام کو پابند کر سکیں تاکہ اسلام کا نظام معاشرت و حکومت پورے جمال وکمال کے ساتھ سامنے آئے اور مسلم سوسائٹی اپنی خصوصیات اور انفرادی امتیازات کے ساتھ دنیا کے سامنے آئے۔

۶۔اس مقصد کے لئے ایک بین الاقوامی پیمانے پر مضبوط تحریک ہونی چاہئے کہ دنیا کے پڑھے لکھے سمجھ دار طبقہ میں اسلام کے علمی خزانوں کا تعارف کرایا جائے اور مسلمانوں کے علمی و دینی کارناموں سے انھیں آگاہ کیا جائے، علوم اسلامیہ میں زندگی کی نئی روح پھونک کر متمدن دنیا پر یہ واضح کر دیا جائے کہ اسلام کے عائلی اجتماعی قوانین دنیا کے بلند ترین اور وسیع ترین اصول پر مبنی ہیں، وہ اصول جو نظام فطرت سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں کبھی کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے، اور اس کی نفع بخشی اور قوت کسی زمانہ میں نہ کم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، اور وہ انسانی زندگی کی رہنمائی وقت کے ہر دھارے پر اور زندگی کے ہر موڑ پر پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دے سکتی ہے، اور لوگوں کے بنائے ہوئے قانون "جن کو وضعی قوانین" کہا جاتا ہے، سے بدرجہا بہتر و مفید اور پائیدار ہیں۔

۷۔انسانی نفوس اور قومی وجدان میں تمدنی نظام کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، خاص طور پر ایسا نظام معاشرت جو دینی بنیادوں اور اس کی تعلیمات کے سایہ میں پروان چڑھا ہو، اور جس کی تعمیر میں ایک خاص انداز کے مذہبی ذوق کو

دخل ہو، اور جس پر اس قوم کی چھاپ ہو، ایسے نظام معاشرت (یا تمدن) سے کسی قوم کو الگ کرنا اس کو زندگی کے میدان سے خارج کر دینے اور عقیدہ و عبادت اور مذہبی مراسم کے تنگ چوکھٹے میں قید کر دینے اوور اس کے حاضر کا رشتہ ماضی سے توڑ دینے کے مرادف ہے، لہٰذا اسلامی حکومتوں اور مسلم سوسائٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایک مستقل بالذات تمدن کی باریک بینی کے ساتھ تشکیل کریں جو مغرب کی کورانہ تقلید، بغیر پلاننگ کے سرسری اقدام اور احساس کمتری کے آثار سے پاک ہو، اسلامی تمدن کی نمائندگی پورے طور پر اس کے مرکزی قیادت میں، اداروں میں، گھروں میں، اجتماعی جگہوں میں، ہوٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور کسی حد تک اس کے دفتروں اور ہوائی جہازوں میں اور سفارت خانوں میں ہونی چاہئے، اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ اسلامی ممالک اسلامی زندگی کا ایک نمونہ پیش کریں گے بلکہ اسلام کی ایک خاموش تبلیغ بھی ہوگی۔

۸۔ مغربی تمدن بشمول مغربی علوم و نظریات کو ایجادات وامکانیات کے ایک خام مال کی حیثیت سے قبول کیا جائے جس سے عالم اسلام کے فکری رہنما اور سربراہ ایک ایسا پائیدار مناسب وقت تمدن تیار کریں جس کی بنیاد ایمان و اخلاق، پرہیزگاری اور رحم وانصاف پر ہو، دوسری طرف اسمیں نمووافزائش کی گنجائش ہو، اس میں قوت واپچ ہو، جس کا اثر تمام شعبۂ حیات پر پڑے، پیداوار بڑھے اور عوام میں خوش حالی آسکے، خلاصہ یہ کہ مغربی علوم سے وہ چیزیں لی جائیں جس کی مسلم عوام یا مسلم ممالک اور حکومتوں کو ضرورت ہے جس سے عملی فوائد میسر ہوں اور جس پر مغرب و مشرق کی چھاپ نہ ہو، اس کے علاوہ وہ چیزیں جسکی انھیں ضرورت نہیں ہے، ان سے استغنا برتا جائے، مغرب سے معاملہ ایک ہمراہی اور مد مقابل

کے جیسا ہو، کیونکہ اگر مشرق اس بات کا محتاج ہے کہ مغربی علوم سے بقدر ضرورت اخذ کرے تو مغرب بھی بہت سی چیزیں مسلم ممالک سے لے سکتا ہے ممکن ہے کہ مغرب کو ان ممالک سے سیکھنے اور حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہو۔

۹۔ مسلم ممالک میں چند ایسے ملک بھی ہیں جنھوں نے ماضی میں دعوت اسلامی اور اسلامی تمدن کی قابل ذکر اور شاندار خدمتیں انجام دی ہیں، اور عصر حاضر میں جو اس بات پر تلی ہوئی ہیں کہ جس طرح ممکن ہو اسلامی عنصر کو ناپید کر دیا جائے جن کے یہاں "پروگریسو اسلام" کو مقبول بنانے کی کوشش ہو رہی ہے، اور اسلام کی تفسیر سیاسی مصالح اور حکمرانوں کے شخصی ذوق و مزاج کے مطابق جاری ہے، ان حکومتوں کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ ایک ناکارہ اور بانجھ سیاست ہے جو کسی اسلامی ملک میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی، ان حکومتوں کو باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ بجائے ناممکن العمل اور غیر فطری کوششوں کے اپنی قوت اور امکانی صلاحیتوں کو ملک و ملت کے مشترکہ دشمن کے خلاف صرف کریں جس سے ملک و ملت کو تقویت حاصل ہو،

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور حکمراں اسلام سے "صُلحِ کل" قسم کا معاملہ کرتے ہیں وہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے فضا کو سازگار بنانے کی حاجت ہے، جو اسلامی قوانین کو نافذ کرنے میں معاون ثابت ہوں، اور قوانین اسلام کے نافذ کرنے میں جو اللہ کی مدد و نصرت اور برکت و سعادت حاصل ہوگی اسے سمجھانے کی ضرورت ہے، نیز ان ممالک میں کوشش ہونی چاہئے کہ ایک مرکزی قیادت ہو جس کی بنیاد اسلام کے نظام شوریٰ پر ہو اور خیر و نفع کے کاموں میں آپسی تعاون جس کی اساس

ہو، اور کم از کم اپنی کوتاہی کا احساس ضرور ہو کہ مسلمان "**امامتِ عامہ**" کے وجود سے محروم ہیں، امامت عامہ یا خلافت اسلامیہ جس کو قائم کرنا مسلمانوں کا فرض تھا، اور جس کے نہ قائم کرنے کی ان سے پرسش ہوگی۔

۱۰۔ وہ ممالک جو غیر اسلامی ہیں وہاں اسلام کی دعوت اور اس کا تعارف حکمت وبصیرت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے اور وہ نہج اختیار کرنا چاہئے، جس میں اسلامی تعلیمات کی روح جلوہ گر ہو، زمانہ کے مزاج کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہو۔

رہے وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس بات کی فکر رکھنی ہے کہ اسلام کی صحیح نمائندگی ہو، اسلامی زندگی ایسی ہو جو دوسروں کو متوجہ کرے اور جس کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوں، اخلاقی اور روحانی قدروں کی قیادت مسلمانوں کو سنبھالنا چاہئے، اور ملک کو گراوٹ اور تباہی سے بچانے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہئے، اسلام صرف اس صورت میں اپنی ضرورت اور اہلیت ثابت کرسکتا ہے، اور مسلمان اپنی دعوتی مہم اور قائدانہ کردار ان ملکوں میں ادا کرسکتے ہیں۔

۱۱۔ آخر میں یہ عرض کرنا ہے (جو اس سلسلہ کی انتہائی بات نہیں ہے) کہ اسلام کی فطرت، اس کی تابناک تاریخ اور فطرت سلیمہ کا تقاضہ، اور بنی نوع انسان کی طبعی خصوصیت کا یہ مطالبہ ہے کہ ایک دعوتی، ایمانی حرکت مسلمانوں میں ضرور قائم رہے جو ایجابی انداز کی ہو اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو، داعیوں میں مردانہ صفات ہوں، بلند حوصلگی ہو، ان کی نگاہیں دور رس ہوں اور وہ دنیا کی عظیم طاقتوں کا مقابلہ کرسکیں، وہ طاقتیں جنھوں نے ناجائز اور ناحق مسلم وغیر مسلم سب ہی قوموں کے انجام کار کے مسائل اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، لیکن یہ بات کہ داعی الی اللہ ان صفات کا حامل ہو یا ان کے اندر یہ صفتیں پیدا ہوجائیں اس وقت ممکن ہے

کہ وہ پورے یقین اور اطمینان قلب کے ساتھ ایک طاقتور دعوتی تحریک میں شریک ہوں، اور ان کے اندر اسلام کی برتری کا عقیدہ ہو، اور اس بات پر یقین ہو کہ بشریت اس دین کی محتاج اور ضرورت مند ہے۔

دعوت اسلام کی سرگرمی میں قربانی کا جذبہ، سر فروشی کی دھن، کوہ کنی کی ہمت، تکلفات سے عاری زندگی گزارنے کی عادت اور اگر ضرورت ہو تو خطرات میں کودنے کی جرأت (مغامرہ۔RISK) بھی مطلوب ہے، کیونکہ فطرت انسانی یہ ہے کہ وہ اسی ایمان کی عزت کرے جس میں قوت ہو، اس فرد کی عزت کرے جس کو اپنے اصول و عقائد پر اعتماد ہو، اور قابل فخر سمجھتا ہو، جس کے یہاں لذت اندازی اور مال و جاہ کی بے وقعتی ہو۔ جس کے اندر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کی ہمت ہو، انسانی فطرت ہمیشہ اس چیز کو اہمیت دیتی ہے جو شے نایاب اور مجبور ہے، غریب آدمی امیر آدمی کی عزت کرتا ہے ناخواندہ پڑھے لکھے آدمی پر رشک کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک کمینہ بھی شریف انسان کی عزت اپنے دل میں رکھتا ہے، اسلامی تاریخ جانبازی کے کارناموں اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے واقعات سے پُر ہے، وہ اصحاب علم و بصیرت جو اقوام و ملل کی تاریخوں سے واقف ہیں اور وہ لوگ جن کے ضمیر زندہ ہیں وہ مشرق و مغرب کی قیادتوں سے اکتا چکے ہیں اور ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

ایک خلا کا پایا جانا، یعنی ایسی تحریک ایمانی اور دعوت دینی کا نہ پایا جانا جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور مادی تمدنوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک ہو، اور جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی قدروں کی محافظ ہو، ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا، اور دعوتی خلا اسلامی وجود کے لئے خطرہ ہے، کیونکہ کسی ضروری چیز میں خلا جو بشریت کی نفع

بخشی کے لئے ضروری ہو زیادہ طویل عمر کا مستحق نہیں ہو سکتا، ایسے خلا کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی دوسری تحریک سامنے آئے گی جو بے راہ روی کی دعوت دے گی، بے مقصد و بے فائدہ، عقائد کے لحاظ سے لغو اور ناقص، سلبی انداز کی تحریک جو تباہی و بربادی کا ذریعہ بنے گی، جن لوگوں نے مذاہب، تحریکات اور مختلف قسم کی دعوتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی صحیح اور پائیدار اسلامی تحریک سامنے نہیں ہو گی تو ایک غلط قسم کی تحریک اس کی جگہ لے لے گی، اور کہیں اس غلط قسم کی تحریک نے کسی درجہ میں خطرات کا مقابلہ کر لیا اور کچھ قربانیاں دکھا دیں اور مادی مظاہر سے اپنے آپ کو ذرا بلند دکھا دیا، اور مسلم ممالک میں اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے جو فساد ہے اس کی نشان دہی کر دی، اور بڑی طاقتور کو ذرا للکار دیا، نعرہ بازیوں سے فضا کو اپنے حق میں استوار کر لیا اور پروپیگنڈوں سے اپنے تھوڑے کام کو پہاڑ بنا کر پیش کر دیا تو پھر کیا ہے لوگوں پر اس کا سحر چل جاتا ہے اور سب اندھا دھند اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، خاص طور پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی دھوم مچ جاتی ہے، اور وہ لوگ جو بعض مسلم ممالک کی بے راہ روی سے نالاں ہیں ان پر اس طرح کی تحریکوں کا ایسا جادو چل جاتا ہے جس کو نہ کسی واعظ کا وعظ دور کر سکتا ہے اور نہ کسی صاحب ضمیر و قلم کا قلم، اور نہ کوئی منطقی استدلال کام دیتا ہے اور نہ کوئی علمی جائزہ اور تحقیق۔ پہلی صدی ہجری میں خوارج کی تاریخ، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں باطنیوں اور فدائیوں کی تحریک کی تاریخ، حسن بن الصباح کے افسانے اور جو اس کے مرکز عمل **"قلعۂ موت"** میں ہوا کرتا تھا، اور بہتیری فوجی اور انقلابی تحریکوں کی تاریخ جو اسلام کے نام پر بگڑی ہوئی صورت حال کو از سر نو الٹ کر درست کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں اور محض

جھوٹ اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھ کر پبلک کے سامنے آئیں ، اسی طرح بعض معاصر انقلابی و عسکری تحریکیں جنھوں نے اپنی غلط رخ پر چلنے ولی تحریکوں کی مدد کے لئے اور اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا جو ہر قربانی کے لئے تیار رہے ، یہاں تک کہ بعض وہ حلقے اور گروہ جو اسلامی تعلیمات کے محافظ سمجھے جاتے تھے اور ان کے فکر و عمل میں بیداری پائی جاتی تھی وہ بھی اس زد میں خس و خاساک کی طرح بہہ گئے ، اور قرآنی نصوص اور اسلامی عقائد کی روشنی میں کسی کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی ، اور نہ انھوں نے اسلام سے منسوب فرقوں کا انصاف کے ساتھ مطالعہ کیا۔

مسلم زعماء و مفکرین کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ سیلاب کی رو کو ایک سیلاب ہی روک سکتا ہے ، طوفان کا مقابلہ اس سے زیادہ قوت کا طوفان ہی کر سکتا ہے ، عالم اسلام کی موجودہ جو حالت ہے اس کو معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ جمود کی حالت میں ہے ، اس پر راحت طلبی اور گراں خوابی طاری ہے ، اس کے اندر کوئی ایمانی مضبوط دعوت نہیں ہے ، اور نہ صحیح عقائد اور بلند و پاک مقاصد کے لئے قربانی اور فدائیت کا جذبہ ہے ، فکری و عسکری لحاظ سے بھی وہ خود کفیل نہیں ہیں ، اور یہ بات ہمیشہ ایک خطرناک صورت حال کے پیدا ہو جانے کی آگاہی دیتی ہے اور ہر طور پر غلط قسم کی کھوکھلی تحریکوں کے جال میں نوجوانوں کو ڈال دینے کے لئے زمین ہموار کرتی ہے ، کیونکہ نوجوان موجودہ صورت حال سے نالاں اور جن کو صحیح میدان عمل نہیں مل رہا ہے ، ان تحریکات کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو کسی قدر سکون میسر آتا ہے اگرچہ ان تحریکات کی حیثیت اس سراب کی ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَآءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئاً وَ وَجَدَاللهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ(سورۃ نور. ۳۹)"مثل سراب کے چٹیل میدان میں کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس نے کچھ نہ پایا اور اس کے پاس (قضائے) الٰہی کو پایا سو اللہ نے اس کا پورا حساب چکا دیا"

لیکن یہ انسانی فطرت اور اقوام و ملل کا تجربہ ہے، اور جو لوگ بھی "عصر جدید میں اسلام اور اسلام کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں اور جن کو عقیدہ کی صحت، خدا اور رسول ﷺ پر ایمان کی عظمت اور تعلیمات دین عزیز ہے ان کو اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔

میں اپنا یہ مختصر مقالہ ایک قرآنی آیت پر ختم کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کی اولین مختصر جماعت کو مخاطب فرمایا ہے اور ان میں رشتہ مواخات کے قیام سے ساری دنیا اور انسانیت کے مقدر کو مربوط کیا ہے۔

" إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيرٌ(سورۃ انفال۔ ۷۳)"اگر یہ نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا"

☆☆☆☆☆

(إن من البيان لسحرا)

خطباتِ ابرار

﴿محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دام مجدہ ہردوئی﴾

محی السنۃ عارف باللہ حضرت **مولانا ابرار الحق** صاحب (اطال اللہ بقاءہ طول حیاتی) نے بھی ہندوستان کے متعدد مقامات پر اپنی خطابت کے جوہر دکھائے ہیں، اور اپنی شیریں بیانی، اور پند ونصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔

حضرت کی ان متعدد مقامات پر کی گئی تقریروں کو **مولانا محمد کاظم** صاحب ندوی نے جمع کر کے ایک وقیع کتابی شکل میں شائع کرایا ہے۔

عمدہ کاغذ، کمپیوٹر کی کتابت اور خوبصورت گردوپوش، تاجروں اور عام خریداروں کے لئے رعایت کی جائے گی۔

ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ ایوب کاکوری لکھنؤ ۷ ۱۰ ۲۲